بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطباتِ مفکرِ اسلام

﴿حضرت مولانا سید ابوالحسنؒ علی ندوی﴾

(جلد ششم)

جمع وترتیب

محمد کاظم ندوی

ملنے کا پتہ

مکتبہ ایوب کاکوری۔لکھنؤ

۲۲۷۱۰۷

ستمبر ۲۰۰۴ء

نام کتاب ——— خطباتِ مفکرِ اسلام ششم

کمپیوٹر کمپوزنگ ——— مسرور احمد ندوی

طباعت ——— شاذیہ آفسٹ لکھنئو

قیمت ——— Rs [ ]

باہتمام

محمد کاظم ندوی

ملنے کے دیگر پتے

☆مکتبہ ندویہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنئو

☆مکتبہ الفرقان بکڈپو نظیر آباد لکھنئو

☆مکتبہ اسلام گوئن روڈ لکھنئو

☆مکتبہ حرمین کچہری روڈ لکھنئو

☆مکتبہ البدر کاکوری لکھنئو

☆مکتبہ نعیمیہ دیوبند ضلع سہارنپور

☆دارالاشاعت اسلامیہ مولانا شوکت علی روڈ کلکتہ

☆دانش محل امین آباد لکھنئو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

مضامین.....صفحات

☆عرض ناشر ۵
☆عرض مؤلف ۷
☆اپنی بات ۵
☆نازاں ہے جن پر تاریخ آدم.....۹
☆سیرت وکردار کی تبدیلی کی ضرورت ۲۵
☆حیات ملی میں خواص امت کا مقام.....۴۱
☆ہر ترقی پر ایمان کو ترجیح دیجئے ۵۷
☆دین اور علم کا دائمی رشتہ ۷۵
☆اسلامی مزاج وماحول کی حفاظت میں حدیث کا بنیادی کردار ۸۷
☆ناشاد شادی آباد سے عبرت اور موعظت ۱۲۹
☆دین کا نبوی مزاج اور اسکی حفاظت کی ضرورت.....۱۴۳
☆مسلمانوں کی اصل طاقت وقوت ایمان وسیرت ہے.....۱۶۳
☆ہندوستان میں مسلمانوں کی ذمہ داری.....۱۷۹
☆دعوت اور حکمت دعوت.....۱۹۵

☆عربی زبان کی تحصیل و مہارت کا سب سے طاقتور محرک.....۲۰۹

☆قصہ سات جواں مردوں کا.....۲۲۳

☆نصرت الٰہی کے شرائط.....۲۳۷

☆علمائے دین کا منصب.....۲۵۷

☆غیر اسلامی شعائر ورسوم کی تقلید سے احتراز کی ضرورت.....۲۶۹

☆انسانی معاشرے میں عدل واحسان کی ضرورت.....۲۸۱

☆اخلاقیات سائنس کا موضوع نہیں.....۲۹۵

☆اس سے خبردار رہئے کہ کوئی امریکی یا یورپی اسلام پیدا ہو جائے....۳۲۱

☆مدارس دینیہ کے قیام وبقا کے شرائط.....۳۳۷

☆شرفا اور اونچے گھرانوں کی خاص بیماریاں اور

ان کے لئے ترقی کا واحد راستہ.....۳۴۷

☆ایمان جان سے زیادہ عزیز ہونا چاہئے.....۳۵۹

☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

دار القلم، ایک تصنیفی واشاعتی ادارہ ہے، جسکے قیام اور تاسیس کا مقصد ہی ہندو بیرون ہند کے مقتدر مصنفین و مولفین اور مترجمین کی گراں قدر کتابوں کی نشر واشاعت ہے۔

دار القلم، نے اب تک چھوٹی بڑی متعدد کتابیں شائع کر کے اہل علم اور مطالعہ کے شائقین کو قیمتی، مفید اور کار آمد مواد فراہم کیا ہے۔

دار القلم، کے وسائل بہت محدود ہیں، اور اس کے خدام کا مطمح نظر بہت بلند ہے، بظاہر دونوں میں تضاد نظر آتا ہے، پھر بھی خدام ادارہ اللہ کی رحمت سے مایوس اور ناامید نہیں ہیں، وہ اس فکر میں ہیں کہ یہ ادارہ اپنے وسائل بڑھائے اور دین حنیف کی خدمت میں بہترین رول ادا کرے۔

دار القلم، اپنے اغراض ومقاصد کو پائے تکمیل تک پہچانے کے لئے اپنے محسنین اور کرم فرماؤں کے حسن سلوک اور مدد وتعاون کا منتظر ہے۔

دار القلم، نے اس سے پہلے "**خطبات مفکر اسلام**" کی پانچ ضخیم جلدیں اور "**مقالات مفکر اسلام**" کی دو ضخیم جلدیں قارئین کی

خدمت میں پیش کر کے پسندیدگی کی سند حاصل کی ہے۔اس وقت خطبات ہی کی چھٹی جلد اس توقع اور امید پر پیش کی جارہی ہے کہ قارئین اس جلد کو بھی پسندیدگی کی نظروں سے دیکھیں گے۔

دار القلم، نے علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور زمانہ کتاب "**خطباتِ مدراس**" کا نیا و معیاری ایڈیشن شائع کر کے قارئین و ناظرین کی توجہات کو اپنی جانب مبذول کرایا ہے۔

اے اللہ! "**خطباتِ مفکرِ اسلام**" کی اس جلد (ششم) کو بھی قبولیت کی دولت سے مالا مال فرما اور صاحب خطبات حضرت "**مفکر اسلام**" رحمۃ اللہ علیہ کے درجات کو بلند سے بلند تر فرما۔ آمین!

مورخہ
یکم نومبر ۲۰۰۲ء
مطابق
۲۵/شعبان ۱۴۲۳ھ

والسلام
محمد عاصم
منیجر
دار القلم ڈھاکہ

☆☆☆☆☆

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض مؤلف

اس ذات باری کے شکر و احسان سے زباں تر ہے، جس نے اپنی ہر طرح کی بے کراں نعمتوں سے اس ناچیز مؤلف کو سر فراز فرمایا، ان بے بہا نعمتوں میں سے لکھنا پڑھنا، تصنیف و تالیف، شعر و شاعری، کارہائے جمع و ترتیب کتب اور دیگر امور بھی ہیں، جن کی طرف رغبت اور جذب و شوق کی رہنمائی کرنا یہ سب کچھ خدائے عزوجل کی عطا کردہ سعادت اور توفیق کا نتیجہ ہے، ورنہ

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل

اللہ رب العزت کی اسی عطا کردہ توفیق و سعادت کے طفیل استاذ الاساتذہ، میر کارواں، مفکر اسلام حضرت مولانا سید "**ابو الحسن علی میاں ندوی**" رحمۃ اللہ علیہ کے خطبات و مقالات اور تقریروں کو جمع کر کے شائع کرنے کا میں نے بیڑا اٹھایا تھا، جس کے نتیجہ میں مختصر سی مدت میں "**خطباتِ مفکرِ اسلام**" کی پانچ ضخیم جلدیں اور "**مقالاتِ مفکر اسلام**" کی دو ضخیم جلدیں منظر عام پر آئیں، ہندو بیرون ہند کے علم دوست احباب، دوستوں اور ساتھیوں نے اس خدمت کو سراہا، اسکی تعریف و تحسین کی اور بتایا کہ یہ خدمت ایک "**اضافہ**" ہے۔

اس وقت "**خطباتِ مفکرِ اسلام**" کی جلد ششم آپ حضرات کی خدمت میں اس توقع پر پیش کی جارہی ہے کی یہ جلد بھی سابقہ جلدوں کی طرح پسندیدگی کی نظروں سے دیکھی جائے گی، جہاں تک نفس مضمون کا تعلق ہے، وہ تو سراسر قیمتی ہے ہی، اس سلسلہ میں کسی قسم کی رائے زنی کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مرادف ہے، اس وقت مسئلہ اس کا ہے کہ کتاب کی جمع وترتیب، کتابت و طباعت اور اس کی حسن کاری، اور زیبائش میں جو وقت اور سرمایہ لگا، وہ سگارت ہوا یا نہیں اس کا فیصلہ ناظرین پر چھوڑتا ہوں۔

خدا کرے "**خطبات**" و "**مقالات**" کی تمام جلدیں مزید قبولیت کا درجہ حاصل کریں، اور ان کا دائرہ وحلقہ وسیع سے وسیع تر ہو۔

اخیر میں اتنا عرض کرتے ہوئے قلبی تکلیف ہے کہ شاید "**خطبات**" کی یہ آخری جلد ہو۔ اگر ایسا ہی ہوا، تب بھی یہ تکلیف، تکلیف مالایطاق نہیں، بلکہ یہ تکلیف مسرت وخوشی میں اس وقت تبدیل ہو جائے گی، جب یہ دل محسوس کرے گا کہ اللہ کے فضل وکرم اور اس کے احسان سے یہ ایک خدمت ہے، اور ایسی خدمت جو قابل قبول بھی ہے اور لائق تحسین ومبارک باد بھی، اسی احساس اور جذبہ نے مؤلف کو آگے بڑھنے کا حوصلہ بخشا، اور یہ کہنے کا موقع دیا

شاد باشم کہ کارے کردم

۲۳/شعبان ۱۴۲۳ھ — والسلام

مطابق

محمد کاظم ندوی

۳/اکتوبر ۲۰۰۲ء — استاذ دارالعلوم فاروقیہ کاکوری، لکھنؤ



نازاں ہے جن پر تاریخِ آدمؑ



یہ تقریر مفکر اسلام حضرت
مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ
علیہ نے محرم الحرام ۱۴۱۱ھ کو لحاظ
شوکت علی مولانا عبدالشکور فاروقی حال
میں کی تھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نازاں ہے جن پر تاریخِ آدمؑ

حضرات! اس وقت میں ان چیزوں کی طرف اشارہ کروں گا جو ان مجالس کے مزاج کے مطابق ہیں اور ان کا طبعی تقاضہ ہے، عقلی تقاضہ ہے، منطقی تقاضہ ہے، شرعی تقاضہ ہے، اور سب سے بڑھ کر دینی تقاضہ ہے۔

اس سلسلہ کی ایک بات تو یہ ہے کہ آپ کے ذہن میں حضرات خلفائے راشدین کی عقیدت پیدا ہو، ان کے بارے میں آپ کے اندر اعتماد ہو، آپ کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو جائے کہ وہ نسل انسانی کے (انبیاء کرام کے بعد) بہترین افراد اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل واحسان، اس کی خلاقی، ربّانی تربیت کا بہترین نمونہ ہیں۔

پہلی بات یہ ہونی چاہئے کہ آپ اس محفل سے یہ اثر اور نتیجہ لیکر جائیں، اگر ہم کسی حکیم کی تعریف کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ بہت سے مریضوں نے شفا پائی، وہ حکیم ہی کیا ہے، طبیب ہی کیا ہے جس کے ہاتھ ایک کی بھی شفا نہ ہوئی ہو، مشکل سے دو چار آدمیوں کو فائدہ پہنچا ہو، اگر ہم کسی عالم ومدرس کی تعریف کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حلقۂ درس سے بہت سے فضلاء تیار ہوئے اور وہ علم وفضل میں امتیازی درجہ رکھتے تھے ورنہ

پھر مدرس کا فائدہ ہی کیا، اور اس مدرس کی کامیابی کا معیار کیا؟ اگر ہم کسی کارخانہ کی تعریف کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ بہترین مصنوعات پیدا کرتا ہے، ایک مرتبہ ہم نے بمبئی کے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ اگر ہم سے کوئی کہے (لکھنؤ کے بھائیوں کو سنا رہا تھا) کہ ہاں صاحب! احمد حسین دلدار حسین کا کارخانہ بہت اچھا ہے، مگر شروع میں تمباکو کے کچھ اچھے ڈبے وہاں سے بنے تھے پھر جو دیکھا تو ہر ڈبہ خراب تھا، تو یہ ایسی بات ہوگی کہ اس کارخانہ والے کو آپکے خلاف ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کرنے کا حق ہوگا کہ آپنے اس کارخانہ کو بدنام کیا، وہاں کی شہرت کو خراب کیا، میں مدرسہ کے ایک خادم کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کی ایک نامور اور مسلم درسگاہ ندوۃ العلماء کا خادم ہوں، اگر ندوۃ العلماء کے متعلق کوئی یہ کہے ہاں صاحب! شروع میں اس کے دار العلوم نے چند اچھے فاضل پیدا کئے۔ علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبد السلام ندوی، مولانا عبد الباری ندوی، اس کے بعد پھر کوئی نہیں نکلا اور کسی میں کوئی استعداد پیدا نہیں ہوئی، تو سب سے پہلے میں اس کا دامن پکڑنے کو تیار ہوں، ندوۃ العلماء کے ذمہ دار، ندوۃ العلماء کے کارکن اور اس سے نسبت رکھنے والے دامن پکڑنے کو تیار ہیں، آپ سے کہا جائے گا کہ پہلے آپ اس کا ثبوت دیجئے کہ آپ اس ادارہ کی تاریخ سے کہاں تک واقف ہیں، اس کے فضلاء سے آپ کہاں تک آشنا ہیں، ان کے کارناموں سے آپ کہاں تک واقف ہیں، اسی طریقہ سے میں نے مختلف مدرسوں، مختلف کارخانوں کا نام لیا، "اصغر علی محمد علی" ہندوستان میں عطر سازی کا شہرۂ آفاق کارخانہ تھا، دور دور اس کی شہرت تھی، اگر کہا جاتا، ہاں صاحب! شروع میں دو چار مہینے ان کے یہاں اچھی عطر کی شیشیاں تیار ہوئی تھیں، اس کے بعد یہ بھی معلوم

نہیں ہوتا تھا کہ شیشی میں عطر ہے یا تیل ہے؟ تو کارخانہ کے مالکان کو حق ہے کہ اس کے خلاف کارروائی کریں۔

میں کہتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے سب سے بڑے پیغمبر سید المرسلین خاتم النبیین سید الاولین والآخرین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں معاذاللہ یہ کہا جائے کہ براہ راست جن لوگوں نے آپ ﷺ کی زیارت کی، جو لوگ آپ ﷺ کے دامن تربیت سے وابستہ تھے، جو آغوش نبوت میں پلے تھے، جنھوں نے آپ ﷺ کے سایۂ عاطفت میں زندگی گزاری اور جن پر آپ ﷺ کی تربیت کے معجزانہ اثرات پڑے تھے، جن کو دنیا میں نمونہ بننا تھا، ان میں دو ایک، یا تین چار آدمی بس دین پر قائم رہے، عہد پر قائم رہے، بقیہ سب دین سے نکل گئے تو اس سے بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کوئی توہین آمیز بات اور اس سے بڑھ کر آپ کے مقام نبوت اور آپکی شان رسالت کی بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ان انعامات کی جو آپ کے ساتھ مخصوص تھے ناقدری نہیں ہو سکتی۔

ایک بات تو یہ ہے کہ یہ عقیدت اور اعتماد آپ اپنے اندر لے کر جائیں کہ صحابہ کرامؓ نسل انسانی میں اور یہ میں تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں، اور کسی چیز کا دعویٰ کروں یا نہ کروں یہ کوئی ایسا دعویٰ نہیں ہے کہ جس میں معذرت کی ضرورت ہو کہ میں تاریخ کی کتابوں کا کیڑا ہوں، تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں اور تاریخی موضوعات پر لکھنے والوں کی اس عہد میں اگر اس کی کوئی فہرست بنائی جائے تو اس فہرست کے آخر میں میرا نام آنا چاہئے، میں تاریخی بصیرت، تاریخی مطالعہ کی روشنی میں بہ بانگ دہل کہتا ہوں کہ خلق آدم سے لیکر تا قیام قیامت انبیاء کرام علیہم السلام کے گروہ کو چھوڑ کر کمالات انسانی کے لحاظ سے،

مکارم اخلاق کے لحاظ سے، ہدایت ربانی کے لحاظ سے، مکارم اخلاق کے لحاظ سے، تقدس کے لحاظ سے، پاکیزگی کے لحاظ سے، بے غرضی کے لحاظ سے، اخلاص کے لحاظ سے، اور رحمت وبرکت کے لحاظ سے صحابہ کرامؓ سے بڑھ کر پوری نوع انسانی میں کوئی پیدا نہیں ہوا، اور یہی ہونا چاہئے تھا، یہ بالکل منطقی اور طبعی بات ہے، اگر کسی کو مانتے ہیں اور اس کے اندر کوئی اثر تسلیم کرتے ہیں خواہ وہ کسی درجہ، کسی نوع کا ہو، زندگی کے شعبوں میں سے کوئی شعبہ ہو، اس کو لے لیجئے، سیاست کو لے لیجئے، شاعری کو لے لیجئے، تعلیم کو لے لیجئے، قانون کو لے لیجئے، معالجہ کو لے لیجئے، تصنیف وتالیف کو لے لیجئے، ادویات کو لے لیجئے، اگر آپ اس میں کسی کا کوئی امتیاز مانتے ہیں تو آپ کو ماننا پڑے گا وہ متعدی ہے، وہ زبان ہی کیا جو سمجھی ہی نہ جائے، وہ چراغ ہی کیا جس کی روشنی نہ پھیلے، وہ خوشبو کیا جس کا سونگھنے والے کو لطف نہ آئے، وہ آفتاب کیا جس کی دھوپ نہ ہو، روشنی نہ ہو، وہ چاند کیا جس کی چاندنی نہ ہو، وہ بارش کیا جس سے تراوٹ اور جس سے آب یاری نہ ہو، جس سے فصلیں پیدا نہ ہوں، جس سے باغات سرسبز نہ ہوں۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ نے امام شعبی کا ایک بلیغ ارشاد نقل کیا ہے کہ یہودیوں سے پوچھا گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت میں سب سے بہتر لوگ کون ہوئے؟ انھوں نے کہا کہ جنھوں نے حضرت موسیٰ کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی، جنھوں نے ان کو دیکھا اور ان کو ان کی صحبت ملی وہ سب سے بہتر انسان تھے، عیسائیوں سے پوچھا گیا کہ ملت عیسوی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں میں سب سے بہتر لوگ کون ہیں؟ انھوں نے کہا حضرت عیسیٰ کے حواری، شیعوں سے پوچھا گیا کہ اس امت میں (امتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم

میں) سب سے بدترین لوگ کون ہیں؟ تو انھوں نے ان کا نام لیا جو اولین اور اہم ترین صحابۂ رسول تھے، خلفائے راشدین (حضرت علی کو مستثنیٰ کر کے) عشرۂ مبشرہ اور جلیل القدر صحابہؓ۔

یہ ایک تضاد ہے، ایک پہیلی ہے جو بوجھنے والی ہے کہ سب پیغمبروں کے سب سے بہتر لوگ وہ تھے جو ان کے دامنِ تربیت میں پلے بڑھے اور جنھوں نے ایک بار زیارت کر لی کچھ سے کچھ ہو گئے، تحت الثریٰ سے ثریا تک پہنچ گئے، چہ جائیکہ وہ لوگ جنھوں نے برسوں پیغمبر کی صحبت پائی، اور وہ براہِ راست ان کے فیض یافتہ تھے، تو یہودیوں کا جواب ٹھیک تھا، مسیحیوں کا جواب ٹھیک تھا، ان کے شایانِ شان تھا، پیغمبر پر ایمان رکھنے والی امت کو یہی کہنا چاہئے تھا، لیکن ہمارے ان بھائیوں اور ہم وطنوں کو جو اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں، ان کا جواب عجیب و غریب ہے، یہ ایک پہیلی ہے جو بجھائی نہیں جا سکتی آج بھی پوچھنے والے کو یہ جواب مل سکتا ہے، خدا اس کی نوبت نہ لائے، کسی کو پوچھنے کی ضرورت پیش نہ ہو، لیکن وہ گویا زبانِ حال سے اپنے طرزِ عمل سے یہ کہتے ہیں، ان کی تصنیفات اس بات کا اظہار کرتی ہیں کہ امت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں سب سے زیادہ نا قابلِ اعتبار، بہت ہی کچے، اور خام لوگ یہی تھے، جو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ بند ہوتے ہی دین سے نکل گئے، جو اشخاص آپکی امت میں رہے، آغوشِ نبوت میں تربیت پائی، جن کی ہر وقت نگرانی ہوتی تھی، جو آپ کو دیکھ کر نماز پڑھتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تبارک و تعالیٰ کا جو کلام آتا تھا وہ براہِ راست آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سنتے تھے اور پھر اس کی تشریح کرتے تھے اور اس پر عمل ہوتے بھی دیکھتے تھے، اور جن کے اخلاق، اعمال و کردار اور ہر چیز کی نگرانی ہوتی تھی، نگاہِ نبوت خود ان

چیزوں کا جائزہ لیتی تھی، وہی سب سے ناکام نکلے، خام نکلے یہ ایک تضاد ہے، ایک شخص کا تضاد نہیں ہے، دینی امتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا ایک تضاد ہے، دوسرے انبیاء کے ماننے والے یہ کہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والے یہ کہیں۔

مجھے یورپ وامریکہ جانے کا اتفاق ہوتا ہے، کئی بار میں نے کہا کہ اسلامک سینٹر واشنگٹن ڈی سی میں یا لندن کے ہائیڈ پارک میں اگر اسلام کی دعوت دی جارہی ہو اور بڑی سحر انگیز تقریر کی جارہی ہو، لوگ مست ہورہے ہوں اور ایک جادو سا معلوم ہورہا ہو، اور قریب ہو کہ لوگ اسلام لے آئیں، اسلام کا اعلان کردیں۔ ہمیں توبہ کرائیے، اسلام میں داخل کیجئے، اچانک ایک شخص کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے، ٹھیک ہے آپ نے بہت اچھی بات کہی، لیکن آپ ہم سے کیا امید رکھتے ہیں، آپ کو ہم پر امید رکھنے کا حق کیا ہے، اگر آج ہم اسلام لے آئیں تو اسلام پر قائم بھی رہیں گے؟ جو لوگ براہِ راست اللہ تبارک وتعالیٰ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اسلام لائے، اور مشرف بہ اسلام ہوئے، اور آپ کے سایہ میں تربیت پائی، ایک دن نہیں، دو دن نہیں، چند دن نہیں، چند سال نہیں، ۱۳ سال مکہ معظمہ کے اور دس سال مدینہ منورہ کے گزارے، وہ آپ ﷺ کی آنکھ بند ہوتے ہی اسلام سے نکل گئے، صرف دو ہزار سات آدمی رہ گئے، تو آپ ہم سے کیا امید رکھتے ہیں؟ اور آپ اپنے کو کیا سمجھتے ہیں؟ کہ آپ کا مقام پیغمبر سے بلند ہے، ہم آپکے ہاتھ پر اسلام لائیں تو اسلام پر رہیں گے اور اسلامی تعلیمات پر عمل کریں گے؟ ہم نے کہا اس کا کوئی جواب نہیں، دنیا کے بڑے سے بڑے ذکی اور بڑے سے بڑے حاضر جواب کے پاس بھی اس کا جواب نہیں، یہ کیا تضاد ہے، ایک

طرف تو آپ یہ کہتے ہیں کہ نبی کے ہاتھ پر براہِ راست اسلام لانے والے وہ ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِین اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ فَعَلِمَ مَا فِی قُلُوْبِھِم فَاَنْزَلَ السَّکِیْنَۃَ عَلَیْھِم"۔ (اے پیغمبر! جب مؤمن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے، تو خدا ان سے خوش ہوا اور جو (صدق و خلوص) ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کر لیا تو ان پر تسلی نازل فرمائی۔ دوسری طرف انھوں نے نبی کی آنکھ بند ہوتے ہی اسلام کو خیرباد کہہ دیا، ایں چہ بوالعجبیست

دوسری بات یہ کہنی ہے کہ آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جہاں اور دوسری خصوصیات سنیں، اس خصوصیت کو بھی آپ ذہن نشین کر لیں، دماغ میں بٹھالیں، یہاں سے لے کر جائیں کہ وہ دین کے پورے متبع تھے، وہ دین کے سانچے میں ڈھل گئے تھے، ان کے عقائد، ان کی عبادات، ان کے معاملات، ان کے اخلاق، ان کے رسومات، ان کی تقریبات، ان کی فتوحات، ان کی حکومت و نظام سلطنت سب چیزیں اور زندگی کے سب شعبے شریعت کے مطابق تھے، اللہ تبارک و تعالیٰ خواجہ الطاف حسین حالی کے درجات بلند فرمائے، کیا بات کہی ہے انھوں نے۔

رہِ حق میں تھی دوڑ اور بھاگ ان کی فقط حق پہ تھی جس سے تھی لاگ ان کی
بھڑکتی نہ تھی خود بخود آگ ان کی شریعت کے قبضہ میں تھی باگ ان کی

جہاں کرد یا نرم نرما گئے وہ!
جہاں کرد یا گرم گرما گئے وہ!

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم صرف عقائد و عبادات میں مسلمان نہیں تھے، معاملات اور اخلاق میں بھی مسلمان تھے، رسوم اور زندگی کے جو فطری تقاضے اور

فطری ضرورتیں ان میں بھی تھیں، ہم مسلمانوں کا حال کیا ہے، کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو عقائد میں دین کے پابند ہیں، الحمد للہ توحید کے بارے میں ان کا ذہن صاف ہے، رسالت کے بارے میں، معاد کے بارے میں اور جو بنیادی عقائد ہیں، لیکن عبادات میں کچے ہیں اور بہت سے وہ ہیں جو عقائد و عبادات میں تو پختہ ہیں، عقائد بھی صحیح، عبادات کے بھی پابند، لیکن معاملات اور اخلاق کو نہ پوچھئے، معاملات اور اخلاق میں سخت نا قابل اعتبار، کسی سے معاملہ پڑے گا تو خیانت سے نہ چوکیں گے، معاملہ پڑے گا تو "تطفیف" (تطفیف کیل) سے کام لیں گے، ناپ تول میں کمی کریں گے، تجارت کریں گے اور اس میں مشارکت ہوگی تو اس میں ناانصافی اور خیانت کے مرتکب ہوں گے، کسی کا پڑوس ہوگا تو ان سے اذیت پہنچے گی، حدیث میں آیا ہے: "المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده." مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ (کی اذیت) سے مسلمان محفوظ و مطمئن رہیں۔ "لایومن احدکم حتی یامن جاره بوائقه." تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کا پڑوسی اس کی اذیت سے محفوظ نہ ہو جائے۔

تو ایک طبقہ ایسا ہے کہ نہ پوچھئے، اس نے معاملات و اخلاق کو بالکل دین سے خارج کر رکھا ہے، یہ سمجھ رکھا ہے کہ بس عقائد و عبادات ہی ضروری ہیں، باقی اخلاق و معاملات میں بسا اوقات غیر مسلموں سے بھی گئے گزرے ہوتے ہیں، نہ معاملہ کی صفائی نہ وعدہ کی پابندی، نہ امانت کا خیال، نہ انصاف کے ساتھ تقسیم، کوئی چیز نہیں، حقوق العباد نہیں، اہلِ قرابت و اہلِ حقوق کے بارے میں بالکل آزاد، جن لوگوں کے ساتھ ان کا معاملہ پڑتا ہے ان کے ساتھ بالکل آزاد، تجارت میں بھی، زندگی کے دوسرے شعبوں بھی من مانی کارروائی کرتے ہیں، صحابہ کرام

رضی اللہ عنہم کا حال ایسا نہیں تھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عقائد سے لے کر اخلاق و معاملات تک بالکل ترازو کی طرح جو کسی کی رعایت نہیں کرتی، کسی کو ترجیح نہیں دیتی، وہ سب میزانِ عدل تھے، وہ سب معیارِ حق تھے، ان کی کوئی چیز شریعت کے راستہ سے ہٹی ہوئی نہیں تھی، ان کا کوئی عمل شریعت کے راستہ سے ہٹا ہوا نہیں تھا۔

غور کرنے کی بات ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ۱۳ سال مکہ معظّمہ میں رہے اور دس سال مدینہ منورہ کو منور فرمایا، لیکن اس کثرت سے مسلمان اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے جتنے صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیان دو سال کے عرصہ میں۔

امام زہریؒ جو سید التابعین ہیں، سیکڑوں ہزاروں حدیثیں ان سے مروی ہوں گی وہ فرماتے ہیں کہ صلح حدیبیہ سے لے کر فتح مکہ تک جو دو سال کا عرصہ ہے اس میں جس کثرت سے مسلمان ہوئے ہیں اتنی تعداد میں بیس سال میں مشرکین اسلام میں داخل نہیں ہوئے۔

وجہ کیا تھی؟ وہ دیوار (جنگ اور خوف) کی جو صلح حدیبیہ سے پہلے حائل تھی، ہٹ گئی، صلح و امان ہو جانے کی وجہ سے آنے جانے کا راستہ صاف ہوا اور کوئی خطرہ نہیں رہ گیا کیونکہ صلح ہو گئی تھی اور عہد ہو گیا تھا کوئی مسلم غیر مسلم پر حملہ آور نہ ہو گا، اب وہ عزیز یاد آئے اور عزیز اپنے عزیزوں سے ملنے مدینہ طیبہ آنے لگے، ماموں بھانجوں سے ملنے آرہے ہیں، بھانجے ماموں سے، چچا بھتیجوں سے، بھتیجے چچا سے ملنے آرہے ہیں، بہنوئی اور آپس کے جو رشتہ دار ہیں وہ ایک دوسرے سے ملنے آرہے ہیں، پہلے جو آپس کے رشتہ دار ملنے کو ترس گئے تھے، خون کا رشتہ تھا، قرابتیں تھیں،

مگر مدینہ جانا خطرہ سے خالی نہ تھا، اب یہ ڈر نہیں رہا، وہ با اطمینان مدینہ آئے، انھوں نے یہاں دیکھا کہ دنیا ہی بدلی ہوئی ہے نہ یہاں جھوٹ ہے نہ گالی گلوج ہے، نہ غصہ آتا ہے، نہ یہاں ناپ تول میں کمی، نہ یہاں کسی کی حق تلفی ہوتی ہے نہ دنیا طلبی ہے، نہ دنیا پرستی، اللہ کے علاوہ نہ یہاں کسی کا خوف ہے، نہ یہاں کسی چیز کی لالچ ہے، دنیا بدلی ہوئی ہے انھوں نے دیکھا کہ بچوں کو سلا کر ان کے سامنے کھانا رکھ دیا جاتا ہے ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے جس کی طرف قرآن شریف کا اشارہ ہے: وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ اور ان کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں مہمان آئے، یہ کاشانہ نبوت تھا، دوسروں کو کھلانا اور خود فاقہ سے رہنا، آپ ﷺ نے پوچھا کوئی ہے جو ان مہمانوں کو اپنے گھر لے جائے اور کھانا کھلائے حضرت ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ نے اس کو قبول کیا اور گھر لے گئے، ان کی اہلیہ صاحبہ نے کہا مہمانوں کو تو لے آئے ہو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ پر رحم کرے، یہاں تو کھانے کو تو اتنا ہے کہ بچے کھالیں، انصاری صحابی (رضی اللہ عنہ) نے کہا، پہلے تو بچوں کو سلا دینا اور کھانا لے جا کر رکھ دینا، چراغ جل رہا ہوگا، اس کو کسی بہانے سے ہاتھ لگانا کہ بجھ جائے پھر ہم اپنا کام کرلیں گے، یہی ہوا کہ اس اندھیرے میں حضرت ابو طلحہؓ ہاتھ بڑھاتے رہے اور خالی ہاتھ منھ تک لاتے رہے، مہمانوں نے کھالیا اور حضرت ابو طلحہؓ بھوکے رہے، اللہ تعالیٰ نے اس پر وہ آیت نازل فرمائی جو میں نے پڑھی۔

حضرات! قرآن مجید کی آیت ہے: يَا أيها الذين آمنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كافة اے ایمان والو! اسلام میں صلح میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔

ریزرویشن کے ساتھ نہیں کہ اتنا دھڑ ہم آگے کرتے ہیں مسجد میں، اور اتنا پیچھے رہے گا، ہاتھ بڑھاتے ہیں دایاں، بایاں پیچھے رہے گا، یہ نہیں، یہ کوئی طریقہ نہیں ہے، اللہ جل شانہ مطالبہ کرتا ہے، اسلام مطالبہ کرتا ہے کہ پورے کے پورے داخل ہو جاؤ، میں صفائی سے کہتا ہوں اور اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ صاف کہوں کہ ہم مسلمانوں کی معاشرت، ہم مسلمانوں کے شادی بیاہ کے طریقے، ہم مسلمانوں کے وراثت کے طریقے، ہم مسلمانوں کے معاملات شریعت سے دور ہیں اور بہت دور ہیں، اسمیں ہم بالکل آزاد ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی کیا تھی؟ وہ جس کے کچھ نمونے اوپر گذرے۔

یہ تھی زندگی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی، یہ زندگی ہم نے چھوڑ دی ہے، میں یہ کہنا چاہتا ہوں آپ سے کہ صحابہ کرامؓ کی محبت کا، عقیدت کا اور ان کے تذکرہ کا، ان کے نام لینے کا، ان کی طرف نسبت کرنے کا حق ہے کہ آپ ان کی پوری زندگی اپنے لئے نمونہ بنائیں، یہ نہیں کہ صرف ان کی حمایت میں جوش میں آجائیں، اور مدحِ صحابہؓ کا جلوس نکالیں، ان کے نام پر بڑے بڑے جلسے کریں، لیکن عمل کا جہاں تک تعلق ہے، زندگی کا تعلق ہے، وہ بالکل اس سے علٰحدہ، شادی بالکل اپنے طرز پر اور اس سے بڑھ کر جہیز کی لعنت، یہ جہیز کے مطالبے اور اس پر بے گناہ عورتوں کو بیاہی ہوئی دلہنوں کو مار ڈالنا، معاف کیجئے گا! میں اخبار پڑھتا ہوں، مسلمانوں کے واقعات آتے ہیں تو لرز جاتا ہوں، اللہ اپنے عذاب اور غضب سے بچائے، محض پیسے کی محبت میں کہ تم اسکوٹر لے کر نہیں آئیں، تم موٹر لے کر نہیں آئیں، تم فلاں چیز لے کر نہیں آئیں بہت کم زیور لے کر آئیں۔

چند ہفتے پہلے قومی آواز میں لکھنؤ کا ایک واقعہ چھپا تھا۔ آپ کے کسی قریبی

محلّہ کا اور دوسرے شہروں کا تو چھپتا ہی رہتا ہے، ہماری ہمسایہ قوم کو تو پوچھئے نہیں کہ بس اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو اور ہم سب کو ہدایت دے، ان کے پیشواؤں کو یہ سمجھ دے کہ مسلمانوں کو نصیحت کرنے کے بجائے اور رام جنم بھومی کے لئے جان دینے کے بجائے، اپنے فرقہ کے آدمیوں کو بنائیں، اپنے فرقہ کو دولت کی پرستش (پوجا) سے نکالیں، ہمارے یہاں بھی ایسے واقعات پیش آتے ہیں، وہ چیزیں جن کا اس سے پہلے تصور بھی نہ تھا وہ پیش آرہے ہیں، یہ سب پیسے کی بدولت اور اس سے حد سے بڑھی ہوئی محبت کا نتیجہ ہے، حدیث شریف میں آیا ہے: حب الدنیا راس کل خطیئۃ (دنیا کی محبت ہر گناہ اور ہر عیب کی جڑ ہے) آپ نے بالکل اس مرض پر انگلی رکھ دی۔

سامعین کرام! یہاں کا تحفہ، یہاں کا حق اور یہاں کا تقاضہ ہے کہ آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عقیدت کو اپنے دل میں جاگزیں کرلیں، اور یہ سمجھیں کہ پوری آدم علیہ السلام کی اولاد میں انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد کوئی ان کے درجہ کا نہیں ہو سکتا اور نہ ہوا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ ان کی اقتدا کرنے کی کوشش کریں ساری چیزوں میں، عقائد وعبادات میں، اخلاق ومعاشرت میں، معاملات وتعلقات میں، زندگی بھی ویسے ہی سادہ ہو، ویسے ہی ہمسایوں کا حق پہچانیں، قرآن کریم، حدیث شریف اور اسلامی تعلیمات پر عمومی طریقہ پر عمل کریں، کسی صحابی کے یہاں کبھی کوئی چیز تیار ہوتی تو اسے قریب کے گھر میں بھیجا جاتا، وہ گھر اپنے قریبی گھر میں بھیجتا، آخر میں وہ تحفہ اسی کے گھر میں آجاتا جہاں سے چلا تھا، اس سے بڑھ کر کیا کہ میدانِ جنگ میں بالکل جاں بلب پڑے ہوئے ہیں، بھائی اپنے سسکتے ہوئے بھائی کے لئے پانی لاتا ہے کہ گرمی کا زمانہ ہے، گرم ملک ہے

جس کی فضا بھی گرم، انکی خدمت میں پیالہ پیش کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابھی ایک آواز سنی ہے اپنے بھائی کی ان کو دوان کے پاس لے جایا جاتا ہے وہ کہتے ہیں میں نے ابھی آواز سنی ہے اپنے پاس کے ایک زخمی کی، ان کو دو، پھر ان کے پاس آتا ہے، وہ اشارہ کرتے رہے تو جب ان کے پاس آتا ہے تو وہ دم توڑ چکے، واپس جب دوسرے کے پاس آتا ہے وہ بھی دم توڑ چکے ہوتے ہیں اور پانی کسی کے حصہ میں نہیں آتا۔

یہ ساری چیزیں ہمارے لئے قابل قدر ہیں، بلکہ واجب التقلید ہیں، کم سے کم زندگی کو سادہ بنایئے، یہ شادی بیاہ کی رسمیں جو ہم نے اپنے غیر مسلم ہم وطنوں سے ہندوستان میں آئی ہیں وہ واپس کیجئے اور اسلامی معاشرت میں اضافہ کیجئے، اسراف سے بچئے، دھوم دھام سے بچئے اور شان وشوکت اور تعریف سے کہ کیسے دھوم سے شادی ہوئی ہے، کیسے دھوم سے ولیمہ ہوا ہے، کیسا جہیز ملا ہے، ان سب چیزوں سے، اسی طرح سے آپ اپنی افادیت ثابت کیجئے، ملے جلے محلّہ میں، مشرک محلّہ میں ہمارے غیر مسلم بھائی پہچانیں، انگلی اٹھائیں، یہ ہمارے مسلم بھائی ہیں، کم سے کم ایک محلّہ میں ایک مسلم ہو اور سب کو اطمینان ہو، اس محلّہ میں آفت نہیں آئے گی، یہاں بلا نہیں آئے گی، یہاں کوئی فتنہ وفساد کی ہمت نہیں کرے گا، وہ اپنی عورتوں اور بچوں کے بارے میں، وہ اپنے مال ودولت اپنی پونجی کے بارے میں، وہ اپنی عزت کے بارے میں مطمئن ہوں کہ یہاں مسلمان رہتا ہے، یہ ہمیں ہندوستان میں نمونہ دکھانا چاہئے تب جا کر یہاں اسلام پھیلے گا، آپ کو وہ مقام ملے گا، آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور آپ کی وجہ سے لوگوں میں اسلام کے بارے میں اچھا خیال اور اچھا تصور پیدا ہوگا۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔

سیرت و کردار کی تبدیلی کی ضرورت

یہ تقریر جامع مسجد اورنگ آباد میں
۱۷ر اکتوبر ۱۹۸۲ء کو کی گئی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سیرت و کردار کی تبدیلی کی ضرورت

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين حضرات! ابھی قاری صاحب نے جو آیات تلاوت کی ہیں، ان میں ایک آیت یہ تھی اعوذ بالله من الشيطان الرجيم .وَقُل رَّبِّ اَدْخِلْنِی مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِی مُخْرَجَ صِدْقٍ(سورہ الاسراء. ۸۰) .اور کہو کہ اے پروردگار مجھے اچھی طرح داخل کیجیو اور اچھی طرح نکالیو۔

یہاں اورنگ آباد آکر مجھ جیسے تاریخ کے ایک طالب علم پر کچھ پرانی یادوں کا اثر تازہ ہو جاتا ہے، یہ کوئی غیر معمولی اور عجیب بات نہیں ہے، مورخوں کی ایک بڑی دشواری یہ ہے کہ وہ اپنے تاریخی مطالعہ سے کسی جگہ علٰحدہ ہو نہیں سکتے، تاریخ کے نتائج بدلی بن کر سامنے آجاتے ہیں، وہ کتنا ہی چاہیں کہ وہ اس سے ہٹ جائیں، ہٹتے نہیں ہیں۔

اورنگ آباد کو میں ہندستان کا غرناطہ کہتا ہوں، جو لوگ تاریخ اسلام سے واقف ہیں، وہ اس تشبیہ کو سمجھیں گے، ان دونوں میں بڑی مماثلت ہے، اس میں عربی اسلامی سلطنت تھی جس نے صدیوں یورپ میں ڈنکا بجایا، اس کے بار احسان سے وہ کبھی سبک دوش نہیں ہو سکتا ،اس نے یورپ کو بہت کچھ دیا، کاش کہ وہ

پورے یورپ کو اسلام کی دولت دیتا، اس سے یہ بڑی کوتاہی ہوئی اس کوتاہی کے جرمانہ میں اللہ تعالیٰ نے اس سے ملک ہی لے لیا۔

عربوں نے یورپ کو علم کی روشنی دی، حقیقت پسندی اور استقراء کا طریقہ دیا، جس کو یورپ کی علمی ترقی میں بہت بڑا دخل ہے، اندلس ہی ہے، جو یورپ کو قیاس سے استقراء پر لایا، قیاس یہ ہے کہ آپ اپنی طرف سے کوئی اصول وکلیہ اپنی ذہانت ومطالعہ سے بنالیں، اور اس کے بعد جزئیات کو اس کے ماتحت کر لیں، اور استقراء یہ ہے کہ آپ جزئیات پر غور کریں، پھر ان کے عمومی واجتماعی مطالعہ سے آپ ایک کلیہ بنائیں، جزئیات اس کی شہادت وگواہی دیتی ہیں کہ یہ کلیہ ہونا چاہئے۔

یورپ نے جو کچھ ترقی کی ہے، اور فلسفہ مابعد الطبیعیات سے ہٹ کر سائنس، ٹکنالوجی اور تجربہ پر آیا، وہ استقراء کے اصول کو مان لینے کی وجہ سے، اور یہ دین عطیہ ہے اندلس اسلامی (اسپین) کا، اس نے طب کا فن دیا، اور یونان کا فلسفہ منتقل کر کے یورپ کو دیا، انھوں نے یونان کے فلسفہ کو سمجھا، اس کو ہضم کیا، اور پھر اس کی شرح کی، پھر اسی کے ترجمے انگریزی اور دوسری زبانوں میں ہوئے۔

لیکن ان سے کوتاہی ہوئی کہ انھوں نے خالص اسلام کی دعوت یورپ میں نہیں پھیلائی، وہ علوم وفنون کی ترقی، اور ادب وشاعری کی ترقی میں لگ گئے، یہ اس وقت کا موضوع نہیں ہے اور رنگ آباد آکر یہ زخم کہن تازہ ہو جاتے ہیں، وہاں اسلامی عرب سلطنت کا زوال ہوا، اور اس کا آغاز ہوا، اور اس کی آخری فصل لکھا گیا، یہاں ہندستان میں مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوا جو بہر حال مسلمانوں کے اقتدار کی ایک نشانی تھی، مورخ وناقد اس پر کتنی ہی تنقید کریں، ہمیں اس کے بہت سے

کارناموں کو ماننا پڑے گا۔

لیکن میں متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ حکومت وسلطنت اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے اور خود قرآن پاک میں اس کو ایک بڑی نعمت کے طور پر بیان کیا گیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے کہتے ہیں :

یاقومِ اذکُرُوا نِعمۃَ اللّٰہِ عَلَیکُم اِذ جَعَل فِیکُم اَنبِیَاء وَجَعَلَکُم مُلُوکاً وَّاٰتٰکُم مَا لَم یُؤتِ اَحَدًا مِنَ العٰلَمِیْن .(المائدہ ۲۰)۔ بھائیو !اللہ نے تم پر جو احسان کئے ہیں ان کو یاد کرو کہ اس نے تم میں پیغمبر پیدا کئے اور تمھیں بادشاہ بنایا، اور تم کو اتنا کچھ عنایت کیا کہ اہل عالم میں کسی کو نہیں دیا۔

حکومت وسلطنت ایک نعمت ہے، لیکن حکومت وسلطنت کوئی ایسی خارجی اور مصنوعی چیز نہیں ہے جو کہیں سے لاکر کہیں ٹھونک دی جائے، یا خود بخود پیدا ہو جائے، حکومت وسلطنت تو ایک خاص کردار، احساس ذمہ داری، ہمدردی خلائق اور جذبہ خدمت کا مظہر ہے، یعنی جب کسی جماعت یا ملت کا خاص مزاج وکردار پیدا ہو جاتا ہے، تو اس مزاج وکردار کی وسعت اور گہرائی کے مطابق اس کو موقعہ دیا جاتا ہے کہ وہ کسی خطہ زمین پر اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرے :۔

ثُمَّ جَعَلنٰکُم خَلٰئِفَ فِی الاَرضِ مِن بَعدِ ھِم لِنَنظُرَ کَیفَ تَعلَمُونَ (یونس ۱۴) پھر ہم نے ان کے بعد تم لوگوں کو ملک میں خلیفہ بنایا تاکہ دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔

اصل چیز ہے سیرت وکردار، اور وہ طرز زندگی ہے جو ایک سلطنت ہی نہیں، بلکہ سلطنت سے بڑی چیزیں، یعنی معرفت الٰہی، اللہ کے یہاں کی مقبولیت، نظر کی تاثیر، اور خیر عام اور ہدایت ورحمت الٰہی کا دروازہ کھولنے کا کام کرتی ہے،

سلطنت تو اس کا ایک ہلکا اور ایک پھیکا سا نشان ہے، ایمانی سیرت وہ چیز ہے، جو آفاق وانفس کی فتوحات عطا کرتی ہے، اور وہ جہاں گیری عطا کرتی ہے، جس کے سامنے سلطنتیں ہیچ ہیں، وہ اصل چیز جو ہر خیر کا منبع و سرچشمہ ہے، وہ ہے سیرت، میں نے کسی موقعہ پر کہا تھا کہ "ارادے اداروں کو پیدا کرتے ہیں، ادارے ارادوں کو پیدا نہیں کرتے" اصل چیز ہے صحیح ارادہ، جب صحیح ارادہ ہو جاتا ہے تو پھر سیکڑوں ادارے وجود میں آتے ہیں، ادارے جیتے ہیں، مرتے ہیں، پیدا ہوتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں، لیکن ارادۂ انسانی جب صحیح ہو جائے اور انسان کی نیت صحیح ہو جائے، انسان کی سیرت شریعت کے سانچہ میں ڈھل جائے، انسان کے اعمال و تصرفات منشائے الٰہی کے تابع ہو جائیں، منشائے الٰہی کے سانچہ میں ڈھل کر نکلیں اور ذہن کا رخ صحیح ہو جائے کہ ہر بن مو سے صدا آئے۔

"وَقُل رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا" تو ان کے غلاموں کے قدموں کے نیچے کسریٰ و قیصر کے تاج آتے ہیں،

در شبستان حرم خلوت گزید قوم و آئین و حکومت آفرید
ماند شبہا چشم او محرم نوم تا تخت خسروی خوابید قوم

اقبال کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کی امت تخت خسروی پر آکر سو گئی، یعنی اس نے تخت خسروی کو ایک معمولی چارپائی اور ایک سریر سمجھا، اس کو خاطر میں نہیں لائی، جہاں بیٹھنا چاہئے تھا، جاہ و جلال کا اظہار کرنے کے لئے، وہاں وہ سو گئی۔

تو اصل چیز کیا ہے؟ خدا کو جب منظور ہوگا، اور خدا کی حکمت کا تقاضہ ہوگا تو سلطنت وجود میں آئے گی، اور جب خدا کی حکمت کو کچھ اور تقاضہ ہوگا، تو اس

سے بھی بڑی چیزیں وجود میں آئیں گی، یہ درویشانِ بے نوا، یہ فقیرانِ کج کلاہ، آپ کی سرزمین میں آرام فرماہیں، انھوں نے بادشاہوں پر حکمرانی کی ہے، حضرت خواجہ برہان الدین غریب۔۔ کے واقعات پڑھئے، حضرت خواجہ زین الدین کے واقعات پڑھئے، ایک مرتبہ کا واقعہ ہے، کہ شیخ زین الدین کو بادشاہ وقت نے طلب کیا، جو اس وقت کا سب سے بڑا بادشاہ تھا، کسی بات پر اس کو ناگواری ہوئی تو انھوں نے خواجہ برہان الدین غریب کی قبر پر آکر اپنی لاٹھی گاڑدی اور کہا، اب جس میں دم اور ہمت ہو وہ یہاں سے اٹھا کر دیکھے، تو اس کے سامنے بادشاہ ہی جھکا، وہ اس کے سامنے نہیں جھکے، ایسی نظیروں سے پوری تاریخ بھری ہوئی ہے۔

اصل چیز کیا ہے، وہ ہے سیرت کا پیدا کرنا، جس کا عنوان ہے "اَدْخِلْنِی" میں داخل ہوں تو تیرے حکم کے مطابق، نکلوں تو تیری تعلیم اور منشاء کے مطابق، جس کو "مد خل صدق" اور "مخرج صدق" کہا گیا: "وَاجْعَلْ لِّی مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا" (الاسراء۔۸۰) اور اپنے ہاں سے زور وقوت کو میرا مددگار بنائیو) کہا گیا، آپ کے سوا مدد کرنے والی کوئی ذات نہیں ہے، میرے لئے آپ اپنی طرف سے طاقت پیدا کر دیجئے، اصل مسلمانوں کی طاقت اس میں مضمر ہے، کس کی سلطنت رہی ہے؟ اگر کسی کی سلطنت رہتی تو خلافت راشدہ رہتی، اور اس کے بعد کوئی شہنشاہی رہتی تو سلطنت عباسیہ جو پورے متمدن افریقہ اور ایشیا کے عظیم ترین ممالک پر حکومت کرتی تھی، یہ مغلوں کی سلطنت خود کتنی بڑی سلطنت تھی، یہ چیز یعنی نعمت اللہ تعالیٰ کسی کو دے تو فائدہ اٹھانا چاہئے، میں اس کی تحقیر نہیں کرتا لیکن یہ مسلمان کے لئے موت وزندگی کا سوال نہیں۔ یہ نہیں کہ سلطنت ختم ہو جائے تو یہ امت مر گئی، اور جب سلطنت آئے تو یہ

امت زندہ ہو گئی، امت سلطنت سے بالاتر ہے، سلطنت امت سے بالاتر نہیں، سلطنت امت کے لئے ہے، امت سلطنت کے لئے نہیں، سیرت سلطنت بھی پیدا کرتی ہے، اور سلطنت سے بھی عظیم تر چیز پیدا کرتی ہے، اور وہ سیرت خود خدا کو پسند ہے، جس کے انعام میں وہ ساری دنیا بھی عطا کر دے، اور ہفت اقلیم کی سلطنت بھی عطا فرما دے۔۔۔۔ اور عطا بھی فرمائی ہے، کبھی حضرت سلیمان علیہ السلام کو، اور کبھی اپنے کسی اور محبوب بندے کو۔

"وَقُل ربِّ اَدْخِلنِیْ مُدْخَلَ صِدقٍ وَّاَخْرِجنی مخرج صدق "میرا چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، مرنا جینا، سب تیرے لئے ہو، اور الفاظ قرآنی میں وہ کہا جا سکے جس کی نبی کو تعلیم دی گئی ہے :۔

قُل اِنَّ صَلَاتِی وَنُسُکِی وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِی لِلّٰہِ رَبِّ العٰلَمِیْن .لَا شَرِیْکَ لَہ وَبِذٰلِکَ اُمِرتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْن ۔(الانعام ۱۶۲)(یہ بھی) کہہ دو کہ میری نماز اور میری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب خدائے رب العالمین ہی کے لئے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی بات کا حکم ملا ہے، اور میں سب سے اول فرماں بردار ہوں۔

مسلمان کی زندگی شریعت کے سانچہ میں، قرآن وحدیث کے سانچہ میں، سیرت نبوی ﷺ کے سانچہ میں ڈھل کر نکلے، نہ اپنی خواہش سے جانا، نہ اپنی خواہش سے آنا، نہ اپنی خواہش سے اٹھنا، نہ اپنی خواہش سے بیٹھنا، نہ اپنی خواہش سے حکم چلانا، نہ اپنی خواہش سے حکم ماننا، اور نہ اپنی خواہش سے کسی کو زیر کرنا، نہ اپنی خواہش سے کسی کے سامنے زیر ہونا، یہ ہے "ادخلنی مد خل صدق واخرجنی مخرج صدق".

ہر کام کے لئے شریعت کی دلیل ہونی چاہئے، خدا تعالےٰ کیا چاہتا ہے، اس وقت کا فرمان کیا ہے، اسوقت کا حکم کیا ہے؟ اس وقت خدا کا حکم ہے کہ ہم جھک جائیں، اس وقت خدا کا حکم ہے کہ ہم رُک جائیں، حالی نے صحابۂ کرام کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے ؎

بھڑکتی نہ تھی خود بخود آگ ان کی　　شریعت کے قبضہ میں تھی باگ ان کی
جہاں کر دیا نرم نرما گئے وہ　　جہاں کر دیا گرم گرما گئے وہ

حضرات! مجھے ایک تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے' پرانی یادیں ستائیں، اور میرے دل میں چٹکی لیں، یہ الگ بات ہے' لیکن قرآن ازلی وابدی کتاب ہے، اور وہ خدا کا فیصلۂ ناطق ہے، اصل چیز ہے، اسلام کی سیرت بنانا، یعنی نفس کی خواہش، اپنے ذاتی مفادات، اور وقتی تقاضوں کو شریعت کے سامنے جھکا دینا، اور اس کے تابع بنا دینا، یہ جھوٹی عزت، یہ نام وری، یہ شہرت، ہم چشموں میں عزت کوئی چیز نہیں، اصل چیز ہے، امر الٰہی ہے، اور امر الٰہی کیا ہے؟ اس کو تلاش کرنا کہ اللہ تعالےٰ ہماری کیسی زندگی چاہتا ہے، اسوقت اسلام کی مصلحت کا تقاضہ کیا ہے؟ معیار اور کسوٹی یہ ہے کہ ہمیں کیا ملے گا؟ ساری جدوجہد، سیاسی جدوجہد سے لے کر معاشی جدوجہد تک اسی مرکز کے گرد گھومے، وہ کیا؟ کہ ہمیں اس سے کیا ملے گا؟

آج تمام دنیا میں مسلمان ہیں، کون ایسا ملک ہے، جہاں آپ کے ملک کے لوگ موجود نہیں؟ لیکن کس کے لئے ہیں، بس یہی مسئلہ ہے، دعوت پھیلانے کے لئے نہیں، ایسا نہیں ہے کہ انسانیت پر رحم کھا کر انگلستان، کنیڈا، امریکہ، خود عرب ملکوں کی موجودہ خطرناک حالات دیکھ کر وہ بے چین ہو کر اپنے گھروں

سے نکلے ہوں، یہ "اَخرِجنی مخرج صدق" نہیں ہے، اور جو وہاں گئے تو یہ "اَدخِلنِی مُد خَلَ صِدقٍ، نہیں ہے، معاشی مصلحت کے مفاد نے ان کو نکالا، معاشی مفاد نے ان کو وہاں داخل کیا، معاشی وذاتی وخاندانی مفاد نے ان کو وہاں رکھا، جب اس کو تقاضہ ہوگا کہ مکہ کے بجائے نیویارک چلے جائیں تو وہ چلے جائیں گے، آپ جب چاہیں امتحان لے کر دیکھ لیجئے، اور جب اس کا تقاضہ ہوگا کہ مکہ چلے آئیں تو وہاں چلے آئیں گے، اس لئے نہیں کہ وہاں حرم ہے، بلکہ اس لئے کہ معاشی مسئلہ کا تعلق وہاں سے ہے یہ نہ "مدخل صدق" پر عمل کررہے ہیں، اور نہ "مخرج صدق" پر چل رہے ہیں، یہ اللہ کا حکم ہے، اپنے نبی کو تعلیم دی جارہی ہے، اور آپ ﷺ کے ذریعہ آپ ﷺ کے طفیل میں امت کو تعلیم دی جارہی ہے، ہم دعا کریں "رَبِّ اَدخِلنِیْ مُدخَلَ صِدقٍ وَّاَخرِجنِی مُخرَجَ صِدقٍ" ہمارا جینا مرنا، ہمارا کسی سے خوش ہونا، کسی سے ناراض ہونا، ہمارا ٹوٹنا اور جڑنا، ہمارا بگڑنا اور بننا، یہ سب خدا کے حکم اور امر الٰہی کے تابع ہو، پھر دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ کیا عطا کرتا ہے؟ شکوہ اس سیرت کے بدل جانے کا ہے، اس ذہن کے بدل جانے کا ہے کہ شریعت ہماری امام نہ رہی، شریعت ہمارا فیصلہ کرنے والی طاقت نہ رہی جو ہمارے مسائل میں ایک حکم کی حیثیت رکھے، ہم نے شریعت کو حاکم نہیں بنایا، ہم نے اپنی خواہشات کو، اپنے مفادات کو حکم بنایا، بس اس وقت اصل انقلاب جو مسلمانوں کے لئے ضروری ہے، وہ ہے سیرت کا اختیار کرنا کہ ہماری زندگی اللہ اور اس کے رسول کے منشاء کے مطابق بن جائے، وہ ہم سے جو کرائے وہ ہم کریں، وہ جو چھڑائے وہ ہم چھوڑیں۔

آج امتحان لے لیجئے، ہم سب مسلمان کہلاتے ہیں، اللہ کا شکر ہے، اللہ

تعالیٰ کا ہزار ہزار انعام ہے، نبیوں کی دولت ہمارے پاس ہے، ایمان کی دولت ہمارے پاس ہے، میں ہر گز اس کا انکار نہیں کرتا، اور نہ اس کی اہمیت کم کرتا ہوں لیکن اس کے بعد ہماری سیرت کیا ہے؟ جس میں فائدہ دیکھا اس کو کیا، سیاسی جدوجہد کو لے لیجئے کہ ہمارے سامنے اسمبلیوں اور پارلی منٹوں کی ممبریاں ہیں، اس کے بعد کی کمیٹیاں ہیں، اس کے بعد کے کمیشن ہیں، اور اس کے بعد کے فوائد ہیں، عزتیں ہیں، سرخ روئی ہیں، اور دوسرے میدانوں میں دیکھ لیجئے، شادی بیاہ ہے، بس اس میں جو کچھ ہو رہا ہے، غلط ہو کہ صحیح، اس کا مقصد یہ ہے کہ برادری میں تعریف ہو، نام روشن ہو دھوم مچے کہ فلاں کی شادی اس طرح سے ہوئی، فلاں کام اس دھوم دھڑ کے سے ہوا، یہ تو "اد خلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق" نہیں ہے، مسلمان کو پہلے یہ پوچھنا چاہئے کہ شریعت کا حکم کیا ہے، یہ ہمارے لئے جائز ہے کہ نہیں؟ صحابہ کرامؓ نے تو یہی کیا کہ شراب جیسی چیز۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ہم سب کو محفوظ رکھا۔ کسی نے کہا ہے:

چھٹتی نہیں ہے ظالم منہ سے لگی ہوئی

امریکہ میں پریسیڈنٹ ہوور (HOOWER) کے زمانہ میں اس بات کی بھرپور کوشش کی گئی کہ امریکہ سے شراب چھوٹ جائے، دیکھ لیجئے اس کی تمام تر تفصیلات کہ اس کے لئے کیا کیا ذرائع استعمال کے گئے، اس کے لئے جان تک کی بازی لگادی، پروپیگنڈہ کیا، ترغیبات دیں، اس کے نقصانات بیان کئے گئے، تاریخ کی ۹ شہادت موجود ہے کہ بجائے کم ہونے کے مزید لت پڑ گئی، اور ضد ہو گئی کہ شراب نہیں چھوٹ سکتی، آخر میں صدر اور حکومت کو ہار ماننی پڑی، انھوں نے ہار نہیں مانی، اس کے مقابلہ میں مدینہ میں بوریہ پر بیٹھ کر اللہ کا بندہ اور اللہ کا

رسول ﷺ کہتا ہے :.یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْہُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔(المائدہ ۹۰)اے ایمان والو !شراب اور جوا اور بت اور پاسے (یہ سب)ناپاک کام اعمال شیطان سے ہیں، سوان سے بچتے رہنا تاکہ نجات پاؤ۔

یہ کہنا تھا کہ ادھر سے آواز آئی "انتھینا انتھینا "لوگوں کا بیان ہے کہ ہونٹوں پر جتنی شراب گئی ،اس سے آگے بڑھنے نہ پائی ،ایک قطرہ بھی نہیں گیا، اسی وقت انڈیل دی، جو جہاں بیٹھا تھا اس نے وہیں انڈیل دی، دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ مدینہ کی گلیوں اور نالیوں میں شراب اس طرح بہہ رہی تھی جیسے پانی بہتا ہے، اب اس کے بعد دیکھئے کہ شراب پینے کے کتنے واقعات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں پیش آئے جب کہ تمدن بھی آگیا تھا، اور روم وایران اور شام کی دولت کے خزانے امنڈ آئے تھے۔

اس وقت جس چیز کی کمی ہے ،اور جو چیز فیصلہ کن اور انقلاب انگیز ہے وہ ہے اسلامی سیرت کا اختیار کرنا، اور اگر ایسا اجتماعی طور پر ہو تو کیا کہنے ہیں، اجتماعی طور پر بھی الحمد للہ کوششیں ہو رہی ہیں، انفرادی طور پر کوشش کر کے دیکھئے، اور آپ سب لوگ الحمد للہ یہاں پر موجود ہیں، ہم میں سے ہر ایک شخص یہ۔ طے کرے کہ شریعت کو مقدم رکھنا ہے ، حکم الٰہی اور حکم شرعی پوچھنا ہے ، کوئی بھی کام ہو سیاسی انتخاب والیکشن سے لے کر شادی بیاہ، ختنہ ، عقیقہ ، مکان کی تعمیر، جائیداد کی تقسیم ،اور کھانے پینے تک یہ دیکھنا ہے کہ شریعت کی اجازت ہے کہ نہیں ،اور شریعت کا حکم کیا ہے ؟اگر یہ بات پیدا ہو جائے تو تمام کوششیں حاصل ،آپ کا یہاں آنا حاصل اور میرا یہاں آنا اور کچھ کہنا حاصل ،ورنہ۔

نشستند وگفتند وبر خواستند

یہ برسوں سے ہو رہا ہے، نہ ہمیں کہنے سے فرصت ملتی ہے اور نہ آپ کے سننے کی عادت جاتی ہے، اس کا کچھ حاصل ہونا چاہئے، جو نمازی نہیں ہے، وہ اب اس نماز سے جو ظہر کے وقت آنے والی ہے، مرتے مرتے مرجائے عہد کرے کہ نماز نہیں چھوڑیں گے، اگر خدانخواستہ آپ کسی ناجائز چیز کے عادی ہیں تو یہیں توبہ کیجئے کہ اب اسے ہاتھ نہیں لگانا ہے، مسلمان سیاسی طور پر اتنے پیچھے ہیں، ہر جگہ اسی بات کا رونا سنتے سنتے کان پک گئے، جان لبوں پر آگئی۔ بس ہو چکا۔ کم سے کم اپنے شعور کے وقت سے سن رہا ہوں، کوئی مجلس، کوئی جلسہ اس سے خالی نہیں، سیاسی رونا، اقتصادی رونا، لیکن کوئی عزم نہیں، کوئی فیصلہ نہیں، ضرورت ہے ہم اپنی سیرت بدلیں، اس کے بغیر کام نہیں چلتا، اور جب اللہ اپنے محبوب ﷺ سے یہ کہے، اور اس کو یہ تلقین کرے، اور یہ وظیفہ بتائے کہ تم یہ دعا کرو کہ "رب ادخلنی مد خل صدق واخرجنی مخرج صدق" تو ہم کس شمار قطار میں ہیں۔

قانون تو معمولی آدمی نہیں بدلتا، اور یہ تو اللہ تعالیٰ کا قانون ہے، اور قانون یہ ہے کہ پہلے تم بدلو "یٰبنی اسرائیلَ اذکُروا نِعمَتِیَ الّتی انعمتُ عَلَیکُم وَاَوفُوا بِعَھدِیٓ اُوفِ بِعَھدِکُم" (البقرہ ۴۰) اے آل یعقوب! میرے وہ احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کئے تھے اور اس اقرار کو پورا کرو جو تم نے مجھ سے کیا تھا، میں اس اقرار کو پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا تھا۔)

اے بنی اسرائیل (جو اس وقت کی معزز و مکرم قوم تھی) اللہ کے احسان کو یاد کرو، جو تم پر کیا، اور میرے عہد کو پورا کرو، میں تمہارا عہد پورا کروں گا، ترتیب

یہ ہے، لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اللہ میاں اپنا عہد پورا کردیں، باقی پھر دیکھا جائیگا، اور اللہ میاں علیم وخبیر ہے، دل کے حالات جاننے والا ہے، پہلے سے دل میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے، سارا شکوہ خدا سے ہے، ارے صاحب یہ امت مرحومہ، یہ اشرف الامم کس طرح ذلیل کیسی خوار ہے، ہر جگہ پٹ رہی ہے، اور یہ نہیں دیکھتے کہ ہم کیا کر رہے ہیں، آپ اپنی زندگی میں کونسی تبدیلی لائے، اتنے دنوں سے وعظ ہو رہے ہیں، تبلیغی جماعت کام کر رہی ہے، ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ نہ شادی بیاہ کے رسم ورواج میں کوئی فرق ہے، اور نہ مسلمانوں کے اسراف میں کوئی فرق ہے، اسی شہر میں کسی جگہ سے گزر رہا تھا، وہ روشنی دیکھی، خطرہ ہوا کہ شاید یہ گھر کسی مسلمان کا ہو، بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام روشنی یہیں آگئی ہے، کسی بات میں فرق لانے کو تیار نہیں، بیس برس پہلے اور دس برس پہلے جو طرز زندگی تھا وہی آج ہے، جو نماز کے پابند نہیں، وہ نماز کے پابند نہیں، جو پینے پلانے کا عادی تھا، وہ پینے پلانے کا عادی ہے، جو مال میں حقوق العباد میں، معاملات میں، دیانت داری کو ضروری نہیں سمجھتا وہ اب بھی ضروری نہیں سمجھتا، جو ہاتھ لگ جائے وہ اپنا مال۔

یہی ہندستان کا ملک ہے، اگر آپ میں صداقت آجائے، آپ میں انصاف آجائے، آپ میں خلوص آجائے، آپ میں ہمدردی آجائے، انسانی جان ومال کا پورا احترام اور ملک کو بچانے کی پوری فکر پیدا ہو جائے، تو کوئی زبردستی کی بات نہیں، سنت خداوندی تو بڑی چیز ہے، فطرت انسانی ہے کہ کہا جائے گا اب آپ ہی انتظام سنبھالئے، کہ یہ ملک تباہ ہو رہا ہے، گاڑی چلتی نہیں ہے، ہر آدمی آپ ہی کو چاہتا ہے، اپنا کام کرانا چاہتا ہے، اپنا وقت بچانا چاہتا ہے، نقصان سے بچنا چاہتا ہے، انسانی فطرت ہے، اگر اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ کام آپ ہی کے ذریعہ سے ہو سکتا

ہے، تو پھر کہاں کا قومی تعصب اور کہاں کی فرقہ وارانہ عصبیت، سب کہیں گے، لیجئے بس اب آپ ہی ذمہ داری قبول کیجئے، قوموں کی لیڈر شپ اس طرح ہاتھ میں نہیں آیا کرتی کہ آپ لڑتے بھی رہیں، اور کام کچھ نہ کریں، اور شکوہ شکایت کریں، اور اس کے بعد کہیں کہ اقلیت میں ہونے کے باوجود ہمیں وہ حقوق ملیں، اور ہماری مرضی پوری ہو، اقلیت تو اقلیت، فرد واحد اپنی دیانت سے، اپنی خداترسی سے، اپنی قابلیت سے سب کو جھکالیتا ہے اور اپنا لوہا منوالیتا ہے، سیاسی شکوے، سیاسی مظاہرے اور احتجاج بہت ہیں، لیکن ہم اپنی سیرت نہیں بدلتے، ہم میں کا ہر آدمی جس جگہ ہے، جس محکمہ میں ہے، جس محاذ پر ہے وہ ثابت کردے کہ آپ ایک سچے، راست باز انسان ہیں، آپ ایک محنت شعار انسان ہیں، حق وانصاف کے معاملہ میں آپ ہندو مسلم کی بھی کوئی تفریق نہیں کرتے، آپ کے لئے حرام ہے کہ آپ کسی ناجائز پیسے کو نظر اٹھا کر بھی دیکھیں، یہ آپ کچھ دن کر کے دیکھئے پھر ہندستان کا نقشہ کیا ہوتا ہے، اور آپ کس مقام پر نظر آتے ہیں؟

واخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين .



حیاتِ ملی میں خواصِ امت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں

یہ تقریر میرواعظ منزل "میں جمعہ ۳۰ر اکتوبر کو بعد نماز عصر علماء، ائمۂ مساجد اور خواص کے ایک مؤقر مجمع کے سامنے کی گئی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حیاتِ ملی میں خواصِ امت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں

حمدہ صلاۃ کے بعد!

جناب میر واعظ مولانا محمد فاروق صاحب، علمائے کرام! مجھے بڑی خوشی ہے کہ جن حضرات کی خدمت میں مجھے فرداً فرداً حاضر ہونا چاہئے تھا، وہ خود یہاں تشریف لے آئے ہیں، اور ایک جگہ مجھے ان کی زیارت وملاقات نصیب ہوگئی، میں میر واعظ صاحب کا بہت شکر گذار ہوں کہ جو فرض مجھ پر عائد ہوتا تھا، اس سے مجھے انھوں نے بہت خوبی، اور بڑی کریم النفسی کے ساتھ سبکدوش کردیا۔

حضرات! میں اس تھوڑے سے وقت میں ایسے معزز حضرات کی خدمت میں کیا عرض کروں؟

میں ایک حدیث سے مدد لیتا ہوں، صحیحین کی حدیث ہے "الإن فی

الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد كله واذا فسدت فسد الجسد كله، الاوهى القلب" کلامِ نبوت کا نور اس میں صاف چمک رہا ہے، (غور سے سن لو، جسم انسانی میں گوشت کا ایک ٹکڑا مضغۂ گوشت۔ ایسا ہے کہ اگر وہ درست ہو جائے تو جسم کا پورا نظام درست رہتا ہے، "واذافسدت فسد الجسد كله" اور اگر اس میں بگاڑ آجائے تو پھر پورا جسم بگڑنے لگتا ہے، اس میں فساد پھیل جاتا ہے) معلوم ہے مضغۂ گوشت کیا ہے، کونسا ہے ؟ (آپ نے خود ہی اس کی تشریح فرمائی) "الاوهى القلب، یاد رکھو وہ دل ہے" تو میں سمجھ رہا ہوں کہ جس طریقہ سے جسم انسانی کا ایک قلب ہوتا ہے، امت کا بھی ایک قلب ہوتا ہے، انسانیت کا بھی ایک قلب ہوتا ہے یہ قلب جسم انسانی کے اندر اپنے فرائض انجام دیتا ہے، اور اس انسانی جسم کا پورا نظام اس پر موقوف ہوتا ہے، یہ قلب اگر خراب ہو جائے (اور اس کی شکلیں بہت سی ہیں) اس بگاڑ کی اور اس بیماری کی نوعیت کچھ ہو، لیکن جب قلب اس سے متاثر ہو جاتا ہے تو پورا جسم اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، اور پورا جسم اپنے اس نقطۂ اعتدال اور اپنے اس مقام سے ہٹ جاتا ہے، جس مقام پر وہ تھا، اس وقت میں سمجھ رہا ہوں کہ میں کشمیر کے قلب، شاید قلب ودماغ دونوں سے خطاب کر رہا ہوں، ہم آپ سب خدا کے فضل سے صاحبِ قلب ہیں، اہل دل تو نہیں کہتا، اہل دل تو بہت بامعنی اور بہت بلند مفہوم رکھنے والا لقب ہے، شیخ سعدیؒ جہاں ذکر کرتے ہیں، "صاحب دلے گفتہ" "صاحب دلے فرمود" کہتے ہیں، اہل دل کا تو بڑا مقام ہے، لیکن ہم سب اصحاب قلوب ضرور ہیں، آپ غور فرمائیں، دل کے لئے جادۂ اعتدال پر رہنے کے لئے، اور اپنا فطری وظیفہ بحیثیت ایک مضغۂ گوشت، بحیثیت ایک جز کے (لیکن کل کی تنظیم کرنے والے اور حفاظت کرنے والے عضو کے) بڑے نازک اور

عظیم فرائض ہیں۔

اب میں عرض کروں گا کہ دل کے لئے تین چیزیں ضروری ہیں، تاکہ وہ اپنا فطری وظیفہ ادا کر سکے اور جسم کا نظام درست رہے، پہلی چیز یہ کہ وہ زندہ ہو، سارا انحصار اس کی زندگی پر ہے، اگر دل مر گیا تو پھر کسی چیز کا سوال نہیں، کسی شاعر نے کہا ہے ؎

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگی ہی عبارت ہے تیرے جینے سے

پہلی شرط ہے کہ دل زندہ ہو، اس کا زندگی سے رشتہ جڑا ہوا ہو، دوسری بات یہ کہ دل میں حرکت ہو، دل متحرک ہو، اور آپ جانتے ہیں کہ دل کی حرکت بند ہوئی تو دل بھی ختم اور جسم بھی ختم، پھر زندگی کا کوئی سوال نہیں، دل کو حرکت میں رکھنے کے لئے کیا کیا تدبیریں کی جاتی ہیں، طبّی، جسمانی، عضوی اور اب میکانکی بھی، آپ سب جانتے ہیں کہ دل کو حرکت میں لانے کے لئے جس طریقہ سے ایک انسان اپنی زندگی کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے، اسی طرح معالجین اور اطباء اور ہارٹ اسپشلسٹ ہیں، اس کو حرکت میں لانے کے لئے کیا کیا تدبیریں کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حرکت میں آجائے، پھر آگے اس کو باقی رکھنے کی کوشش کی جائیگی، تیسری شرط یہ ہے کہ دل میں حرارت ہو، دل سرد اور افسردہ نہ ہو جائے، یہ تین شرطیں ہوئیں، حیات حرکت، حرارت۔

اب میں عرض کروں گا کہ جس خطہ، جس ملت وامت اور جس خاندان کے خواص ہوں ان کے لئے بھی یہ تین شرطیں ہیں، پہلے یہ کہ وہ زندہ ہوں، دوسرے یہ کہ وہ متحرک ہوں، تیسرے یہ کہ ان کے اندر حرارت ہو، اگر

ان میں سے کوئی چیز چلی جائے اور خواص کا رشتہ زندگی سے منقطع ہو جائے، تو پھر عوام کا کیا حال ہوگا، آپ سمجھ سکتے ہیں، یوں سمجھئے کہ خواص پاور ہاؤس (POW-ER HOUSE) ہیں، ملت اسلامیہ، اور یہ ملت جو آج تک قائم ہے، اپنے اس پاور ہاؤس کے تعلق کی وجہ سے اس کا پاور ہاؤس کبھی بند نہیں ہوا، معطل نہیں ہوا، آپ دیکھتے ہیں، تھوڑی دیر کے لئے پاور ہاؤس آپ کے شہر کا کام کرنا چھوڑ دیتا ہے، اور اس کا ربط ٹوٹ جاتا ہے، تو وائرس (بجلی کے تاروں) میں کرنٹ بند ہو جاتا ہے، اور ہر جگہ اندھیرا، اور سردی پھیل جاتی ہے، تو ملت کا پاور ہاؤس اس کے خواص ہیں، تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ کسی دور میں اس ملت کا پاور ہاؤس بند نہیں ہوا، یہ امت کے تسلسل کی تاریخ در حقیقت خواص کے اصلاحی کارناموں کے تسلسل کی تاریخ ہے، اگر آپ اس کو ذرا گہرائی سے دیکھیں گے تو آپ جس کو ملت اسلامیہ کے بقا کی تاریخ کہتے ہیں، یہ ملت اسلامیہ کے خواص کی بقا اور تسلسل کی تاریخ ہے، ملت میں ہر دور میں ایسے لوگ موجود تھے، جو خود زندہ تھے، خود متحرک تھے، صاحب حرارت تھے، ان کی وجہ سے ملت کی رگوں میں خون کی تقسیم صحیح ہوتی تھی، آپ جانتے ہیں کہ دل خون تقسیم کرتا ہے، اس کی وجہ سے یہ خون رگوں اور شرائین میں دوڑتا ہے تو ملت کے قلب نے کبھی اپنا کام بند نہیں کیا، ملتوں پر جو زوال آیا، اور ملتیں مٹ گئیں، اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا پاور ہاؤس بند ہو گیا، آپ عیسائیت کی تاریخ پڑھیں، یہودیت کی تاریخ پڑھیں، آپ کو معلوم ہوگا کہ انبیائے بنی اسرائیل کے تھوڑے عرصہ کے بعد اسرائیلی پاور ہاؤس نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا، وہ کام کیا تھا، احتساب کا کام، امر بالمعروف نہی المنکر کا کام، حق و باطل میں تمیز کا کام، اور بے خوفی، بے رعبی، خدا پر توکل، صحیح کلمۂ حق کہنا، ہر حال میں کوئی ناراض ہو، کوئی

راضی ہو، بنی اسرائیل کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس پاور ہاؤس نے اپنا کام کرنا چھوڑ دیا تھا، قرآن مجید میں اس کی شہادت ہے :۔

یاٰیھا الذین اٰمنوا اِنَّ کثیرا مِنَ الاَحبارِ وَالرُّھبانِ لیاکلُون اموالَ النّاسِ بالباطِلِ وَیصُدُّونَ عَنْ سَبیلِ اللّٰہِ (التوبہ. ۳۴) اے ایمان والو (اہل کتاب کے) بہت سے عالم اور فقیر لوگوں کا مال ناحق کھاتے ہیں، اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔

اس سے بڑھ کر شاید شہادت نہیں ہو سکتی کہ بنی اسرائیل کا پاور ہاؤس کیا تھا؟ یہ اس کے احبار و رہبان تھے، ان کے علماء اور مشائخ تھے، احبار و رہبان اگر آپ اس وقت کی اصطلاحات میں، اور اسلامی ٹرمس (TERMS) میں ترجمہ کریں تو "علماء و مشائخ" ترجمہ ہوگا، ان کے اکثر علماء و مشائخ لوگوں کا مال ناحق کھاتے تھے، "ویصدون عن سبیل اللہ" یعنی جو کام تھا وہ نہیں کرتے تھے، اور جو کام نہیں کرنا تھا، وہ کرتے تھے، اور اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ پاور ہاؤس نے اپنا اصلی کام چھوڑ دیا، دوسرا کام شروع کر دیا، یہ کانسٹبل جو ٹریفک کنٹرول کرتا ہے، یہ اگر اپنی جگہ چھوڑ دے، اور پانی پلانے لگے، راستہ بتانے لگے تو سواریوں میں ٹکر ہو جائے، بیسیوں حوادث پیش آئیں، حالانکہ وہ کار خیر کر رہا ہے، بہت ثواب کا کام کرتا ہے، پیاسے کو پانی پلاتا ہے، دور تک جاتا ہے، راستہ بتانے کے لئے، لیکن وہ مستوجب تعزیر ہوگا کہ اس نے اپنا اصلی کام چھوڑ دیا، ڈیوٹی چھوڑ دی، علماء و مشائخ کا کام کیا تھا؟ اللہ پر بھروسہ کرنا، زہد و قناعت کی زندگی گذارنا، دوسروں کی جیبوں پر نظر نہ ڈالنا دوسروں کے مال کو نہ دیکھنا، اور جو ملے اس پر شکر کرنا، لیکن کیا کرنے لگے "یاکلون اموال الناس بالباطل" وہ لوگوں کا باطل طریقہ پر مال کھانے لگے، خود محنت نہ کرتے دوسروں کی محنت سے فائدہ اٹھاتے، دوسروں کی محنت کیا

ہے ؟اپنے اور اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنا، اس محنت سے تو یہ مفت میں فائدہ اٹھاتے ہیں، لیکن ان کی جو محنت تھی، انھوں نے جو پڑھنے میں محنت کی تھی، علم حاصل کرنے میں محنت کی تھی، اس کا نتیجہ لوگوں کو وہ دیتے نہیں، یہ اپنی محنت کے نتیجہ میں لوگوں کو شریک نہیں کرتے، اور لوگوں کی محنت کے نتیجہ پر وہ حاوی اور مسلط ہوگئے ہیں کہ اس کا بڑا حصہ انھیں کی نذر ہو جاتا ہے، "ویصدون عن سبیل اللہ "ان کا کام تھا لوگوں کو راستہ بتانا، الٹا راستہ روکنے لگے، یعنی بجائے رہبر کے رہزن بن گئے، اگر آپ ملتوں کی تاریخ پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کا پاور ہاؤس پہلے بند ہوا، اور ملت میں بعد میں فساد آیا، تحریف آئی۔

یہ ہر ملت کی تاریخ ہے، لیکن ہماری ملت کی تاریخ یہ ہے کہ مختصر سے مختصر دور میں بھی اس کے پاور ہاؤس نے کام کرنا نہیں چھوڑا، اور یہ ایک ایسا تسلسل ہے کہ اگر کوئی شخص اس پر قسم کھائے تو وہ حانث نہیں ہوگا (یعنی اس کو کفارہ دینا نہیں ہوگا) اگر میں یہ کہوں کہ اس ملت کی تاریخ میں ایک مہینہ کی مدت بھی ایسی نہیں گذری کہ جس میں اس کا پاور ہاؤس بالکل خاموش ہو گیا ہو، اور کوئی خدا کا بندہ عالم اسلام کے کسی حصہ میں، کسی ملک میں بھی نہیں رہا جو حق کو حق کہے، باطل کو باطل کہے، تو یہ بات صحیح نہیں، اور اس کی سب سے بڑی شہادت صحاح کی روایت ہے کہ "لاتزال طائفۃ من أمتی قوامۃ علی امر اللہ ،لا یرھا من خالفھا" (میری امت میں ہر دور میں، ہر زمانہ میں ایک جماعت ضرور رہے گی، جو حق پر قائم ہوگی، اور کوئی ان کی کتنی ہی مخالفت کرے، اور ان کی مدد نہ کرے ان کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا)

اب کسی علاقہ کے لئے سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ وہاں کے خواص جو

وہاں کا قلب ہیں، وہ یا مردہ ہو جائیں، یا غیر متحرک ہو جائیں، یا ان کی حرارت ختم ہو جائے، بس اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ یہ تینوں شرطیں ہم میں پائی جاتی ہیں یا نہیں؟ حیات، حرکت، حرارت، اگر حیات ہے، لیکن حرکت نہیں ہے، ہماری زندگی میں وقوف و تعطل پیدا ہو گیا ہے، تو جیسے بہتا ہوا پانی، رکنے کے بعد خراب ہونا شروع ہو جاتا ہے، اور اس میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے، اسی طرح ہمارے معاشرہ اور حیاتِ ملی میں بھی فساد آجائیگا، تیسری بات یہ کہ آپ کے اندر حرارت بھی ہو، یعنی آپ کے اندر تعلق مع اللہ، عشق رسول، لقائے رب اور جنت کا شوق، ایمان کی قوت، اور حق بات کہنے کی جرأت باقی ہو، تو پھر کوئی کتنی ہی سازش کرے اس جسم کو خراب کرنے کی، جسم خراب نہیں ہوگا، لیکن اگر قلب اپنا کام کرنا چھوڑ دے تو دنیا کی ساری سلطنتیں اور طاقتیں جمع ہو جائیں تو اس جسم کو زندہ نہیں رکھ سکتیں، جس طریقہ سے کسی درخت کی اگر قوتِ نمو ختم ہو جائے تو آپ ہزار مرتبہ ہزار طریقے سے اس پر پانی گرائیں تو وہ درخت سر سبز نہیں رہ سکتا، تھوڑے دن میں وہ گر جائیگا، اور ایندھن بن جائیگا۔

حضرات! ہمیں تاریخ بتاتی ہے کہ ہندوستان میں ہر دور میں ایسے لوگ رہے جو حق بات کہتے تھے، اور ان کے اندر حرارت تھی، حرارت ایمانی اور حرارت اخلاقی ان کے اندر باقی تھی، جو شخص ان کے پاس بیٹھتا تھا، وہ متاثر ہوتا تھا، ان کے پاس سے گذر جانے والا بھی بعض اوقات محروم نہیں رہتا تھا، اس کو بھی آنچ پہونچتی تھی، اس میں بھی کرنٹ دوڑ جاتا تھا، یہ جو آپ تصوف کی تاریخ اور صوفیائے کرام کے ذکر میں سنتے ہیں، کہ ان کے اندر بھی توکل کے بجائے توا کل، اور حرکت کے بجائے تعطل پیدا ہو گیا تھا، اور رسمیت آگئی تھی، تو یہ بعد کی بات ہے، اور کسی حلقہ اور

جگہ کے ساتھ مخصوص ہے، ہم ہندوستان میں دیکھتے ہیں کہ لوگ جو صوفیاء اور مشائخ کہلاتے تھے، ان کے ذریعہ سے عوام میں ایمان اور عمل کا ایک کرنٹ دوڑتا تھا، اور اگر ایک شہر میں ایک بھی ایسا آدمی ہوتا تھا، تو اس شہر پر غفلت، جاہلیت، خدا فراموشی، دولت پرستی اور موقعہ پرستی کا پورا حملہ نہیں ہونے پاتا تھا، ہوتا تھا، لیکن یہ نہ تھا کہ پورا معاشرہ اس کا شکار ہو جائے، اور اس بہاؤ میں بہہ جائے، ایسا نہیں ہوتا تھا، ایک آدمی بیٹھا ہے، خدا کا بندہ اور سارے شہر میں ایک گرمی سی معلوم ہوتی ہے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء دہلی میں بیٹھے تو معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کا مرکز ثقل یہی ہے، کیا سرکار، کیا دربار، کیا امیر کیا وزیر، کیا شاعر کیا ادیب، کیا عالم، ساری مخلوق ان کی طرف چلی آرہی ہے، پھر خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی کا دور آیا، اور سارا ماحول روشنی اور گرمی سے معمور و مخمور ہو گیا، ہر شہر میں ایسا رہا ہے، آپ اپنے کشمیر ہی کو دیکھ لیجئے، یہاں اللہ کا ایک شیر آیا، حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ اور سارے خطہ کو انھوں نے مسلمان بنا دیا، اور آج بھی ان کے خلوص کی برکت ہے، ان کی للّٰہیت کی برکت ہے، ساری خرابیوں کے باوجود بھی یہاں مسلمان ہیں، یہ کیا تھا؟ یہ وہی قلب کی حرکت و حرارت ہے، ایک قلب اس کا تناسب کیا ہوتا ہے، آپ دیکھئے جسم انسانی کتنا بڑا ہے، اور قلب کتنا چھوٹا ہے، لیکن یہ چھوٹا سا ٹکڑا (مضغۂ گوشت) سارے جسم پر حکومت کرتا ہے، اور سارے جسم کا صلاح و فساد اس سے مربوط ہے، خواص میں تعطل پیدا ہونا، خواص میں دنیا طلبی آنا، خواص میں دولت پرستی کا آنا، خواص میں انتشار پیدا ہونا اصل خطرے کی بات ہے۔

میں ایک واقعہ سناتا ہوں، ایک بزرگ نے سنایا کہ حیدر آباد میں ایک بزرگ کے گھٹنے میں درد ہو گیا تھا تو میں اس میں قیروطی مل رہا تھا (مریدین جن کا بڑا

حلقہ تھا، جب مجلس میں بیٹھتے تھے، خاموش مؤدب، بالکل معلوم ہوتا تھا، کہ سب کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں "کأن علیٰ رؤسھم الطیر" حضرت فرماتے ہیں، سب سنتے ہیں، اس دن معلوم نہیں کہ کیا بات ہوئی کہ ایک یہاں سے بولا، ایک نے بات کہی ایک نے اس کو کاٹا، کسی نے اس کا جواب دیا، اور بالکل معلوم ہوتا کہ بزرگوں کی مجلس نہیں ہے، ہم کسی منڈی میں پہونچ گئے ہیں مچھلی بازار یا سبزی منڈی میں، ادھر سے شور ادھر سے شور، مجھے بڑا تعجب ہوا کہ آج ہوا کیا؟ آج یہ کیا نئی بات ہے کہ یہاں بزرگ اپنی پوری خصوصیات کے ساتھ بنفس نفیس موجود لیکن آج معلوم ہوتا ہے کہ جیسے لوگوں کو احساس ہی نہیں کہ بزرگ سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، انھوں نے میرا استعجاب وحیرت دیکھی تو گھٹنے کی طرف اشارہ کیا، میں سمجھا کہ یہاں درد زیادہ ہو رہا ہے تو میں وہاں ملنے لگا، پھر مجھے تعجب ہوا کہ لوگ اب بھی خاموش نہیں ہو رہے ہیں تو انھوں نے پھر گھٹنے کی طرف اشارہ کیا، تو میں ادھر ملنے لگا، میں نہیں سمجھا کہ کیا بات ہے، اس وقت وہ بزرگ میرے کان کے پاس منھ لائے، اور فرمایا کہ گھٹنے کے درد کی وجہ سے میں رات کے معمولات پورے نہیں کر سکا ہوں اس کی بے برکتی اور اس کی نحوست ہے، جو تم دیکھ رہے ہو، اچھا میں پوچھتا ہوں کہ ایک بزرگ کے اپنے معمولات کے چھوڑ دینے کا جب یہ نتیجہ محفل پر ہوا تو کثیر التعداد خواص کے اپنے معمولات کے چھوڑ دینے کا کیا نتیجہ ماحول اور معاشرہ پر ہوگا؟ اب آپ ضرب لگائیے کہ ایک کا اثر اتنا تو چار کا کتنا، تو آٹھ کا کتنا، تو پچاس کا کتنا، تو اگر کسی جگہ کے سب خواص ایسے ہو جائیں، (خدانخواستہ) تو کیا حال ہوگا؟ اکبر الہ آبادی مرحوم نے اسی حالت کو دیکھ کر کہا ہے ؎

رحم کر قوم کی حالت پہ تو اے ذکرِ خدا

بے ادب ہوگئی محفل تیرے اٹھ جانے سے

جب خواص کو عوام دیکھیں کہ دولت کی اہمیت ان کے دل میں بھی وہی ہے، عہدہ اور عزت کی اہمیت ان کے دل میں بھی وہی ہے جو ہمارے دل میں ہے تو بتایئے کہ پھر عوام پر کیا اثر ہوگا؟

کسی زمانہ میں خواص کا عالم تو یہ تھا کہ اللہ کا ایک بندہ ایک جگہ بیٹھا ہوا ہے، اور وہ وہاں کے بادشاہوں اور حاکموں کو منہ نہیں لگاتا، ایک بزرگ کا میں واقعہ سناتا ہوں، ان کا نام ہے، شیخ الاسلام عز الدین بن عبد السلام، سلطان العلماء کا خطاب تھا، اپنے زمانہ کے بہت بڑے (شاید سب سے بڑے) شافعی عالم تھے، دمشق میں قیام تھا، بادشاہِ وقت کی کسی بات پر خطبہ میں نکیر کی، بادشاہ کو ناگوار ہوا، بادشاہ نے ان کے ساتھ وہ معاملہ کیا جو علماء کے ساتھ نہیں کرنا چاہیے تھا، بے رخی، اور بے توجہی، اس کے بعد وہاں کہیں سے ان کے معزز مہمان آئے، وہ بھی اپنے یہاں کے بادشاہ اور حاکم تھے، ان کو معلوم تھا کہ اس ملک کے سب سے بڑے عالم شیخ عز الدین بن عبد السلام ہیں، اور آج کل وہ معتوب ہیں، انھوں نے کہا کہ ہمارے ملک میں ایسا کوئی عالم ہوتا تو ہم اس کو سر پر بٹھاتے، تعجب ہے کہ آپ اپنے یہاں کے ایسے عالم کے ساتھ ایسا سلوک کر رہے ہیں، بادشاہ نے برا نہیں مانا، اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، لیکن بادشاہ تو بادشاہ ہی ہوتے ہیں، اس کو یہ خیال ہوا کہ اگر میں ایسے ہی چپ چاپ معافی مانگ لوں، اور کہوں مجھ سے غلطی ہوئی تو میری سبکی ہوگی، اور میرا رعب کم ہو جائیگا، تو خواص میں سے کسی کو بلایا، اور کہا کہ دیکھو حضرت سے یہ کہنا کہ میں کسی مجلس میں بیٹھا ہوا ہوں تو وہ تشریف لائیں اور دست بوسی کر لیں، میرا احترام قائم رہے گا، لوگ بھی دیکھ لیں گے، اس کے بعد بات رفع دفع

ہو جائیگی ،جب کسی نے ان سے جا کر کہا تو انھوں نے کہا کہ تم کس خیال میں ہو ؟واللہ میں تو اس پر بھی راضی نہیں کہ وہ میری دست بوسی کرے، چہ جائیکہ میں اس کی دست بوسی کروں، یہ لفظ تاریخ میں موجود ہے، بالکل ان کے الفاظ"لاأرضی أن یقبل یدی فضلا عن أن أقبل یدہ"ایسے ہی ہمارے دہلی کے (جو حقیقی سلاطین دہلی کہلانے کے مستحق ہیں) بہت سے مشائخ عظام کا بھی یہی حال تھا، بادشاہ دہلی نے ایک مرتبہ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں سے کہا اللہ نے مجھے بڑی دولت دی ہے، حکومت دی ہے، کچھ قبول فرمائیں، فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "قل متاع الدنیا قلیل" دنیا کی متاع قلیل ہے، اس قلیل میں سے ایک قلیل ٹکڑا ہندوستان ہے، پھر اس میں سے ایک قلیل ٹکڑا وہ جو آپ کے قبضہ میں ہے، (مثل مشہور تھی، سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم) اگر اس اقل قلیل میں سے میں بھی حصہ بٹاؤں تو کیا رہ جائیگا ؟ایسے ہی ایک مرتبہ باشاہ نے کہا کہ میں ایک رقم پیش کرتا ہوں ،آپ نے معذرت کی ،بادشاہ نے کہا غرباء میں تقسیم فرمائیں، فرمایا، مجھے اس کا بھی سلیقہ نہیں ،آپ اپنے لوگوں کے ذریعہ تقسیم کرادیں، یہاں سے بانٹتے چلے جایئے قلعہ تک پہونچتے پہونچتے ختم ہو جائیگی ،نہ ختم ہوگی تو وہاں جا کر ختم ہو جائیگی ایسے ہی سیکڑوں قصے ہیں۔

یہ مثالیں تھیں، جو لوگوں کے دلوں میں گرمی پیدا کرتی تھیں، دنیا کی مال کی محبت فطرت انسانی ہے "وانه لحب الخیر لشدید" مال کی محبت انسان کی فطرت میں داخل ہے، لیکن اس کے مقابلہ میں یہ مثالیں جب آتی تھیں، استغنا کی، بے نیازی کی دنیا کے جاہ حشم سے بے رغبتی کی، تو لوگوں میں ایمان تازہ ہو جایا کرتا تھا، اور قوتِ مقابلہ ابھر آتی تھی، اور پھر مسلم معاشرہ تنکے کی طرح نہیں بہتا تھا،

جیسے آج بہتا ہے۔

خواص کے لئے صرف حیات وحرکت ہی کافی نہیں، بلکہ حرارت بھی ضروری ہے، اور حرارت کہاں سے پیدا ہوتی ہے، ذکر اللہ سے، حرارت پیدا ہوتی ہے، دعا اور مناجات و توکل سے، اللہ کے راستہ میں تکلیف اور کچھ مجاہدہ کرنا پڑے تو دل میں حرارت پیدا ہوتی ہے، یہ فقر و قناعت کے قصے جو آپ تاریخ میں پڑھتے ہیں، اور یہ حضرات جن کے قصے ہیں، انھوں نے کسی مجبوری سے اس کو نہیں اختیار کیا تھا، یہ ان کے دل کی آواز تھی، اور اس مجبوری سے ضرور اختیار کیا تھا کہ وہ اپنے دل سے مجبور تھے، یعنی اندر سے کوئی ان کے یہ کہتا تھا کہ نہیں یہ نہیں ہو سکتا، ہم دولت کے بندے نہیں ہیں، ہم طاقت واختیار کے بندے نہیں ہیں۔

اس کی ضرورت ہے کہ یہ خواص کا طبقہ باقی رہے، اپنی خصوصیات کے ساتھ اس میں زندگی رہے، اس مین حرکت رہے، اس میں حرات رہے، اور کوئی جگہ کوئی مقام اللہ کے ان بندوں سے خالی نہ ہو، جن کو کوئی تہمت نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ بک گئے، ہزار تہمتیں سہی، فلاں نے غلطی کی، فلاں کے علم میں فلاں کمی ہے، فلاں چیز نہیں بتائی، لیکن یہ کہ بک گئے، کسی کو یہ تہمت نہ لگائی جا سکے، یہ سمجھئے کہ امت کی حفاظت کا گر ہے کہ ایک ہی دو آدمی چاہے ہوں، لیکن ایسے ہوں کہ شکوک وشبہات سے بالاتر ہو چکے ہوں "مِاعَلِمْنَا عَلَیہِ مِنْ سُوءٍ" جو حضرت یوسفؑ کے متعلق امراۃ العزیز نے یہ بات کہی تھی، جب بادشاہ نے پوچھا کہ آخر قصہ کیا ہے؟ تمام شہر میں چرچا ہے، تو اس نے کہا "مَاعَلِمْنَا عَلَیہِ مِنْ سُوءٍ" سچی بات یہ ہے کہ کوئی کمزوری ہم نے ان میں نہیں دیکھی، تو آج بھی امراۃ العزیز ہی کا مقابلہ ہے، دولت کو امراۃ العزیز زلیخا کہہ لیجئے، طاقت کو زلیخا کہہ لیجئے، وجاہت کو زلیخا کہہ لیجئے،

اور یوسفؑ مصری، یوسف عزیز کون ہیں؟ دین! دین کو ایسا ہی ہونا چاہئے کہ کوئی اس کو خرید نہ سکے، اور سب شہادت دیں کہ "ماعلمنا علیه من سوءٍ" درودیوار سے یہ آواز آئے کہ کھرا سونا ہے، جس کا جی چاہے پرکھ لے، سچی بات یہ ہے کہ امت کا مزاج جو اس وقت تک باقی ہے، یہ انھیں بندگان خدا، اور اہل دل کی وجہ سے ہے کہ جن کی وجہ سے یہ امت ہوا میں اڑ نہیں گئی، جیسے اور امتیں خشک پتوں، تنکے کی طرح اڑ گئیں، یا پانی میں بہہ نہیں گئی، جیسی اور امتیں خس وخاشاک کی طرح بہ گئیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس ملت کی ہدایت اور اس کا دینی احتساب کا کام جاری ہو، نمازوں میں ترقی ہو رہی ہے، اس پر نظر ہو کہ تناسب کم ہو رہا ہے؟ یا بڑھ رہا ہے، مسجدیں خالی ہو رہی ہیں کہ بھر رہی ہیں؟ قمار خانے زیادہ آباد ہیں کہ مسجدیں زیادہ آباد ہیں؟ مسلمانوں میں کوئی نئی بیماری تو نہیں پھیل گئی، مثلاً شراب نوشی، قماربازی کی، یا کسی خراب عادت اور بیماری کی ترقی تو نہیں ہے؟ اس سب کی فکر رکھنا، اور اس سے متفکر اور غمگین ہونا، اس کا صدمہ ہونا کہ مسلمانوں میں یہ چیز غلط پھیل رہی ہے، اچھی چیز ختم ہو رہی ہے، خواص امت کا فریضہ اور طبعی وظیفہ ہے، یہ تبلیغی جماعت کا بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے خواص کو عوام تک پہونچادیا، پہلے عوام کو خواص کے پاس لاتے تھے، اس نے خواص کو عوام سے جوڑ دیا، میں یہ نہیں کہتا کہ یہی واحد طریقہ ہے، لیکن عوام سے ربط ہونا چاہئے، ان کے پاس جانا چاہیے، محلوں اور گلیوں میں جانا چاہئے تاکہ دیکھا جا سکے کہ دین بڑھ رہا ہے، یا گھٹ رہا ہے، ترقی ہے کہ تنزلی ہے، کیا چیز نئی پیدا ہوئی، اکبر الہ آبادی مرحوم نے کہا ہے ؎

نقشوں کو تم نہ جانچو لوگوں سے مل کے دیکھو
کیا چیز جی رہی ہے کیا چیز مر رہی ہے

حضرات! میں اس وقت اس حال میں نہیں ہوں کہ اس سے زیادہ عرض کروں، اور نہ اس کی ضرورت ہے، میں سمجھتا ہوں کہ مغز کی بات ہو چکی، آخر میں میں حدیث شریف برکت کے لئے دہراتا ہوں "قال رسول الله ﷺ "الا إن فی الجسد مضغة إذا صلحت صلح الجسد كله وإذا فسدت فسد الجسد كله ألاوهی القلب"

واخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین.







ہر ترقی پر ایمان کو ترجیح دیجئے

سلف صالحین کی خدمات کا اعتراف کیجئے اور ان سے حسنِ ظن رکھئے!

یہ تقریر ۲۰ر جون ۱۹۷۷ء کو مسلم کمیونٹی سنٹر (M.C.C) شیکاگو (امریکا) میں کی گئی، اس موقع پر امریکہ میں اسلامی تنظیمات اور اداروں کے کارکن بڑی تعداد میں موجود تھے، چونکہ یہ دورۂ امریکہ کی آخری تقریر تھی اور یہ امید نہیں تھی کہ اس کے بعد مقرر کو اتنی بڑی تعداد میں دینی و تعلیمی کاموں سے دلچسپی رکھنے والے ذمہ دار اصحاب سے خطاب کرنے کا موقع ملے گا، اس لئے کوشش کی گئی کہ اس تقریر میں اپنے مطالعہ اور تجربہ کا ماحصل اور مخلصانہ مشورے اور گذارشیں پیش کردی جائیں۔

ہر ترقی پر ایمان کو ترجیح دیجئے

سلف صالحین کی خدمات کا اعتراف کیجئے اور ان سے حسنِ ظن رکھئے!

میرے عزیزو، معزز بھائیو اور بہنو!

تین ہفتے ہو رہے ہیں کہ شمالی امریکہ اور کینیڈا کے دورے پر ہوں، اس عرصے میں درجنوں تقریریں اردو اور عربی میں ہوئیں، تقریریں تو تقریروں کی طرح ہوتی ہیں، ان میں خطابت کا عنصر بھی تھا اور مضامین کا اعادہ اور تکرار بھی ،لیکن آج کی اس مجلس کی اور میری تقریر کی نوعیت، اس سے مختلف ہے، میں آج تقریر نہیں کروں گا، بلکہ باتیں کروں گا، باتیں بھی ایسی جیسے ایک خاندان کا فرد اپنے خاندان کے دوسرے عزیزوں سے ملنے کے بعد کچھ تأثرات و تجربات بیان کرتا ہے، اس نشست میں چند عملی باتیں اور ذاتی تجربات (point by point) پیش کروں گا میری درخواست ہے کہ آپ انھیں اپنی ڈائری میں قلم بند کریں یا یادداشت میں

محفوظ کرلیں، میں اس گفتگو میں نہ مبالغہ سے کام لوں گا نہ تواضع سے نہ کچھ حاشیہ آرائی کروں گا اور نہ خوامخواہ خاکساری برتوں گا۔

اس سفر میں مختلف مقامات پر افراد اور جماعتوں کے کارکنوں سے ملنے کے بعد میرے ذہن نے چند باتیں نوٹ کی ہیں، اور کوئی تعجب نہیں کہ یہ سفر جس کا سہرا M.S A اور ہمارے نیک اور مخلص بھائیوں کے سر ہے جو دو تین سال سے مجھے یاد کر رہے تھے۔ یہ باتیں اس سفر کا سرمایہ اور قیمتی تحفہ ہیں، میں بھی اللہ سے دعا کرتا ہوں اور آپ بھی کیجئے کہ اللہ تعالیٰ میری زبان سے ایسی باتیں کہلوائے جو بہت دنوں تک آپ کو کام دیں، اور میرے اس سفر کو بھی وصول کرادیں، کیوں کہ میں بہت ڈرتا ہوں کہ میں نے اس سفر کا حق ادا کیا یا نہیں؟ میں اتنا لمبا فاصلہ طے کر کے آیا اور سفر کے سلسلہ میں جو ضروری انتظامات اور لوازمات ہوتے ہیں وہ سب ہوئے، کہیں مجھ سے خدا کے یہاں سوال نہ ہو، ہو سکتا ہے کہ مجھ سے اس سفر میں بہت سی غلطیاں اور کوتاہیاں ہوئی ہوں، میں بالکل اس معیار پر قائم نہ رہ سکا جس پر مجھے قائم رہنا چاہئے تھا، شاید آج کی بات چیت سے اس کے کفارہ کی صورت پیدا ہو جائے، خدا کرے کہ یہ باتیں آپ کو یاد بھی رہیں، کیوں کہ باتیں بہت کی جاتی ہیں، ہر تقریر کے بعد سوال وجواب کا سلسلہ بھی ہوتا ہے، اور اکثر کام کی باتیں بھلادی جاتی ہیں، یہ بھی ہوتا ہے کہ مقرر کی تقریر کے دوران ہی ذہن سوال سوچنے لگتا ہے کہ اس پر ہم کیا سوال کریں گے، میری درخواست ہے کہ جس وقت تک میں آپ سے بات کروں اس وقت تک آپ اپنے ذہن کو سوال بنانے میں مشغول نہ ہونے دیں۔

سب سے بڑا خسارہ ہے

پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ اس بات کی بھرپور کوشش کریں کہ آپ کے

پاس اسلام کا جو سرمایہ ہے، وہ نہ کھونے پائے اگر آپ کو ذرا تصور آجائے کہ دنیا کی زندگی کتنی مختصر ہے اور آنے والی زندگی کتنی طویل ہوگی اور آخرت میں کن مراحل سے گزرنا پڑے گا تو آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں بلکہ ہو سکتا ہے کہ آپ کا شدت پریشانی میں دم نکل جائے، اگر ہم نے اس ملک میں سب کچھ کیا لیکن آخرت کے استحضار اور خدا کے خوف کی یہ کمائی لٹادی تو ہم سے بڑھ کر کوئی بد نصیب نہ ہوگا، میں ایک حقیقت پسند انسان کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ خدا کی قسم دانے دانے کا محتاج ہونا اس سے کہیں بہتر تھا کہ ہم اپنے آپ کو اس خطرے میں ڈالیں، اور اپنی اولاد کے دینی مستقبل کو داؤں پر لگائیں، سب کچھ ملا اور ہم اپنے ایمان کی دولت کھو بیٹھے تو یہ سب سے بڑا خسارہ ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص میں تین باتیں ہوں گی ان کا ایمان مکمل ہوگا، ان میں سے ایک یہ کہ اس تصور سے کہ وہ کفر کی طرف واپس جا سکتا ہے، اس پر ایسی دہشت طاری ہو کہ جیسے کوئی کسی کو پکڑ کر آگ میں ڈالنے لگے۔

ہم ان آیتوں کے مصداق نہ ہوں کہ۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ہم تمہیں بتائیں کہ وہ لوگ کون ہیں جو اپنے عمل کے اعتبار سے بڑے نقصان میں رہنے والے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کی ساری کوشش دنیا کی زندگی میں بھٹک کر رہ گئی اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ بڑا اچھا کام کر رہے ہیں۔

اس میں بڑی عبرت کی چیز یہی ہے کہ وہ بیچارے یہ سمجھتے ہیں

کہ ہم بہت اچھا کام کر رہے ہیں، مجھے یہ ڈر ہے کہ یہ آیت ہم لوگوں پر منطبق نہ ہوتی ہو، بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جو غلط کام کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ غلط کام کر رہے ہیں، لیکن موجودہ تہذیب کی خصوصیت یہ ہے کہ آدمی یہ نہیں سمجھتا کہ وہ غلط کام کر رہا ہے، اپنے عمل پر وہ مطمئن ہوتا ہے کہ وہ اچھا کر رہا ہے، مثلاً کوئی ہندوستان، پاکستان میں اپنے کسی دوست سے پوچھے کہ تمھارے بھائی کہاں ہیں، اور کیا کر رہے ہیں تو وہ کہے ماشاء اللہ وہ امریکہ میں ہیں اور دونوں ہاتھوں سے دولت لوٹ رہے ہیں، امریکہ میں ان کو اتنے سو ڈالر ملتے ہیں یہ تو وہاں کہا جاتا ہوگا، اور ہم یہاں کہتے ہیں کہ ہم تو بڑے اچھے رہے، حیدر آباد، یوپی، بہار، لاہور اور کراچی میں ہوتے، تو کیا کماتے ؟ ہم کو تو یہاں وہ مل رہا ہے جو وہاں گورنر اور منسٹر کو بھی نہیں ملتا، یحسبون انھم یحسنون صنعاً۔

پہلی بات تو یہ کہنا ہے کہ اس سے ڈریئے، اور ہر ترقی ہر خوش حالی پر ایمان کی سلامتی کو ترجیح دیجئے کہ ایمان یہاں سے سلامت چلا جائے کہ حشر کے دن ایمان کی حالت مین اٹھیں، میں تو کہتا ہوں جو آدمی امریکہ میں رہتے ہوئے ایمان سلامت لے جائے گا اور حشر کے دن ایمان کے ساتھ اٹھے گا شاید اس کا اجر اس سے بڑا ہو جو عرب کی سرزمین میں ایمان کے ساتھ اٹھے، کیونکہ اس نے اپنی شمع ایمان کی حفاظت آندھیوں کے طوفان میں کی، حدیث میں آتا ہے، آپ نے فرمایا، "میرے کچھ بھائی ایسے ہوں گے جو ایمان پر قائم رہیں گے، اور دین کی پابندی کریں گے" صحابہؓ کرام نے کہا یا رسول اللہ کیا ہم آپ کے بھائی نہیں ہیں ؟ آپ نے فرمایا تم تو میرے ساتھی ہو، لیکن میرے ساتھی وہ ہیں جنھوں نے مجھے دیکھا نہیں وہ بہت بعد میں آئیں گے انھیں ایمان بالغیب ہوگا۔

امریکہ میں ولایت کا درجہ

اس میں بالکل مبالغہ نہیں کہ آپ حضرات امریکہ میں ولایت کا اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ حاصل کر سکتے ہیں، اور اللہ کو آپ کا عمل کہیں زیادہ عزیز ہوگا، جب بچہ کہیں دور چلا جاتا ہے تو ماں کا دل اس میں زیادہ اٹکا رہتا ہے، اور وہ دعا کرتی ہے کہ میرا بچہ پردیس میں ہے اللہ اس کی حفاظت کرے" آپ اسلام کے وہ فرزند ہیں جو مرکزِ اسلام سے بہت دور عالمِ مسافرت اور کفر و مادیت کے نرغے میں ہیں آپ پر اللہ کی نظر زیادہ ہوگی، آپ خدا کی رحمت سے ہرگز مایوس نہ ہوں۔

ایمان کو ہر حال میں ترجیح دیجئے، فقر و فاقہ کی حالت میں ایمان لاکھ درجہ بہتر ہے، اس دولت و سلطنت سے جو ایمان کے بغیر ہو، ماشاء اللہ آپ سب ذہین اور تعلیم یافتہ ہیں اگر آپ کو ذرا خطرہ محسوس ہو کہ یہاں ایمان کا خطرہ ہے تو چاہے آپ کو اپنے وطن یا جہاں دین و ایمان کی حفاظت کا اطمینان ہو، پیدل جانا پڑے، سب اہل و عیال کو پیدل لے کر چلے جائیں اور فرمانِ خداوندی۔

ولا تموتن الا وانتم مسلمون اور نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم خدا کے فرمانبردار ہو ۔ ہر عمل کرنے کی ہر حال میں کوشش کیجئے۔

میں دو منٹ کا وقفہ دیتا ہوں تاکہ آپ اس کو ذہن نشین کر لیں۔

رضائے الٰہی

دوسری بات یہ کہ اپنی نیت کی تصحیح کرتے رہیں، جو کام کریں وہ رضائے الٰہی کے واسطے کریں اور کسی جاہ و منصب، عہدہ و غرض کو بیچ میں نہ لائیں دنیا کا فائدہ تو آپ کو انشاء اللہ آپ کی قابلیت اور محنت کے مطابق ملے گا، لیکن نیت ہمیشہ درست رکھیں تاکہ عمل کا صحیح ثواب ملے، حدیث میں آتا ہے۔

انما ا لا عمال با لنیا ت ولکل امرئ مانویٰ فمن کانت ھجرتہ إلی ا للہ ورسو لہ فھجرتہ الی اللہ ورسو لہ ومن کانت ھجرتہ ؓإلی دنیا یصیبھا او امرأۃینکحھا فھجرتہ الی ماھاجر الیہ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر ایک کو اپنے عمل میں سے اتنا ہی حصہ ملے گا جتنے کی اس نے نیت کی اگر کسی شخص کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے سلسلہ میں ہے تو اس کو وہی ملے گا، اگر کسی کی ہجرت دنیا حاصل کرنے کے لئے یا نفس کے تقاضہ کو پورا کرنے کے لئے ہے مثلاً کسی عورت سے شادی کرنے کے لئے جو وہاں رہتی ہے تو اس کی ہجرت اس میں محسوب ہوگی۔

اسی لئے وقتاً فوقتاً اپنی نیت کی تصحیح کر لیا کریں، سب کاموں میں نیت اللہ کی خوشی اور اسلام اور مسلمانوں کی خدمت ہو، انشاء اللہ آپ کو جہاد کا اور بعض مرتبہ شہید کا ثواب ملے گا۔

دعاء کا وزن

آپ ایمان واحتساب (خدا کے وعدوں پر یقین اور اس کے اجر وثواب کے لالچ میں کام کرنے) کا اہتمام کریں تاکہ عمل وزنی ہو، خدا کے یہاں وہی عمل وزنی ہوتا ہے، جو ایمان واحتساب کے ساتھ ہو، رمضان کے متعلق آتا ہے۔

من صام رمضان ایماناً واحتساباً غفر لہ ماتقدم من ذنبہ جو رمضان کے روزے اللہ کے وعدوں پر یقین کرتے ہوئے اور اس کے ثواب کی لالچ میں رکھے گا اس کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔

کوئی پوچھے بھلا کوئی روزہ بھی بد نیتی سے رکھ سکتا ہے؟ مگر بھائیو! ایک ہوتی ہے بد نیتی ایک ہوتی بے نیتی، میں کہا کرتا ہوں کہ مسلمان بد نیتی کے کم لیکن

بے نیتی کے زیادہ شکار ہیں، یعنی کسی عمل کے موقع پر سرے سے غور ہی نہیں کیا کہ یہ عمل رضائے الٰہی کی نیت سے کر رہے ہیں، یا عادتاً اور رواجاً، میکینکل طریقہ پر عمل ہونا کچھ سود مند نہیں۔

اپنے دل کی بیٹری چارج کرتے رہیں

تیسری بات یہ ہے کہ اپنے طرف سے غافل نہ رہیں، بلکہ اپنے دل کا، اعمال کا، نفس کا محاسبہ کرتے رہیں، خود اپنے ممتحن بن جائیں، اور اس کو ٹٹولتے رہیں، اس کے لئے میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ سال دو سال کے بعد اپنے اپنے ملک کچھ عرصہ کے لئے ضرور جایا کریں وہاں سے رابطہ قائم رکھیں، ہندوستان پاکستان اور حرمین شریفین ہو تو اور زیادہ بہتر ہے اور وہاں رہ کر اچھے حقانی، ربانی لوگوں کی خدمت میں حاضر ہوں، جو بے غرض ہیں جن کے پاس بیٹھ کر خدا یاد آتا ہو، ان سے ملاقات کریں یا کسی دینی ماحول میں تھوڑا وقت گذاریں، اگر یہیں رہیں گے تو تعلق باللہ اور ایمانی کیفیات کا سرمایہ خرچ ہوتا جائے گا، جیسے کہ بیٹری برابر استعمال میں رہے تو اس کا مسالہ ختم ہو جائے گا اس کو نئے سیلس (CE L LS S) کی ضرورت ہوگی اس طرح سے اپنے دلوں کی بیٹری کو بھی ہمیشہ نئے سیل دیتے رہیں اور تھوڑے تھوڑے وقفے دو برس کے بعد چار برس کے بعد سہی مگر آپ وطن چلے جائیں، ہم نے دیکھا ہے کہ جو لوگ اپنے ملک سے تعلق رکھتے ہیں ان میں کچھ اور بات ہوتی ہے اور وہاں سے جو لوگ منقطع ہو گئے ان میں وہ بات نہیں رہی انھیں معلوم نہیں کہ دین کا کیا معیار ہے، کیا کیفیات ہیں، محض خانہ پُری ہوتی ہے، نماز کی جگہ نماز، روزے کی جگہ روزہ کوئی چیز کم نہیں، یہاں بھی کرتے ہیں مگر ان کو یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اس میں کتنا خول پیدا ہو گیا ہے، اس کے اندر کتنا بھراؤ ہے، اور

اللہ کے مقبول بندو ں کا کیا حال ہے ؟ کیسی ان کی نمازیں ہوتی ہیں کیسی ان کی عبا دتیں ہوتی ہیں، کیا ان کا ذوق ہے ؟

دینی ماحول کو پاور ہاؤس سمجھنا چاہئے ہندوستان پاکستان میں اب بھی خدا کے فضل سے دینی ماحول ہے، اور وہاں ایسے لوگ ہیں جن کے پاس بیٹھنے سے واقعی دل کا زنگ چھوٹتا ہے، یہ بات میں بڑے تجربے کی بتا رہا ہوں، حجاز میں بھی اسی کا تجربہ ہوا ہے، جہاں میں برابر جاتا رہتا ہوں، وہاں میں نے دیکھا کہ جن خاندانوں نے ہندوستان سے تعلق رکھا وہ ان خاندانوں سے بہتر ہیں، جنھوں نے حجازی تمدن اختیار کر لیا اور بالکل ہندوستان سے کٹ گئے ظاہر ہے کہ حرمین شریفین تو اصل مرکز ہیں اسلام کے لئے، لیکن وہاں بھی مغربی تہذیب کے اثرات پہونچ رہے ہیں، اور دولت کی ریل پیل ہے، وہاں جا کر یہ اطمینان پیدا ہو جاتا ہے کہ ہمارا کیا کہنا ہم تو اہلِ حرم ہیں، کعبہ کی دیوار کے سایہ میں ہیں، تو جو لوگ ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں وہاں آتے جاتے رہتے ہیں، اردو سے تعلق رکھتے ہیں جس میں دینی کتابیں اور دعوتی رسالے نکلتے ہیں، ہندوستان، پاکستان سے علماء حق آتے ہیں تو وہ اپنے ہاں ٹھہراتے ہیں ان سے مسائل پوچھتے ہیں، ان کی دینی حالت بہتر ہے، وہ حرم شریف زیادہ جاتے ہیں، عمرہ زیادہ کرتے ہیں، ان میں مدینہ طیبہ کی حاضری کا زیادہ شوق اور وہاں کا ادب زیادہ پایا جاتا ہے، رسول اللہ ﷺ (فداہ ابی وامی) کی ذات گرامی سے عاشقانہ تعلق ان میں ہوتا ہے۔

سلف سے حسنِ ظن رکھئے

چوتھی بات یہ ہے کہ آپ امریکہ میں ہیں، آپ کو علمی ذوق اور مطالعہ کا شوق بھی ہے، اسلامی لٹریچر پڑھتے ہیں، میں نے دیکھا کہ یہاں اچھی اچھی کتابیں

انگریزی اور اردو کی پڑھی جاتی ہیں، اور مسلم ممالک کے مفکرین، علماء و قائدین یہاں آتے ہیں، اور ان کی تقریریں ہوتی ہیں، ایک بات میں اپنے تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ آپ سلف صالحین اور امت کے ان لوگوں سے جنھوں نے اپنے اپنے دائرہ میں دینی و ملی کام کیا ہے، بدگمان نہ ہوں یہ بڑے خطرہ کی بات ہے یہ بات ہمارے ان بھائیوں میں بہت زیادہ پیدا ہوتی جارہی ہے جن کا سارا انحصار مطالعہ پر ہے، وہ تنقیدی کتابیں اور مضامین پڑھتے ہیں تو ان کو ایسا نظر آنے لگتا ہے کہ کسی نے اسلام پر مکمل کام ہی نہیں کیا ان کتابوں کے اثر سے وہ دینی خدمت کے ناپنے کے لئے ایک فیتہ بنا لیتے ہیں، جس سے وہ ہر مصلح اور مجدد کو ناپتے ہیں، جیسے فوج میں بھرتی ہونے والے رنگ روٹ ناپے جاتے ہیں، یہ صحیح نہیں۔

آپ کو معلوم نہیں کہ ان اللہ کے بندوں نے کن سخت حالات میں کام کیا، میں مثال کے طور پر کہتا ہوں کہ اگر کوئی یہ کہے کہ "شیخ عبد القادر جیلانی جو پیرانِ پیر اور بڑے پیر صاحب" کے نام سے مشہور ہیں، اسلامی سلطنت قائم نہیں کر سکے وہ بیٹھے بیٹھے وعظ کہتے تھے، عباسی خلیفہ نے اسلامی نظام کو معطل کر رکھا تھا، اور خلافت پر قابض تھا، اس وقت خلافت علی منہاج النبوت قائم نہیں تھی، اس وقت شیخ عبد القادر جیلانیؒ نے اس کی کوشش کیوں نہیں کی؟

حضرات! آپ کو معلوم نہیں کہ خدا کے اس شیر نے کیا کام کیا، آج تک افریقہ ان کا احسان مند ہے کہ وہاں اسلام ان کے سلسلہ سے پھیلا، انڈونیشیا، ہندوستان اور ملک ملک میں اسلام ان کے ذریعہ سے داخل ہوا، اور پھیلا اور انھوں نے کتنے مردہ دلوں کی مسیحائی کی، نہ معلوم کتنے لوگوں کو کفر و شرک سے نکالا پھر وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ عباسی خلفاء رسول اللہ ﷺ کے خاندان کے لوگ ہیں یہ

قرآن مجید اسی طرح سمجھتے ہیں جس طرح ہم سمجھتے ہیں، عربی النسل ہیں، ہاشمی ہیں آخر کیا بات ہے کہ یہ خلافت کا حق ادا نہیں کرتے اصل بات یہ ہے کہ دنیا کی محبت ان پر غالب ہے، یہ نفس کے بندے بن گئے ہیں، تو معلوم ہوا کہ ساری خرابی کی جڑ نفس کی بندگی اور دنیا کی محبت ہے، اور اسی مرض کا علاج کرتے تھے، میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آج پاکستان میں کیا خرابی ہے، کیا یہ ملک اور اس کے سربراہ مسلمان نہیں؟ انھوں نے اسلام کے نام پر ملک بنایا تھا، کل ہی مجھے پاکستان کے ایک شخص نے بتایا کہ ہمارے ایک عزیز کا لڑکا لائلپور میں حکومت کے خلاف مظاہرہ کرنے والے ایک جلوس میں شریک تھا، کسی نے نعرہ لگایا کہ پاکستان کی بنیاد کس پر پڑی؟ تو اس نے کہا کہ "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پر، اسی وقت ایک گولی اس کے سینہ کو لگی اور اس کا کام تمام ہو گیا، بتایئے کہ اس نے مسلمان کے ہاتھ سے گولی کھائی یا کسی غیر مسلم نے کسی ملک سے آکر اس کو گولی کا نشانہ بنایا؟ یہ جو ہو رہا ہے کہ مسلمان مسلمان کو مار رہا ہے کیوں مار رہا ہے؟ اگر کوئی خدا کا بندہ اس فساد کی جڑ دنیا کی محبت اور نفس پرستی کو سمجھتا ہے تو اس نے کیا غلط کام کیا کہ ساری عمر اس سے لڑتا رہا؟

اسلام کے دنیا میں اس وقت باقی اور محفوظ رہنے میں ان سب لوگوں کا حصہ ہے جنھوں نے اس کی خدمت میں حصہ لیا۔

بعض مرتبہ کسی وجہ یہ ذہن بن جاتا ہے کہ ایک ہی کام ہے اگر کسی نے اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش نہیں کی تو گویا اس نے کوئی کام نہیں کیا، چاہے وہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ ہوں یا حضرت مجدد الف ثانیؒ یا حضرت شاہ ولی اللہؒ یہ

تاریخ کے سطحی مطالعہ کا نتیجہ ہے، میں صاف کہتا ہوں کہ اسلام اب جو دنیا میں محفوظ ہے، اور زندہ ہے اس میں سب کا حصہ ہے، محدثین، فقہاء، صلحاء امت، اولیاء اللہ سب کا اس میں حصہ ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ "امام ابو حنیفہؒ کیا کرتے تھے؟ نماز روزے کے مسائل بتاتے تھے، انھیں تو اسلامی خلافت وسلطنت قائم کرنی چاہئے تھی۔" تو صاحبو خلافت تو قائم ہو جاتی لیکن آپ کو نماز پڑھنا کون سکھاتا؟ اور وہ خلافت کس کام کی جس میں نماز پڑھنا کسی کو نہ آتا ہو؟

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ وہ لوگ جن کو ہم زمین میں اقتدار دیں گے تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے یہ نہیں کہ جن کو ہم نماز پڑھنا سکھائیں گے وہ حکومت قائم کرلیں گے، ترتیب یہ ہے کہ حکومت اس لئے ہے کہ نماز پڑھنے کے لئے فضا ہموار ہو کوئی عذر نہ کرسکے۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں" حتیٰ لاتکونَ فتنۃٌ ویکونَ الدِّینُ کلہ للّٰہ" یہ خیال آپ کے دل میں نہ آئے کہ سب ناقص تھے، کسی نے اسلام کو سمجھا نہیں کسی نے پورے اسلام کو قائم کرنے کی کوشش نہیں کی، یاد رکھئے سب لوگ اپنے امکان واستطاعت کے مطابق دین کی خدمت اور اس کی حفاظت میں لگے ہوئے تھے، کوئی وعظ کہہ رہا تھا، کوئی تقریر کررہا تھا اور کوئی حدیث پڑھا رہا تھا، کوئی فتوے دے رہا تھا اور کوئی کتابیں لکھ رہا تھا اپنی اپنی جگہ اسلام کی خدمت اور مسلمانوں کی تربیت کا کام کررہے تھے، اور ہر ایک نے الگ محاذ سنبھال رکھا تھا۔

صوفیہ کا کارنامہ جن لوگوں نے اپنی جگہ بیٹھ کر اللہ کا نام سکھایا اور لوگوں کی تربیت

کی ان کے کام کی تحقیر نہ کی جائے، یہ کام انھوں نے کیا جن کو عرف عام میں صوفیائے کرام کہتے ہیں، آپ کو معلوم نہیں کہ صوفیائے کرام نے کیا خدمت انجام دی؟ انھوں نے اسلامی معاشرہ کو زوال سے بچایا ،اس کا میرے پاس ثبوت ہے، انھوں نے ایسا بنیادی کام کیا کہ اگر وہ نہ کرتے تو مادیت کا یہ سیلاب لوگوں کو بہا کرلے جاتا اور تنکے کی طرح امتِ اسلامیہ بہتی اسی کی وجہ سے لوگ رکے ہوئے تھے، اور ہوس رانی، نفس پرستی کا بازار گرم نہیں ہونے پاتا تھا، اور جو کوئی اس کا شکار ہو جاتا تھا تو فوراً اس میں احساس پیدا ہوتا تھا کہ ہم غلط کام کر رہے ہیں ان کے پاس آتا تھا، روتا تھا، استغفار کرتا تھا، پھر یہ صوفیاء و مشائخ کام کے آدمی بناتے تھے، اور اپنی جگہ پر فٹ کرتے تھے، تاریخ ہماری ناقص ہے میں نے "تاریخ دعوت وعزیمت" کے مقدمے میں لکھا ہے، کہ نقص تاریخ نویسی کا ہے، نقص تاریخ اسلام کا نہیں، تاریخ اس طرح لکھی گئی ہے کہ وہ سرکار دربار کے گرد گھومتی رہتی ہے، اس میں ان اصلاحی کوششوں کا پورا جائزہ نہیں لیا گیا ورنہ کوئی خلا نہیں۔

اسلام وقرآن صدیوں تک معمہ نہیں بنے رہے

یہ کبھی نہ سمجھئے گا کہ اسلام کو اب کچھ لوگ سمجھے ہیں، اس سے پہلے کوئی پورے اسلام کو سمجھا ہی نہیں، یہ اسلام پر بڑا الزام ہے، یہ اسلام کی صلاحیت پر بڑا دھبہ ہے، اس سے قرآن شریف کی زندگی اور اس کا واضح اور قابل، فہم ہونا مشکوک بن جاتا ہے، جس کو "کتاب عربی مبین" "لسان عربی مبین" کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہے، اس کے علاوہ جو کتاب ہزار بارہ سو برس تک نہ سمجھی گئی ہو، اب کیا اطمینان ہے کہ وہ صحیح سمجھی گئی ہو؟ اس لئے میں ہر اس تحریر کو مضر سمجھتا ہوں جو یہ تاثر دے کہ پورے اسلام کو ہزار بارہ سو برس تک نہیں سمجھا گیا، یا بعض بعض اسلامی

حقیقتیں اس وقت تک بالکل تاریکی میں ہیں، میں اس کو بالکل ماننے کے لئے تیار نہیں اسلام کے بنیادی اصول، قرآن کے حقائق، اور دین کے قطعیات، تسلسل کے ساتھ چلے رہے ہیں، اگر کوئی سمجھتا ہے کہ وہ عرصہ تک نہیں سمجھے گئے تو یہ اس کے نظر کی کوتاہی ہے، ایک بات بھی کوئی ثابت کردے کہ یہ حقیقت بالکل عالم اسلام بھول گیا، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ایک سنت بھی نہیں ہے جو پورے طور پر عالم اسلام سے کلیتاً اٹھ گئی ہو، اگر اس کونے پر موجود نہیں تھی، تو اس کونہ پر موجود تھی، گویا بقول اقبالؔ ؎

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

جیسے سورج حقیقتاً نہیں ڈوبتا، ایک جگہ ڈوب گیا لیکن دوسری جگہ نکلا ہوا ہے، ویسے ہی اسلام کی حقیقتیں کہ اگر ایک جگہ ان پر پردہ پڑ گیا تو دوسری جگہ دوسرے لوگ بیدار ہو گئے اور اس کے لئے جان کی بازی لگادی، یہ بات ذہن میں ہرگز نہیں آنی چاہئے کہ ہزار برس گزر گئے کسی نے اسلام کو پورے طور پر سمجھا ہی نہیں، گویا اسلام کوئی چیستاں ہے، عقیدۂ تثلیث کی طرح ایسی چیز ہے جسے سمجھانے کے لئے بڑا فلسفہ چاہئے نہیں-ایسا نہیں، ممکن ہے کہ ہمارا آپ کا دوبارہ ملنا نہ ہو، میں یہ باتیں آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں، کسی پر حملہ مقصود نہیں صرف اس لئے کہ پوری وضاحت کے ساتھ یہ باتیں آپ کے سامنے آجائیں ایک بات تو یہ کہ سلف سے حسنِ ظن رکھئے، اور ان کے لئے دعاء کرتے رہئے، قرآن شریف میں ہے۔

وَالذِینَ جَاؤوا مِن بعدِهِم یَقولونَ رَبنا اغفِرْ لَنَاوَلِاخْوانِنَا الَّذِینَ سَبقُونَا با لاِیمانِ وَلاَ تَجْعَلْ فِی قُلوبِنَا غِلاً لِلَّذِینَ امنُوا رَبَّنَا اِنَّكَ رَؤفٌ رَّحِیم اور

(ان کے لئے بھی) جو ان (مہاجرین) کے بعد آئے (اور) دعا کرتے ہیں کہ اے پروردگا ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے جو ہم۔ سے پہلے ایمان لائے ہیں، گناہ معاف فرما اور مومنوں کی طرف سے ہمارے دل میں کینہ (وحسد) نہ پیدا ہونے دے اے ہمارے پروردگار! تو بڑا شفقت کرنے والا مہربان ہے۔

آپ سلف کے ساتھ حسنِ ظن رکھئے اس میں ایمان کی بڑی حفاظت ہے، ورنہ آدمی کی زبان بے باک ہو جاتی ہے، اور جو چاہتا ہے کہہ دیتا ہے، بھائی کیا دین کو وہ لوگ نہیں سمجھے جو ہم سے عمل میں، علم میں، انابت میں کہیں بڑھے ہوئے تھے، جب وہ نہیں سمجھے تو ہم کیسے اعتبار کریں کہ ہم سمجھ گئے۔

نمازوں کا اہتمام

ایک چیز یہ کہ اس ملک میں ایمان کے حفاظت کی صورت یہ ہے کہ آپ نمازوں کو ہاتھوں سے نہ جانے دیں، نمازوں کو وقت پر پڑھنے کی پوری کوشش کریں حضرت عمرؓ نے ایک گشتی فرمان میں لکھا تھا، تمھارے تمام امور و معاملات میں سب سے اہم نماز ہے، جس نے اس کی حفاظت کی وہ تمام چیزوں کی حفاظت کرے گا اور جس نے اس کو ہاتھ سے جانے دیا اور ضائع کر دیا وہ کوئی چیز باقی نہیں رکھے گا، پس نماز کو قائم رکھئے، چاہے بازار میں یا کہیں بھی ہوں فرض پڑھ ہی لیجئے باقی سنتوں کو بھی حتی الامکان ادا کرنے کی کوشش کیجئے یہ سنتیں اور نوافل فرائض کو بھی محفوظ رکھتے ہیں۔

اور آخری بات یہ ہے کہ یہاں کی تہذیب سے جو اپنے نقطۂ عروج پر ہے، اپنی حفاظت کیجئے، مجھے یہاں بعض باتوں میں بہت تساہل نظر آیا، میں صاف کہے دیتا ہوں کہ یہاں مردوں اور عورتوں کا اختلاط بہت زیادہ ہو گیا ہے، حتی الامکان مخلوط

جلسوں، اور مجالس سے بچنے کی کوشش کیجئے، اگر کہیں مجلس ہو جہاں عورتوں کی شرکت ہو، اور وہاں آپ کی شرکت ضروری ہو تو ان کا حلقہ الگ رکھئے، یہاں تک کہ ان کا راستہ تک الگ رکھئے، اس میں بڑی حفاظت ہے، اسلامی معاشرت بڑی حکمتوں پر مبنی ہے اور حدیثوں میں مردوں اور عورتوں کے تخلیے کے لئے بہت سخت الفاظ آئے ہیں، بہت ڈرایا گیا ہے، امریکی تہذیب کے ان اثرات کو آپ قبول نہ کریں، جہاں تک ہو سکے اسلامی تمدن، اسلامی معاشرت کی حفاظت کریں اور اس کے اچھے خصوصیات اور ان کے اچھے اجزا کو باقی رکھنے کی کوشش کریں۔

آخر میں میں آپ حضرات سے یہ عرض کروں گا کہ خدا کرے میری گفتگو سے آپ کو غلط فہمی نہ ہو، اور یہ نہ سمجھیں کہ میں کوئی جارحانہ یا منفی بات کہہ رہا ہوں، میں نے جو کچھ کہا ہے، آپ کی ہمدردی میں کہا ہے، اور اپنا فرض سمجھ کر کہا ہے، میرے دل میں سب کا احترام ہے، اور وسعتِ قلب میں بدنامی کی حد تک مشہور ہوں، میرے تعلقات خدا کے فضل سے مختلف الخیال لوگوں سے ہیں، اور میں سب کی قدر کرتا ہوں، لیکن میں نے اپنا اخلاقی فرض سمجھ کر چند باتیں آپ کے سامنے رکھ دیں، انشاء اللہ بقدرِ توفیق اور بقدرِ استطاعت آپ لوگوں کے لئے دعا بھی کرتا رہوں گا، اور آپ سے بھی مجھے یہی امید ہے۔

وآخر دعوانا اَن الحمدُ للّٰہِ رب العالمین



دین اور علم کا دائمی رشتہ

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسنؒ علی ندوی نے یہ تقریر ۲۵ر نومبر ۱۹۸۳ء کو مدرسہ مطلع العلوم اجین کی جدید عمارت کے سنگ بنیاد کے موقعہ پر کی تھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دین اور علم کا دائمی رشتہ

حمد وصلوۃ کے بعد فرمایا:

مَاكَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَانَفَرَمِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ اِذَارَجَعُوا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ (سورۃ التوبۃ ۱۲۲) اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مومن سب کے سب نکل آئیں تو یوں کیوں نہ کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے، تاکہ دین کا (علم سیکھتے اور اس) میں سمجھ پیدا کرتے، اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آتے تو ان کو ڈر سناتے، تاکہ وہ حذر کرتے۔

میرے عزیزو، بھائیو، اور دوستو! ابھی آپ نے مولانا برہان الدین صاحب استاذِ تفسیر دار العلوم ندوۃ العماء کی بڑی جامع مانع تقریر سنی، میں بھی اس سے استفادہ کر رہا تھا، علماء کا اصل منصب کیا ہے؟ وہ نائبین نبیؐ ہیں، اور نبوت کے فرائض، یا اس کے منصبی کام اور اس کے شعبے کیا کیا ہیں؟ وہ انھوں نے شرح وبسط کے ساتھ بیان کئے، تلاوتِ کتاب، پھر تعلیم کتاب، تعلیم حکمت، بعض حضرات نے اس کو الگ الگ شمار کیا ہے، اور پھر تزکیہ، اس پر انھوں نے بڑے مناسب طریقہ سے روشنی ڈالی۔

اسلام اور علم کا رابطہ

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا اور علم کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اسلام علم کے بغیر نہیں رہ سکتا، واقعہ یہ ہے کہ علم بھی اسلام کے بغیر نہیں رہ سکتا، لیکن یہ کسی اور مجلس میں شرح وبسط کے ساتھ کہنے کی بات ہے، وہ علم علم ہی نہیں، جو وحی کی سرپرستی اور وحی کی رہنمائی بلکہ وحی اور علوم نبوت کی انگلی پکڑ کر کے نہ چلے، اور جس پر وحی کی مہر تصدیق ثبت نہ ہو، اور جو وحی اللہ تبارک تعالیٰ کے بھیجے ہوئے، اور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں کی سرپرستی میں، اتالیقی میں، نگرانی میں، رہنمائی میں نہ ہو، وہ علم علم نہیں۔

علمے کہ رہ حق نہ نماید جہالت است

اس وقت ہمارا آپ کا موضوع ہے کہ اسلام بغیر علم کے نہیں رہ سکتا، اس کی مثال بالکل ایسی ہے، جیسے آپ مچھلی کو پانی سے نکال دیجئے تو اس کا دم گھٹنے لگتا ہے، اور وہ مر جاتی ہے، تو اسی طریقہ سے اسلام کے لئے علم ضروری ہے، خدا کی صحیح معرفت ہو، اس کی ذات وصفات کی صحیح معرفت ہو، اس کا بندوں کے ساتھ کیا تعلق ہے، بندوں کا اس کے ساتھ کیا تعلق ہونا چاہئے، زندگی کا مقصد کیا ہے؟ آغاز کیا ہے، انجام کیا ہے؟ ابتداء کیا ہے، انتہا کیا ہے؟ انسان کہاں سے آیا، کیوں آیا، اور کہاں اس کو جانا ہے، اور پھر کیا ہونا ہے، اس سب کا علم ہونا ضروری ہے، اسی لئے اسلام علم کو چاہتا ہے، وہ علم کو ضروری قرار دیتا ہے۔

پہلی وحی میں علم وقلم کا تذکرہ

پہلی وحی جو رسول اللہ ﷺ پر غار حرا میں نازل ہوئی، اور سیکڑوں برس کے بعد آسمان وزمین کا پہلی مرتبہ جو رشتہ قائم ہوتا ہے، زمین کے لئے کچھ لینے کے لئے، اور آسمان کے لئے کچھ دینے کے لئے، برسوں کے بعد جو دو ٹکڑے ہوئے ملتے

ہیں، وہ ایک دوسرے کو کیا کیا فغاں و فریاد، شکایتیں اور حکایتیں سناتے ہیں، لیکن اس وقت جو یہ دو بچھڑے ہوئے ملے تو آسمان سے اس نبی کو جس کو زمین والوں کا رشتہ اللہ سے جوڑنا تھا، سب سے پہلا پیغام "اقرأ" کی شکل میں ملا، اس سے آپ علم و قلم کی اہمیت و عظمت سمجھئے جن کو اس پہلی وحی اور پیغام آسمانی میں عزت کا مقام دیا گیا۔

شیخ سعدیؒ نے آنحضرت ﷺ کی شان میں کہا تھا

کتب خانۂ چند ملت بشست

لیکن آپ نے کتب خانے اتنے دھوئے نہیں جتنے کتب خانے بنادیئے، وہی کتب خانے دھوئے جن کو دھونا چاہئے تھا، لیکن دھو کر کے پھر کیا دیا؟ نور دیا، یقین دیا، اللہ کی صحیح معرفت عطا فرمائی، انسان کو انسان بنادیا، اور جاہل انسان بلکہ حیوان صفت انسان کو دنیا کا معلم بنادیا، بقول اکبر۔

جو نہ تھے خود راہ پر، غیروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی، جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

تعلیم وتعلم کی ضرورت اور اس کا انتظام

دنیا کی کوئی قوم علم سے مستغنی ہو سکتی ہے، کہہ سکتی ہے کہ نہیں ہمارا کوئی نقصان نہیں، ہم پر کوئی فرض واجب نہیں، ضروری نہیں ہے کہ ہم پڑھیں اور پڑھائیں، بچوں کی تعلیم کا انتظام کریں؟ لیکن روئے زمین پر قیامت تک مسلمان کہیں بھی آباد ہوں، وہ چاہے مقامات مقدسہ ہوں، چاہے جزیرۃ العرب ہو، چاہے یورپ وامریکہ ہو، چاہے ہندوستان کی سرزمین ہو، شہر ہو، قصبہ ہو، دیہات ہو، جہاں مسلمانوں کے چار گھر بھی ہیں، بلکہ جہاں چار مسلمان بھی پائے جاتے ہیں، وہاں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ "اقرا" کا سامان کریں، وہ اس کی تعمیل کریں

کہ پڑھو، یہ کام شفاخانوں کے قیام سے زیادہ ضروری، اور آپ کی دکانوں سے زیادہ ضروری ہے، یہ کارخانوں کے قیام سے زیادہ ضروری ہے، اس میں سے کسی چیز کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مامور نہیں فرمایا، یہ نہیں فرمایا کہ تجارت کرو، کماؤ کہ یہ بھی بہت بڑی طاقت ہے، دین حق کو غالب کرنے کے لئے خوب پیسہ پیدا کرو، خوب دولت جمع کرو، اپنی امت کو یہ سبق سکھاؤ، یہ کہیں نہیں فرمایا، فرمایا تو یہ فرمایا ''اقرا'' (پڑھو) اب بتایئے کہ علم کا کیا مقام ہوا؟

اچھا پھر وہ علم جو من جانب اللہ حاصل ہوتا ہے، ایک علم لدنی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کسی کسی کا سینہ کھول دیتا ہے، اور اسے علوم کا گنجینہ بنا دیتا ہے، ان کی زبان سے حکمت اُبلتی ہے، یہ سر آنکھوں پر، ہم ان کو اپنے سے ہزار درجہ افضل مانتے ہیں، ان کا سایہ پڑ جائے تو ہم سمجھیں کہ ہم آدمی بن جائیں گے، لیکن ''اقرا'' اپنی جگہ پر رہے گا، ان حضرات کو بھی ضرورت ہے کہ وہ مسئلہ پوچھیں، عالموں سے بڑے بڑے صاحب ادراک، صاحب کشف بھی نماز کا مسئلہ پوچھتے ہیں۔

یہ ''اِقْرَا'' کا سلسلہ ایسا ہے کہ نبیؐ امی سے شروع ہو کر آخری امتی امی تک (یعنی جو لفظاً بے پڑھا ہے) جاری رہے گا، کتنے ہی دنیا میں انقلابات آئیں سلطنتیں بدلیں، تہذیبیں بدل جائیں، اور انقلاب عظیم برپا ہو جائے، زبان بدل جائے، تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رہے گا۔

حفاظتِ قرآن کا مفہوم

اللہ تعالیٰ نے کسی زبان اور کسی کتاب کی حفاظت کی گارنٹی نہیں لی، قرآن کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے ذمہ لیا ہے، تو حفاظت کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ بس کتاب رہے، نہ کوئی اس کو سمجھے نہ سمجھائے، اس کے لئے سمجھنے سمجھانے والے بھی

ہونے چاہئیں، اور وہ کتاب الفاظ میں ہے، تو زبان بھی ہونی چاہئے، الفاظ بغیر زبان کے نہیں رہتے، اس لئے عربی زبان بھی رہے گی، کتنی زبانیں مٹ گئیں، لیکن شریعتِ الٰہی کی زبان عربی اپنی جگہ پر ہے، اور اس کا علم اپنی جگہ پر ہے، تو ہر جگہ کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے یہاں مقدور بھر دینی تعلیم کا انتظام کریں، ہر جگہ مسائل کے بتانے والے نہ صرف یہ کہ موجود ہوں، بلکہ ان کا سلسلہ جاری رہے، یہ بھی مسلمانوں کے ذمہ فرض ہے، مدارس کا سلسلہ ضروری ہے، یہ کوئی شوقیہ اور تفریحی کام نہیں ہے، یہ خالص دینی ضرورت ہے، میں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں، کہ مساجد کے بعد نمبر دو کی چیز یہی ہے، اور سچ پوچھئے تو مساجد کے پشت پناہ بھی یہی مدارس ہیں، اگر مدارس نہ ہوئے تو آپ کو امام کہاں سے ملیں گے، اور اگر ایسے امام مل گئے، جو بس نماز پڑھادیں تو جمعہ پڑھانے کے لئے اس سے زیادہ کچھ شرائط ہیں، اس کے کچھ اور احکام ہیں، پھر اس کے بعد مسائل کے لئے، آپ کہاں جائیں گے، مسجدوں ہی میں، تو جائیں گے امام صاحب سے پوچھنے، امام صاحب کو کوئی علم نہیں ہے، بس تھوڑی سی سورتیں یاد کرلیں، اور نماز پڑھانا آگیا تو یہ مدارس درحقیقت مساجد کے بھی محافظ ہیں، اور مساجد کو بھی غذا پہونچاتے ہیں۔

فضلائے مدارس کا فرض

میں نے آپ کے سامنے شروع میں آیت پڑھی تھی "وما کان المؤمنون لینفروا کافة" یہ تو نہیں ہو سکتا، یعنی ایک غیر ممکن سی چیز ہے، غیر طبعی چیز ہے کہ سب مسلمان سب کام چھوڑ چھاڑ کر دین سیکھنے کے لئے نکل جائیں، نہ دکان پر کوئی بیٹھنے والا، نہ کوئی خرید و فروخت کرنے والا، نہ کوئی ضرورت پوری کرنے والا، معلوم ہوا سارا شہر چلا گیا، مدرسہ کا طالب علم بن کر، یہ ہونے والی بات نہیں ہے،

اللہ تعالیٰ ایسی بات نہیں کہتا، نہ اس کا مکلف قرار دیتا ہے، نہ اس کا مطالبہ کرتا ہے، فرماتا ہے کہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ تمام مومنین، سب کے سب گھر چھوڑ کر باہر چلے جائیں "فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة" پھر ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ہر جماعت میں سے کچھ لوگ اس کے لئے تیار ہو جائیں کہ وہ دین سیکھیں "لیتفقهوا فی الدین" دین کی سمجھ حاصل کریں، یعنی وہ دین کے احکام و مسائل کا علم حاصل کریں "ولینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم" اور اتنا ہی نہیں کہ خود اپنی ہی ذات کے لئے سیکھ کر کے بیٹھ گئے، اپنا کام نکال لیا "ولینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم" جا کر کے اپنی اپنی بستیوں میں ہدایت کا کام کریں، وعظ و ارشاد کا کام کریں، اور ان کو خطرات سے، مہلکات سے بچائیں، شرک کے مہلکات سے، کفر کے مہلکات سے، ان عقائد سے، ان رسوم سے، ان اعمال سے کہ جن سے آدمی بالکل اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، اور بعض اوقات وہ اسلام کی سرحد پار کر جاتا ہے، اور مسلمانوں میں اس کا شمار نہیں رہتا، بعض چیزوں سے ایمان چلا جاتا ہے، بالکل آدمی نے گویا ارتداد اختیار کر لیا "لینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم" عالم ہی بتا سکتا ہے، مسلمانوں کا کوئی بہت بڑا شہر ہو، تجارتی مرکز بھی ہو، کھاتے پیتے مسلمان رہتے ہوں، ایک مدرسہ بھی وہاں نہ ہو، دین کے موٹے موٹے احکام سکھانے کے لئے، اور قرآن مجید پڑھانے کے لئے، تو پورا شہر گنہگار ہوگا، بس یہی فرض کفایہ کے معنی ہوتے ہیں، پورا شہر خطرہ میں ہے، اور خدا کے یہاں سوال ہو سکتا ہے کہ تمہیں توفیق نہیں ہوئی کہ اپنے اتنے بڑے شہر میں مدرسہ قائم کرو، یہ بات ایسی نہیں جیسے تہجد پڑھنا، بہت سے لوگ سمجھتے ہیں، کہ تہجد فرض تو ہے نہیں، اللہ توفیق دے کوئی پڑھے تو بڑی اچھی بات ہے، ایسے ہی ان لوگوں نے مدرسہ قائم کر دیا ہے، گویا

تہجد پڑھ لی، یا کوئی خیرات کردی، یہ بنیادی کام ہے، یہ آپ کے لئے شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے، کہ آپ اپنے یہاں بقدر ضرورت کم سے کم دینی تعلیم کا انتظام کریں، آپ کے شہر میں ایسے لوگ ہوں جو وقت پر مسئلہ بتا سکیں، اور مسلمانوں کو کوئی خطرہ پیش آجائے، حلال و حرام، کفر و ایمان کا کوئی مسئلہ آجائے تو اس میں وہ رہنمائی کر سکیں، بتا سکیں کہ یہاں سے یہاں تک تو اسلام ہے، اس کے بعد کفر ہے، اور اگر تم سمجھنا چاہتے ہو، تو ہم تمھیں بتاتے ہیں "قد تبین الرشد من الغی فمن یکفر بالطاغوت ویؤمن باللہ فقد استمسك بالعروة الوثقیٰ" (البقرہ. ۲۵۶) یہ رشد ہے، اور یہ غی ہے، یہ اسلام ہے، اور یہ جاہلیت ہے، یہ بتا سکیں، اس کے بعد کرنا نہ کرنا آپ کا کام ہے۔

عوام کی ذمہ داری

بنیاد رکھنے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم نے بنیاد رکھدی، ہماری ایک ذمہ داری ہو گئی، آپ کی کوئی ذمہ داری نہیں، یہ بنیاد تو ہم آپ کی طرف سے رکھیں گے، گویا آپ کے ہاتھوں سے، آپ سب تو ہاتھ نہیں لگا سکتے، تو ہم آپ کی طرف سے آپ کی نیابت کریں گے، خدمت ہم کریں گے کہ وہ پتھر رکھدیں، لیکن آپ کا کام ختم نہیں ہوتا بلکہ سچ پوچھئے تو اس سے شروع ہوتا ہے، اب آپ کی ذمہ داری ہے کہ اس مدرسہ کو ترقی دیں، باقی مشورہ کا معاملہ ہے، استادوں کا مسئلہ ہے، کتابوں کا مسئلہ ہے، نصاب کا مسئلہ ہے، کبھی جلسوں میں آنے جانے کا مسئلہ ہے اس کے لئے ہم حاضر ہیں، آپ کو شکر گذار ہونا چاہئے کہ ایک بہت بڑی اجتماعی معصیت سے، ایک قومی اور ملی کوتاہی سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بال بال بچالیا، اگر یہ مدرسہ نہ ہوتا تو خدا کے یہاں پرسش ہوتی۔

سرکاری اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کے لئے دینی تعلیم کا انتظام

اسی طریقہ سے یہ بھی آپ یاد رکھیں کہ بچوں کو خواہ وہ اس مدرسہ میں نہ پڑھتے ہوں، اسکولوں میں پڑھتے ہوں، ان کی بقدر ضرورت دینی تعلیم کا انتظام آپ کے ذمہ فرض ہے "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا قُوْا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا (التحریم ۶) اے ایمان والو! اپنی جانوں کو اور اپنے گھر والوں کو جو تمھارے ماتحت ہیں، تمھارے ذمہ ہیں، ان سب کو آگ سے بچاؤ، یہ آپ کا فرض ہے، آپ ان کے لئے صبح شام کوئی انتظام کریں، کوئی ٹیوٹر TUTOR رکھیں، کسی مولوی صاحب کی خدمات حاصل کریں، بہر حال ان کے دین وایمان کی حفاظت کے لئے آپ کو کچھ سامان کرنا چاہئے، ایسے ہی کچھ چیزیں اور ہیں، مثلاً اس ملک میں، موجودہ دور میں، اور اس جمہوری ملک میں، اور ایک ایسے ملک میں جہاں ہم اکثریت میں نہیں ہیں، جہاں بہت سی تحریکیں ہیں، جہاں تبدیلیاں جلدی جلدی آتی ہیں، بہت سے چیلنج سامنے آتے ہیں، اس ملک میں کس طرح ہم اپنے دین کو بھی بچا سکتے ہیں، اور اپنی عزت کو بھی بچا سکتے ہیں، اور اپنی جانوں کو بھی بچا سکتے ہیں، اس کے لئے کئی چیزیں ایسی ہیں، جن کو آپ کو اختیار کرنا ہوگا، اور ان پر عمل کرنا ہوگا، لیکن اس وقت خالص دینی تعلیم کے تعلق سے کہتا ہوں کہ اس مدرسہ کو ترقی دینا، اس کو تکمیل کی منزل تک پہونچانا، اس سکے منصوبہ کو پورا کرنا، اور اس کو اس قابل بنانا کہ یہ آپ کے پورے جوار کا، اس پورے نواح کا ایک مرکزی مدرسہ بن جائے، یہ آپ کی ذمہ داری ہے،

اسی طریقہ سے اپنے بچوں کو اردو سکھانا، اور دینیات کی تعلیم دینا، اور سیرت اور صحابہ کرامؓ، اور دینی شخصیتوں سے واقف کرانا، اور کفر وایمان کا فرق، اور توحید وشرک کا فرق بتانا ضروری ہے۔

اسی طریقہ سے جو بالغ حضرات ہیں، ان کو اپنے دین کے لئے بھی، اور دینی جذبات کو ترقی دینے کے لئے بھی، اور دینی عزم پیدا کرنے کے لئے بھی، تبلیغی جماعت سے تعلق رکھنا اور ان کے اجتماعات میں شریک ہونا اور اس کو وقت دینا، دینی کتابیں پڑھانا، یہ سب بہت ضروری ہے، ورنہ ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے، بلکہ ایسے دور میں جس میں خدا نے ہمیں پیدا کیا ہے، نظر چوکی، آنکھ جھپکی اور آدمی مارا گیا، ہر وقت چوکنا رہنے کی ضرورت ہے، اور اس میں بہت وسیع نظر رکھنے کی ضرورت ہے، اور گرد و پیش کے حالات کا پورا جائزہ لینے کی ضرورت ہے، زندگی کے دھارے سے الگ ہونا خطرناک ہے، اگر مسلمان ماحول سے کٹ گئے، اور اپنے ماحول میں رہنے اور اپنی خیالی دنیا میں بسنے لگے، اور کہنے لگے کہ جو کچھ ہوتا ہے ہونے دیجئے ہم تو نماز، روزہ کرتے ہیں، اس طرح آپ اس ملک میں نہیں رہ سکتے، اس ملک میں ہر وقت حالات کو دیکھتے رہیں، اور اپنے مخلص رہنماؤں کی باتوں پر دھیان دینا ہے، جن کو صرف اس سے دلچسپی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جس انعام سے سرفراز فرمایا ہے اور جو امانت ہمارے سپرد کی وہ ہم محفوظ رکھیں، اور اس کو لے کر ہم دنیا سے جائیں، اور سرخ رو ہوں، جن کو صرف اس بات سے دلچسپی ہے، ان کے مشوروں کو آپ مانیں اور غور سے سنیں، اس ملک میں ہمیشہ اپنی آنکھ کھلی رکھیں، اور دیکھتے رہیں کیا ہو رہا ہے، کیا چیز ایسی پیدا ہو رہی ہے کہ جس سے ہم کو بھی، اور اگر ہم رہ بھی گئے تو ہماری آئندہ نسلوں کو مسلمان رہنا مشکل ہو جائے، اس کا برابر جائزہ لیتے رہنا چاہئے۔

ان الفاظ پر میں (اپنی باتیں) ختم کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.

اسلامی مزاج وماحول کی تشکیل و حفاظت میں حدیث کا بنیادی کردار

۱۳ دسمبر ۱۹۸۱ء کی شب میں رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ نے ایک کانفرنس کا انعقاد کیا تھا۔ جس میں مفکرِ اسلام نے یہ مقالہ عربی میں پیش کیا تھا۔ اس موقع پر متعدد علمائے مکہ مکرمہ وجامعہ ملک عبدالعزیز کے اساتذہ اور اہلِ علم واہلِ ذوق حجاج کی ایک معتدبہ جماعت موجود تھی۔ اسی مقالہ کا اردو ترجمہ افادہ اور استفادہ کے پیش نظر کتاب میں شامل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی مزاج وماحول کی تشکیل وحفاظت میں حدیث کا بنیادی کردار

اَلحَمْدُلله کَفیٰ وَسَلَام عَلیٰ عِبَادِہِ الَّذِینَ اصطفیٰ!

بعثتِ محمدی کے مقاصد اور شعبہ ہائے چہار گانہ

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت و تعلیم کے مقاصد و نتائج جہاں قرآن مجید میں بیان کئے گئے ہیں، صراحۃ ان چار چیزوں کا تذکرہ کیا گیا ہے (۱) تلاوت (۲) تعلیم کتاب (۳) تعلیم حکمت (۴) تزکیۂ نفس۔

هُوالذیٰ بَعَثَ فِی الامیینَ رَسُولاًمنهمْ یَتلوُا عَلیهِمْ ایٰتهٖ وَیُزَکیهِم وَیُعلِّمُهُمُ الکتَابَ وَالحِکمَةَ وَاِنْ کَانُوا مِنْ قَبلُ لَفِی ضَلالٍ مُبینٍ.(سورۃ الجمعۃ.۲)

وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول انھیں میں سے مبعوث فرمایا، جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے، اور انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے، اور بیشک وہ اس سے پہلے صریح گمراہی میں تھے۔

كَمَا اَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِنكُمْ يَتلُوا عَلَيكُمْ اٰيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الكِتَابَ وَالحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَالَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ. (سورۃ البقرۃ۔۱۵۱)

جیسا کہ ہم نے تم میں ایک رسول تم ہی میں سے بھیجا جو تم پر ہماری آیتیں پڑھتا ہے اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب اور دانائی سکھاتا ہے، اور تمہیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

درحقیقت بعثت محمدی ان چاروں شعبوں پر مشتمل تھی، محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جس طرح دنیا کو نیا آسمانی صحیفہ عطا کیا، نیا علم و حکمت عطا کیا، اسی طرح نئے اخلاق، نئے جذبات و کیفیات، نیا یقین و ایمان، نیا ذوق، نئی بلند نظری، نیا جذبۂ ایثار، نیا شوقِ آخرت، نیا جذبۂ زہد و قناعت، دنیا کی متاعِ حقیر اور دولتِ فانی کی تحقیر، نئی محبت و الفت، حسن سلوک و ہمدردی، برّ و مواسات، مکارم اخلاق، اسی طرح سے نیا ذوق عبادت، خوف و خشیت، توبہ و انابت، دعا و تضرع کی دولت عطا فرمائی، اور انھیں خصوصیتوں کی بنیاد پر وہ نیا اسلامی معاشرہ اور دینی ماحول قائم ہوا، جس کو **"عہدِ رسالت"** اور **"عہدِ صحابہؓ"** کے لفظ سے عام طور پر تعبیر کیا جاتا ہے، صحابہ کرامؓ ان مقاصد و نتائجِ بعثت کے کامل ترین نمائندہ اور بہترین نمونہ تھے، اگر ان شعبہائے نبوت کو عام زندگی میں جلوہ گر دیکھنا ہو تو صحابۂ کرامؓ کی جماعت کو دیکھ لیا جائے۔

وہ عناصر وعوامل جنھوں نے صحیح اسلامی مزاج وماحول کی تشکیل کی

یوں تو آنحضرت ﷺ کی بعثت و رسالت و تعلیم ان تمام سعادتوں کا سرچشمہ تھی، اور اس سے یہ پوری زندگی اور قرن اول کا اسلامی معاشرہ وجود میں آیا،

لیکن اگر اس کے طریق عمل کی تفصیل اور اس کے ذرائع ووسائل کی تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس محیر العقول انقلاب کا ذریعہ اور اس نئے معاشرہ اور نئی امت کی تشکیل کے عناصر وارکان یہ تین چیزیں تھیں۔

۱۔ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی، آپ کی زندگی، سیرت واخلاق۔

۲۔ قرآن مجید۔

۳۔ آپ کے ارشادات وہدایات، مواعظ ونصائح اور تعلیم وتلقین۔

اگر غور کیا جائیگا تو معلوم ہوگا کہ بعثت نبوی کے مقاصد ونتائج کے کامل ظہور میں اور جدید امت کی تعمیر وتشکیل میں ان تینوں عناصر وارکان کا دخل ہے، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ان تینوں کے بغیر ایک مکمل معاشرہ، مکمل زندگی، اور ایک ایسی ہیئتِ اجتماعی جس میں عقائد، اعمال، اخلاق، جذبات، اذواق، رجحانات، تعلقات، سب ہی ہوں، وجود میں نہیں آسکتی، زندگی کے لئے زندگی شرط ہے، یہاں دئے سے دیا جلتا ہے، صحابہؓ کرام اور ان کے صحیح جانشینوں کی زندگی میں ہمیں عقائد واعمال کے ساتھ جو خالص اسلامی اخلاق، اور اس سب کے ساتھ جو اعلیٰ اذواق اور گہرے دینی جذبات اور دینی کیفیات نظر آتی ہیں، وہ تنہا تلاوتِ کتاب کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس کامل ترین، موثر ترین، محبوب ترین زندگی کا بھی اثر ہے، جو شب وروز ان کے سامنے رہتی تھی، اس سیرت واخلاق کا بھی نتیجہ ہے، جو ان کی آنکھوں کے سامنے تھے، اور ان مجالس اور صحبتوں کا بھی فیض ہے، اور ان ارشادات ونصائح وتلقین کا بھی جس سے وہ حیات طیبہ میں برابر مستفید ہوتے تھے، اس سب کے مجموعہ سے اسلام کا وہ مزاجِ خاص وجود میں آیا جس میں صرف قواعد وضوابط اور ان کی قانونی پابندی نہ تھی، بلکہ ان پر عمل کرنے کے محرکات وترغیبات اور عمل کی

صحیح کیفیات اور روح بھی تھی، حدود کی پابندی اور حقوق کی ادائی کے ساتھ لطیف احساسات اور مکارم اخلاق کے دقائق بھی تھے۔

صحابۂ کرامؓ کی اسلامی زندگی میں ذوق، مشاہدہ اور صحبت کا حصہ

صحابۂ کرامؓ نے قرآن مجید سے "اقامۃ صلوٰۃ" کا حکم پایا تھا اور "الذین ھم فی صلاتھم خاشعون". (المومنون) کی تعریف بھی سنی تھی، مگر انھوں نے اس کی صحیح کیفیت اسی وقت معلوم کی جب آپ کے ساتھ نمازیں پڑھیں، اور آپ کے رکوع و سجود کی کیفیت دیکھی، جس کو انھوں نے "نسمع له ازیزا کأزیز المرجل من البکاء"۔(ابوداؤد) (ہم آپ کے سینہ کی آواز فرط گریہ سے اس طرح سنتے تھے، جیسے ہانڈی میں ابال آتا ہے) کے لفظوں سے تعبیر کیا ہے، انھوں نے قرآن مجید سے سمجھا تھا کہ نماز مومن کا ایک محبوب فعل ہے لیکن جب تک انہوں نے زبان نبوی سے "وجعل قرۃ عینی فی الصلاۃ" (بخاری ومسلم) (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے) اور بے قراری اور انتہائے شوق واضطراب کے ساتھ "یا بلال اقم الصلاۃ ،ارحنابھا" (بلال نماز کی اقامت کہہ کر مجھے آرام پہونچاؤ) نہیں سنا، ان کو نماز کے ساتھ اس عشق وشغف کا اندازہ نہیں ہوا، اسی طرح جب تک انھوں نے خاصان امت کے سلسلہ میں "ورجل قلبه معلق فی المساجد" (ان کا دل مسجد میں اٹکا رہتا ہے، مسجد سے نکل کر جب تک دوبارہ مسجد نہیں آتے ان کو چین نہیں آتا) کے الفاظ نہیں سنے، ان کو مسجد اور قلب مومن کا باہمی تعلق معلوم نہیں ہوسکا، انھوں نے قرآن مجید میں بار بار دعا کی ترغیب دیکھی تھی، دعا نہ کرنے والوں پر عتاب بھی سنا تھا، اور تضرع وابتہال (گریہ

وزاری اور الحاح واصرار) کے الفاظ و مفہوم سے بھی وہ آشنا تھے، لیکن اس کی حقیقت انھوں نے اس وقت جانی جب انھوں نے میدانِ بدر میں آپ کو خاک پر سر رکھے یہ الفاظ کہتے سنا کہ "اللهم انشدك عهدك ووعدك اللهم ان شئت لم تعبد"۔(صحیح بخاری ، کتاب المغازی.) (اے اللہ میں تجھے تیرے عہد اور وعدہ کا واسطہ دیتا ہوں، اے اللہ اگر تو چاہے۔اس مٹھی بھر جماعت کو ہلاک کرنا۔ تو تیری عبادت نہ ہو) اور بے قراری کی وہ کیفیت دیکھی جو ابو بکرؓ سے نہ دیکھی جا سکی یہاں تک کہ انھوں نے عرض کیا "حسبك" (یارسول اللہ کافی ہے) ان کو معلوم تھا کہ دعا کی روح، بندگی اور اپنی عجز و درماندگی کا اظہار ہے، اور جس دعا میں یہ جوہر جس قدر زیادہ ہو، اسی قدر وہ دعا قیمتی ہے، لیکن بندگی اور عجز و درماندگی کی حقیقت ان کو جب معلوم ہوئی جب انھوں نے عرفات میں آپ کو یہ کہتے سنا:۔

اللهم انك تسمع كلامي وترى مكاني وتعلم سري وعلانيتي ،لايخفى عليك شئى من امري ، وأنا البائس الفقير المستغيث المستجير، الوجل المشفق، المقر المعترف بذنبي ،أسألك مسألة المسكين ،وابتهل إليك ابتهال المذنب الذليل ،وأدعوك دعاء الخائف الضرير،ودعاء من خضعت لك رقبته، وفاضت لك عبرته وذل لك جسمه ورغم لك أنفه اللهم لا تجعلني بدعائك شقيا وكن لي رؤفا رحيما، يا خير المسئولين وياخير المعطين. (كنز الاعمال عن ابن عباسؓ) اے اللہ! تو میری بات کو سنتا ہے، اور میری جگہ کو دیکھتا ہے، اور میرے پوشیدہ اور ظاہر کو جانتا ہے، تجھ سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی، میں مصیبت زدہ ہوں، محتاج ہوں، فریادی ہوں، پناہ جو ہوں، پریشان ہوں، ہراساں ہوں، اپنے گناہوں کا اقرار کرنے والا

ہوں ،اعتراف کرنے والا ہوں، تیرے آگے سوال کرتا ہوں ،جیسے بیکس سوال کرتے ہیں، تیرے آگے گڑگڑاتا ہوں، جیسے گنہگار وذلیل وخوار گڑگڑاتا ہے ،اور تجھ سے طلب کرتا ہوں جیسے خوفزدہ ، آفت رسیدہ طلب کرتا ہے ،اور جیسے وہ شخص طلب کرتا ہے جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہو ،اور اس کے آنسو بہہ رہے ہوں ،اور تن بدن سے وہ تیرے آگے فروتنی کئے ہوئے ہو ،اور اپنی ناک تیرے سامنے رگڑ رہا ہو ،اے اللہ ! تو مجھے اپنے سے دعا مانگنے میں ناکام نہ رکھ ،اور میرے حق میں بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہو جا، اے سب مانگے جانے والوں سے بہتر ،اے سب دینے والوں سے اچھے۔!

قرآنی اخلاق

قرآن کے مخاطبین اولین نے قرآن مجید میں دنیا کی بے حقیقتی وبے ثباتی اور آخرت کی اہمیت اور پائیداری کا ذکر پڑھا تھا،اور "**وما هذه الحيوٰة الدنيا الا لهو ولعب وان الدارالآخرة لهى الحيوان**" (الروم. ٦٤)(اور دنیا کی یہ زندگی محض کھیل تماشہ ہے ،اور آخرت کا گھر ہی اصل زندگی ہے) کے الفاظ ان کو یاد تھے، مگر اس کی حقیقت اور عملی تفسیر ان کو آپ کی زندگی ہی سے معلوم ہوئی،اور آپ کے طرز زندگی اور گھر کے نقشہ کو دیکھ کر ہی وہ سمجھے کہ آخرت کو اصل زندگی سمجھنے کا کیا مطلب ہوتا ہے ،اور آخرت کو اصل زندگی سمجھنے والوں اور "**اللهم ان العيش ،عيش الأخرة**" (**صحيح بخارى كتاب المغازى**) پر ایمان رکھنے والوں کی خانگی زندگی اور معیشت کیا ہوتی ہے ،اس عملی نقشہ اور اجمالی ترغیب کے ساتھ جب ان کے سامنے ارشاداتِ نبوی میں جہنم کے شدائد ومصائب اور جنت کے انعامات ولذائذ کی تفصیل اور تصویر آتی تو ان کے اندر خوف

اور شوق کی ملی جلی کیفیت پیدا ہوتی، اور ان دونوں کا نقشہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہر وقت کھنچا رہتا۔

اسی طرح وہ رحمت، تواضع، خلق، رفق جیسے اخلاق و تعلیمات کے مفہوم سے آشنا تھے، صاحبِ زبان ﷺ تھے، اور قرآن مجید میں صاحبِ نظر بھی تھے، لیکن ان الفاظ کی وسعت، عملی زندگی میں ان کی تطبیق، نیز صحیح عمل، ان کو صرف اس وقت معلوم ہوا، جب انھوں نے آنحضرت ﷺ کا کمزوروں، عورتوں، بچوں، یتیموں، غریبوں، بوڑھوں اور اپنے عام رفقاء واصحاب اہلِ خانہ اور خدام کے ساتھ برتاؤ دیکھا، اور آپ کی اس بارے میں ہدایات، وصیتیں، اور ارشادات سنے، ان کو عامۃ المسلمین کے حقوق کے ادا کرنے کی اجمالی ہدایت قرآن سے مل چکی تھی، مگر اس کی بہت سی صورتیں (مثلاً عیادت مریض، اتباع جنائز، تشمیت عاطس وغیرہ وغیرہ) ایسی تھیں جو شاید لاکھوں انسانوں کے ذہن میں خود نہ آتیں، اور اگر آتیں تو ان کی اہمیت نہ معلوم ہوتی، اسی طرح والدین واہل حقوق کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم قرآن مجید میں پورے شد ومد کے ساتھ ہے مگر کتنے معلمین اخلاق ہیں، جن کا ذہن والدین کے ساتھ حسن سلوک وادائے حقوق کے اس رفیع وبدیع مقام تک پہونچتا جس کا اظہار حدیثِ نبوی "ان من ابر البر صلة الرجل أهل ودأبيه بعد ان يوتى" (صحيح مسلم) (فرزند کے حسن سلوک ووفاداری کا بہترین درجہ یہ ہے کہ وہ اپنے والد کے انتقال کے بعد ان کے دوستوں اور اہل بیت کے ساتھ سلوک کرے) اور کتنے ذہین ہیں جو وفاداری اور شرافت کے اس مقام بلند تک پہونچ سکتے، جس کا اظہار اس روایت سے ہوتا ہے "وربما ذبح الشاة ثم يقطعها أعضاءً ثم يبعثها في صدائق خديجة" (بخاری، مسلم) (اور بسا اوقات ایسا ہوتا

کہ آپ کے یہاں بکری ذبح ہوتی تو آپ اس کے پارچے الگ الگ کراتے، پھر وہ ٹکڑے اپنی مرحومہ بیوی خدیجہؓ سے میل محبت دکھنے والیوں کے یہاں بھیجتے

حدیث کے شعبۂ معاشرت واخلاق کی یہ دو تین مثالیں ہیں، جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حدیث زندگی کے مختلف شعبوں میں کیسی رہنمائی کرتی ہے، اور کیسا نیا علم عطا کرتی ہے، اور وہ انسانیت کے لئے کیسا بیش بہا خزانہ ہے۔

احکام پر بسہولت عمل کرنے کے لئے مناسب ماحول اور سازگار فضا کی ضرورت

دوسری طرف مذاہب وادیان کی تاریخ کا یہ طویل و مسلسل تجربہ ہے کہ محض ایک اجمالی اور قانونی حکم اور ضابطہ کسی عمل کو اپنی صحیح روح اور کیفیات کے ساتھ وجود میں لانے کے لئے کافی نہیں ہوتا اور وہ فضا پیدا نہیں کرتا جو اس عمل کو موثر اور منتج بنانے کے لئے درکار ہے، مثال کے طور پر اقامت صلوٰۃ کا اجمالی حکم وہ ذہنیت، ماحول، اور فضا نہیں پیدا کر سکتا جو نماز کی روح و جسم کی حفاظت، اس کی پابندی اور اس کے صحیح روحانی، ذہنی، قلبی، اجتماعی اور اخلاقی نتائج واثرات کے بروئے کار آنے کے لئے معاون ومددگار ہے، اس کے لئے ان مبادی ومقدمات، آداب وہدایات کی ضرورت ہے جو اس عمل کو مہتم بالشان، وقیع ومؤثر بنائیں، اسی بنا پر نماز کے لئے خود قرآن مجید میں وضو، طہارت، تشعور وتعقل، خشوع وخضوع، سکوت وقنوت اور جماعت کا حکم دیا گیا ہے، لیکن اہل نظر سے مخفی نہیں کہ اسمیں ضروری وقابل عمل حد تک جس قدر آداب وفضائل اور خارجی انتظامات کا اضافہ ہوگا، وہ فضا اور ماحول تیار ہوگا جس میں نماز اپنے پورے ثمرات اور روحانی واجتماعی واخلاقی اثرات ظاہر کرے گی، اور حدیث وسیرت کا مطالعہ کرنے والے، اور ان پر

نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے عمل اور آپ کے ارشادات وہدایات نے اس میں وہ معقول اضافہ کیا ہے، جس سے نماز تزکیۂ نفس، تربیت اخلاق اور توجہ الی اللہ وانقطاع عن الخلق، نیز امت کی تعلیم وتربیت اور نظم ووحدت کا موثر ترین ذریعہ بن گئی ہے، مثلاً وضو کی نیت وفضیلت اور اس کا استحضار، مساجد کی طرف جانے اور اس کے راستے میں پڑنے والے قدموں کی فضیلت ومنصب اور اس کے احکام، امام کے اتباع کی تاکید، صفوں کی ترتیب اور صفوں میں کھڑے ہونے والے آدمیوں کی ترتیب، مساجد میں تعلیم وتعلم کے حلقوں کی فضیلت، ذکر کے حلقوں کی فضیلت، مسجد سے نکلنے کا ادب، اور اس کا ذکر وغیرہ وغیرہ، ظاہر ہے کہ ان فضائل، نیز ان آداب وہدایات کے علم وعمل سے نماز کتنی مہتم بالشان چیز اور تزکیہ واصلاح، تعلیم وتربیت اور انابت وتوجہ الی اللہ کا کیسا مؤثر ذریعہ بن جاتی ہے، پھر اس کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی نمازوں کی کیفیت، نوافل کے ذوق، قرآن مجید پڑھنے میں رقت ومحویت کے واقعات کا (جو احادیث میں اہتمام کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں) اضافہ کیجئے اس مجموعہ سے امت کی نماز جس مقام تک پہونچ جاتی ہے، اور اس کے لئے کیسا ذہنی اور روحانی ماحول تیار ہوتا ہے، صوم وزکوۃ وحج کو بھی اسی پر قیاس کرنا چاہئے، اور حدیث سے اس کے آداب وفضائل، معمولات نبوی اور واقعات زندگی کو جمع کر کے غور کرنا چاہئے، کہ اگر ان عبادات کو ان آداب وفضائل اور واقعات سے مجرد ومنقطع کر لیا جائے، اور ان کو اس ماحول سے جدا کر لیا جائے، جو حدیث ان کے لئے مہیا کرتی ہے، اور جو اب حدیث کی بنا پر ان کے ساتھ لازم ہو گیا ہے تو ان کی تاثیر کہاں تک باقی رہتی ہے، اور ان میں جذبات کو ابھارنے ذوق وشوق کو پیدا کرنے، استقامت عطا کرنے اور قلب ودماغ کو غذا اور جلا عطا کرنے

اور ایک ایسے نئے معاشرہ کی تعمیر کی (جس کے اندر عبادت و تقویٰ وانابت کی روح سرایت کئے ہوئے ہو) کہاں تک صلاحیت باقی رہ جاتی ہے۔

قدیم مذاہب نے کس طرح اپنے انبیاء کے صحیح احوال واقوال کو گم کردیا؟

درحقیقت رسول ﷺ کی حیات طیبہ اور ارشادات وہدایات (جن کے مجموعہ کا معروف نام حدیث وسنت ہے) دین کے لئے وہ فضا اور ماحول مہیا کرتے ہیں، جس میں دین کا پودہ سرسبز وبار آور ہوتا ہے، دین کسی خشک اخلاقی ضابطہ یا قانونی مجموعہ کا نام نہیں، وہ جذبات، واقعات اور عملی مثالوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، ان جذبات وواقعات، اور عملی مثالوں کا سب سے بہتر اور مستند مجموعہ وہ ہے، جو خود پیغمبر کی ذات سے متعلق اور اس کے حالاتِ زندگی سے ماخوذ ہو، یہودی اور عیسائی، نیز ایشیا کے دوسرے مذاہب اس لئے بہت جلد مفلوج ہو کر رہ گئے کہ ان کے پاس اپنے پیغمبروں کی زندگی کے مستند واقعات اور ایمان آفریں کلام کا مجموعہ محفوظ نہیں رہا تھا، اور ان مذاہب کو وہ ذہنی ماحول اور فضا میسر نہیں تھی، جس میں پیروانِ مذاہب دینی نشوونما اور روحانی بالیدگی حاصل کرتے، اور مادیت والحاد کے حملوں سے محفوظ رہتے، انھوں نے بالآخر اس کی ضرورت تسلیم کر کے اس خلا کو پیروانِ مذاہب وپیروان طریقت" کے واقعات وملفوظات سے پُر کیا، مگر اس "**خانہ پُری**" نے رفتہ رفتہ مذاہب کو بدعات ورسوم اور نئی نئی تفسیروں کا ایسا مجموعہ بنادیا، جس میں اصل مذہب کی تعلیم گم ہو کر رہ گئی، ان مذاہب واقوام کی اپنے پیغمبروں کی سیرت اور مستند واقعاتِ زندگی کے بارے میں بے بضاعتی وتہی دامنی اب ایک مسلمہ تاریخی حقیقت بن گئی ہے۔

خلا کو پُر کرنے کی کوشش اور بزرگوں کے "حکایات وملفوظات" کے مجموعے

اسی مقصد کے تحت تلمود (۱) کے صحیفے تیار ہوئے، اور یہودیوں کا اس کی تلاوت وشرح اور مطالعہ سے اس قدر اشتغال بڑھا کہ توراۃ کی حیثیت ثانوی رہ گئی، علمائے یہود کے ایسے اقوال بھی نقل کئے گئے ہیں، جو تلمود کو عہد قدیم کے صحیفوں پر ترجیح دیتے ہیں، تلمود کے ان صحیفوں میں طبعی طور پر اور بے بنیاد یہودی افکار اور خارجی اثرات قبول کرنے والے پست یہودی معاشرہ کے اثر سے بہت سے ایسے قصے کہانیاں داخل ہو گئیں، جن کا تعلق محض خیال آرائی یا خوش اعتقادی اور اوہام پرستی سے ہے، ان پر خدا کا یہ فرمان صادق آتا ہے "وماقدروا الله حق قدره" (حج. ٧٤) (اور انھوں نے خدا کی قدر جیسی جانی چاہئے تھی نہ جانی) عیسائیوں نے اپنے طور پر مختلف کتابیں تالیف کیں، اور عہد جدید کے صحیفوں میں ان کا اضافہ کر دیا، اضافہ شدہ کتابوں میں "**رسولوں کے اعمال**" "**پولس رسول کے خطوط**" "**پطرس کے خطوط**" اور "**یوحنا عارف کا مکاشفہ**" وغیرہ ہیں۔ (۲)

برہمن اور قدیم ہندو مذہب کے پیروؤں کا زیادہ تر شغف "گیتا" سے رہا جو شری کرشن جی کے ملفوظات واقوال پر مشتمل ہے، اسی طرح "رامائن" سے جو رام چندر جی کے تذکرہ اور حکایات کا مجموعہ ہے، نیز مہابھارت اور اس طرح کے جنگی قصوں اور شاہناموں سے رہا، یہی حال ایرانی مجوسیوں کا "اوستا" کی شرح "زندافیست" کے ساتھ ہے۔

یہ کتابیں ان مذاہب کے ماننے والوں اور ان قدیم مذاہب کو اپنے ابتدائی

مبلغین اور داعیوں کی تعلیمات، ان کی زندگی و کردار، ان کے حقیقی رجحانات سے واقف کرانے، ان کی زندگی اپنانے، ان کے اسوہ پر عمل کرنے اور ان کی دعوت وعقیدہ کی حفاظت کا جذبہ بیدار کرنے سے قاصر رہیں، بلکہ انھوں نے فائدہ کم نقصان زیادہ پہونچایا، اور یہی کتابیں ان قوموں کے دینی ذوق کے فساد، ان کی فطرت کے انحراف، اور ہر اس چیز کی (جو تخیل پر مبنی، حقیقت سے بہت دور اور فطرت سلیم سے ٹکرانے والی ہو) تقدیس و تعظیم و پرستش کی ذمہ دار ہیں، ان قوموں کے ادب وزبان، ان کے خیالات و تصورات، ان کے معاشرے اور خواہشات ورجحانات پر ان کتابوں کا گہرا اور دوررس اثر پڑا، اور اب بھی قائم ہے، ان کتابوں نے تدریجی طور پر ان مذاہب کو بدعتوں، خرافات، دوراز کار تاویلات، اور انتہا پسندانہ نت نئی شروح و تفسیرات کا ایسا معجون مرکب بنادیا جس میں ان مذاہب کی حقیقی تعلیمات اس طرح گم ہوگئیں جیسے سمندر میں سرکہ کا ایک قطرہ۔

انبیائے سابقینؑ کی سیرتوں اور حدیث وسیرت نبویؐ کا ایک سرسری موازنہ

خدا کی یہ مصلحت وحکمت، انبیائے سابقین کے سیر وحالات اور سیرت نبویؐ کے تقابل و موازنہ سے آشکارا ہوتی ہے، جب انسان اس سیرت اور دوسرے انبیاء کی سیرتوں کا تقابل اور موازنہ کرتا ہے، تو اسے وہ قدیم سیرتیں، امم سابقہ کے جہل وتغافل اور تاریخ کے خونی حوادث کی تاریکیوں میں گم نظر آتی ہیں، اور یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے، کہ انھوں نے خاص زمانہ میں ہدایت ورہنمائی کا فریضہ انجام دیا اور مشعل راہ کا کام کیا، لیکن ہمیشہ ان کے محفوظ رہنے اور قیامت تک کی نسلوں تک بے کم وکاست پہونچنے کی عملاً کوئی ضرورت نہ تھی۔

اس کے لئے ہمیں حضرت مسیحؑ کی سیرت کا مطالعہ ہی کافی ہے، حضرت مسیحؑ حضرت محمد ﷺ سے پہلے آخری نبی ہیں، اور ان کی حلقہ بگوش ایک ایسی امت ہے، جس کا علمی و تصنیفی شغف تمام دنیا پر روشن ہے، اسی کے ساتھ اس کی محبت و عقیدت اپنے پیغمبر سے غلو و مبالغہ کی حد تک پہونچی ہوئی ہے، اور اس نے ان کو بشریت کے دائرہ سے نکال کر الوہیت کے دائرہ میں داخل کر دیا ہے، لیکن وہ بھی دنیا کے سامنے اپنے نبی کے صرف ایسے مختصر اور ادھورے معلومات ہی پیش کر سکی، جو کسی طرح ایک مکمل انسانی زندگی کی تصویر نہیں بناتے، جسے انسان اپنی نجی زندگی میں سامنے رکھے، یا جس کی روشنی میں کوئی صالح معاشرہ وجود میں آسکے، ابھی کچھ دنوں پہلے تک مسیحی دنیا کا خیال تھا کہ "عہد جدید" یعنی انجیل، سیرت مسیحؑ کے آخری تین سال کے واقعات پر مشتمل ہے، لیکن اب محققین اور اس موضوع کے ماہرین اس نتیجہ تک پہونچے ہیں کہ انجیل میں حضرت مسیحؑ کے پچاس دنوں سے زیادہ کے واقعات و معلومات کا مواد نہیں۔

فاضل پادری ڈاکٹر چارلس انڈرسن اسکاٹ (CHARLES AN-DERSON SCOTT) "انسائکلوپیڈیا پرٹانیکا" میں اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں :۔

> "یسوع کی سیرت لکھنے کی کوشش ہی سے صاف صاف دستبردار ہو جانا چاہئے، اس کے لئے سامان ہی موجود نہیں ہے، یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ جتنے ایام زندگی کے متعلق کچھ معلومات موجود ہیں، ان کی تعداد پچاس سے زیادہ نہیں" (۳)

دوسرے انبیاء اور پہلے مذاہب کے رہنماؤں کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ ان کے واقعات اور نقوشِ حیات ماضی کے ملبے کے نیچے دفن ہو گئے ہیں،

اور ان کی وہ اہم کڑیاں (جن کے بغیر تاریخ مکمل ہی نہیں ہو سکتی، اور جن کے بغیر اتباع واقتداء کا کوئی قدم ہی نہیں اٹھایا جا سکتا) اس طرح گم ہیں کہ اب انھیں پانا ممکن نہیں، (۴) اور یہ بات حکمت الٰہیہ کے عین مطابق اور نظام عالم کے قوانین کے بالکل موافق معلوم ہوتی ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخی کرداروں کی (جو نمونہ ومثال اور آئیڈیل کا کام دیں) ایک محدود عمر ہوتی ہے، جس کے ختم ہو جانے پر ان اقدار کو نسل بہ نسل منتقل کرنے کی کوئی افادیت نہیں رہ جاتی، لیکن جب ان کی ضرورت باقی اور دائمی ہوتی ہے، تو وہ زمان ومکان کے انقلابات کے باوجود باقی رہتی ہیں، ان کا تسلسل قائم رہتا اور وہ سدا بہار وزندۂ جاوید بن جاتی ہیں، جن کو کبھی زوال نہیں ہوتا۔

اسلام کے آخری اور دائمی مذہب ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ یہ حادثہ اس کو پیش نہیں آیا، جس ذہنی وروحانی ماحول میں اور جن ذہنی کیفیات کے ساتھ صحابۂ کرامؓ نے زندگی گذاری، حدیث کے ذریعہ اس پورے ماحول کو قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا گیا، بعد کی نسلوں اور صدیوں کے ایک آدمی کے لئے بالکل ممکن ہے کہ حدیث کے ذریعہ وہ اپنے ماحول سے اپنا رشتہ منقطع کر کے دفعتاً اس ماحول میں پہونچ جائے، جہاں رسول ﷺ بنفس نفیس موجود ہیں، جہاں رسول ﷺ مصروفِ تکلم، اور صحابۂ کرامؓ گوش بر آواز ہیں، جہاں احکام کے ساتھ عمل کی شکلیں، اور عمل کی شکلوں کے ساتھ جذبات وکیفیات کے مناظر بھی نظر کے سامنے ہیں، جہاں اس کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایمان کس طرح کے اعمال واخلاق، اور یقین آخرت اور کس طرح کی زندگی پیدا کرتا ہے، یہ ایک دریچہ ہے، جس سے رسول ﷺ کی خانگی زندگی، آپ کے گھر کا نقشہ، آپ کے رات کے

معمولات، آپ کے گھر والوں کی معاشرت ومعیشت اپنی آنکھوں سے دیکھی جاسکتی ہے، آپ کے سجود کی کیفیت آنکھوں سے، اور آپ کی دعاومناجات کا زمزمہ کانوں سے سنا جاسکتا ہے، پھر جو آنکھیں آپ کی آنکھوں کو اشکبار اور قدم مبارک کو متورم دیکھیں، اور جو کان اس کثرتِ عبادت کی وجہ پوچھنے اور سوال کرنے پر یہ آواز سنیں کہ "افلاأکون عبدا شکورا" (بخاری، مسلم) (کیا میں خدا کا شکر گذار بندہ نہ ہوں؟) وہ غفلت کا کس طرح شکار ہوسکتے ہیں؟ جن آنکھوں نے کاشانۂ نبوت میں دو دو مہینے چولھا گرم ہوتے نہیں دیکھا، جنھوں نے پیٹ پر پتھر بندھا ہوا اور پشت مبارک پر چٹائی کے نشانات پڑے ہوئے دیکھے، جس نے سونے سے پہلے بیقراری کے ساتھ صدقہ کا بچا ہوا سونا راہ خدا میں خرچ ہوتے دیکھا، جس نے مرض وفات میں چراغ کا تیل پڑوسی کے گھر سے قرض آتے ہوئے دیکھا، اس پر دنیا کی حقیقت کیسے چھپ سکتی ہے، اور زہد کا جذبہ اس کے اندر کیسے ابھر نہیں سکتا؟ جس نے آپ کو اپنے گھر والوں کی خدمت، اپنے بچوں کے ساتھ محبت، اپنے خادموں کے ساتھ رعایت، اپنے رفقاء کے ساتھ عنایت، اور اپنے دشمنوں کے ساتھ تحمل فرماتے ہوئے دیکھا، وہ مکارم اخلاق اور انسانیت کاملہ کا درس اس در کو چھوڑ کر اور کہاں سے لینے جائے گا۔

پھر اس ماحول میں صرف کاشانۂ نبوت ہی کا دروازہ نہیں کھلا ہوا ہے، جس سے دیکھنے والوں کو یہ سب نظر آتا ہے، بلکہ صحابۂ کرامؓ کے گھروں کے دروازے بھی کھلے ہوئے ہیں، اور ان کے گھروں کی زندگی ومعاشرت، ان کے "دنوں کی تپش، ان کی شبوں کا گداز" ان کی بازاروں کی مصروفیت، اور مسجدوں کی فراغت، ان کی بے نفسی وللّٰہیت، اور ان پر نفس انسانی کے حملے، ان کا انقیاد کامل، اور ان کی

بشری لغزشیں سب عیاں ہیں، یہاں ابو طلحہ انصاریؓ کے ایثار کا واقعہ بھی آنکھوں کے سامنے گذرتا ہے جب انھوں نے بہانہ سے چراغ بجھا کر مہمانوں کو شکم سیر اور خود کو بھوکا رکھا، (۵) حضرت کعب بن مالکؓ کے غزوۂ تبوک سے بچھڑ جانے کا قصہ بھی سامنے آتا ہے، جس میں انھوں نے اپنی کوتاہی کا بے تکلف اقرار کیا ہے کہ وہ محض "آج کل" اور ذرائع سفر کے موجود ہونے کی بناء پر اطمینان کی وجہ سے غزوۂ تبوک میں رسول ﷺ اور صحابۂ کرامؓ کے ساتھ نہ جاسکے، پھر توبہ کی قبولیت اور اعلان عفو سے پہلے ان کی وفاداری اور استقامت کا جس طرح امتحان ہوا، اور ان کے قلب محبت آشنا پر جو گزری اس کی انھوں نے بے کم وکاست روداد سنائی۔ (بخاری)

اسی طرح ام المومنین عائشہ صدیقہؓ اپنی زندگی کا سب سے نازک، زہرہ گداز اور قیامت خیز واقعہ (واقعۂ افک) اپنی ذاتی وخاندانی صداقت وجرأت، اور عربی بلاغت وقدرت بیانی کے ساتھ سناتی ہیں جس میں لطیف وغیور نسوانی شعور واحساسات، ایمان واعتماد اور رضا وفا کی کیفیتیں بیک وقت اس طرح جھلک رہی ہیں کہ ادب وتاریخ میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے، اسی کے ساتھ ان کے والد ماجد ابوبکر صدیقؓ کے صبر وتحمل اور مطح بن اثاثہ کے بارے میں ایثار وقربانی کی وہ مثال ملتی ہے جس سے مکارم اخلاق کے دفتر خالی ہیں، (بخاری) اسی طرح حاطب بن ابی بلتعہ کی ایک بشری لغزش اور اجتہادی غلطی (جو فتح مکہ کے موقعہ پر پیش آئی تھی) احادیث صحیحہ کے اس دفتر میں چھپائی نہیں گئی کہ وہ بھی ایک زندہ انسانی معاشرہ کا پہلو، اور فطرت انسانی کا خاصہ ہے، جس سے سیکھنے والے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں، اسی کے ساتھ آنحضرت ﷺ کا بے پایاں عفو، سابقہ خدمات اسلامیہ کی قدر واعتراف، اور اپنے خدام وجاں نثاروں کی طرف سے مدافعت کا نمونہ بھی سامنے

آتا ہے، جو سیرت و دعوت دونوں کے صحیفوں میں نمایاں جگہ پانے کے قابل ہے، اور قائدین و مصلحین کے لئے چراغ راہ اور نشان منزل کا حکم رکھتا ہے، (۶) غرض یہ ایک ایسا طبعی و قدرتی ماحول ہے، جس میں زندگی اپنے پورے تنوعات و حقائق، اور انسانی فطرت اپنے تمام خصائص کے ساتھ موجود ہے، اور حدیث نے اس کا پورا عکس لے کر قیامت تک کے لئے دَورِ نبوی کو محفوظ کر دیا ہے۔

قرآن مجید کے ساتھ عہد نبوی کی اس تصویر کا باقی رہنا، اور نبوت کے کلام اور ماحول کا محفوظ رہنا، اسلام کا ایک اعجاز، اور اس کا ایسا امتیاز ہے، جس میں کوئی مذہب اور کوئی امت اس کی شریک و سہیم نہیں، ایک ایسا مذہب جس کو قیامت تک باقی رہنا، اور تمام آنے والی نسلوں کو عملی نمونہ، اور عمل کے جذبات و محرکات، اور قلب و دماغ کو غذا فراہم کرنا ہے، ماحول کے بغیر نہیں رہ سکتا، یہ ماحول حدیث کے ذریعہ محفوظ ہے، تدوین حدیث کی تاریخ پڑھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک اتفاقی امر، اور دَورِ متاخر کی کوئی "**جدت**" نہیں ہے، صحابہ کرامؓ کا عہد نبویؐ ہی میں کتابت حدیث کی طرف متوجہ ہونا اور بہت بڑی تعداد میں احادیث کا محفوظ کر لینا، پھر انھیں کے آخر دور میں تابعین کا تدوین و ترتیب کی طرف توجہ کرنا، پھر ایران و خراسان و ترکستان کے طالبین علم کے سمندر کا امنڈ آنا، اس کا جمع و حفظ حدیث سے عشق و شغف، ان کا غیر معمولی حافظہ، ان کا عزم و عالی ہمتی، پھر اسماء رجال و فنِ روایت کے مجتہدین کا پیدا ہونا، جن کو اس کا ملکۂ راسخہ، اور بصیرت کاملہ حاصل تھی، پھر ان کا انہماک و خود فراموشی، پھر امت کی حدیث کی طرف توجہ، اور اس کی عالم اسلام میں مقبولیت اور اشاعت (۷) یہ سب واقعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ جمع قرآن کی طرح اللہ تعالیٰ کو اس "صحیفۂ زندگی" کو بھی محفوظ کرنا

مقصود تھا۔

کتب حدیث وسیرت کی صحت واستناد اور ان کی جامعیت واحتواء

مولانا سید سلیمان ندویؒ اپنی بے نظیر کتاب ''خطباتِ مدراس'' میں لکھتے ہیں :

''جان ڈیون پورٹ صاحب نے ۱۸۷۰ء میں انگریزی میں سب سے زیادہ ہمدردانہ کتاب (APOLOGY (FOR MOHAMMAD & THE QURAN (محمد ﷺ) اور قرآن سے معذرت) لکھی ہے، اس کتاب کو وہ ان الفاظ سے شروع کرتے ہیں۔

''اس میں کچھ شبہ نہیں کہ تمام مقننین اور فاتحوں میں ایک بھی ایسا نہیں ہے، کہ جس کے وقائع عمری محمدؐ کے وقائع عمری سے زیادہ تر مفصل اور سچے ہوں۔''(۸)

ریورنڈ باسورتھ اسمتھ (BOSWORTH SMITH) فیلو آف ٹرینٹی کالج اوکسفورڈ نے ۱۸۷۴ء میں ''محمدؐ اینڈ محمڈنزم'' کے نام سے رائل انسیٹیٹیوشن آف گریٹ برٹین میں جو لکچر دیئے تھے، اور جو کتاب کی صورت میں چھپے ہیں، ان میں ریورنڈ موصوف نے نہایت خوبی سے کہا ہے :۔

''جو کچھ عام طور سے مذہب کی (ابتداء نامعلوم ہونے کی) نسبت صحیح ہے، وہی بدقسمتی سے ان تین مذہبوں

اور ان کے بانیوں کی نسبت بھی صحیح ہے، جن کو ہم کسی بہتر نام موجود نہ ہونے کے سبب سے تاریخی کہتے ہیں، ہم مذہب کے اولین اور ابتدائی کارکنوں کی نسبت بہت کم، اور ان کی نسبت جنھوں نے ان کی محنتوں میں بعد کو اپنی محنتیں ملائیں، شاید زیادہ جانتے ہیں، ہم زرتشت اور کنفیوشس کے متعلق اس سے کم جانتے ہیں، جو سولن اور سقراط کے متعلق جانتے ہیں، موسیٰ اور بودھ کے اس سے کم واقف ہیں، جو ہم ایمبر لیس (AM-BROSE) اور سیزر کے متعلق جانتے ہیں، ہم در حقیقت سچ کی زندگی کے ٹکڑے میں سے ٹکڑا جانتے ہیں، ان تیس برسوں کی حقیقت سے کون پردہ اٹھا سکتا ہے، جس نے تین سال کے لئے راستہ تیار کیا، جو کچھ ہم جانتے ہیں، اس نے دنیا کی ایک تہائی کو زندہ کیا ہے، اور شاید اور بہت زیادہ کرے، ایک "آئیڈیل لائف" جو بہت دور بھی ہے، اور قریب بھی، ممکن بھی ہے، اور ناممکن بھی، لیکن اس کا کتنا حصہ ہے، جو ہم جانتے ہی نہیں، ہم مسیح کی ماں، مسیح کی خانگی زندگی، ان کے ابتدائی احباب، ان کے ساتھ ان کے تعلقات، ان کے روحانی مشن کے تدریجی طلوع، یا یک بیک ظہور کی نسبت ہم کیا جانتے ہیں؟ ان کی نسبت کتنے سوالات ہم میں سے ہر ایک کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں جو ہمیشہ سوالات ہی رہیں گے۔

لیکن اسلام میں ہر چیز ممتاز ہے، یہاں دھندلاپن اور

راز نہیں ہے، ہم تاریخ رکھتے ہیں، ہم محمدؐ کے متعلق اس قدر جانتے ہیں، جس قدر لیوتھر اور ملٹن کے متعلق جانتے ہیں، میتھالوجی، فرضی افسانے، اور مافوق الفطرت، واقعات ابتدائی عرب مصنفین میں نہیں، یا اگر ہیں تو وہ آسانی سے تاریخی واقعات سے الگ کئے جاسکتے ہیں، کوئی شخص یہاں نہ خود کو دھوکا دے سکتا ہے، اور نہ دوسرے کو، یہاں پورے دن کو روشنی ہے جو ہر چیز پر پڑ رہی ہے، اور ہر ایک تک ہو پہنچ سکتی ہے۔"(۹)

پھر صرف صحت واستناد کا معاملہ نہیں، کتب حدیث اتنی واضح، مفصل اور دقیق معلومات پر مشتمل ہیں، جن سے زیادہ کا تصور نہ انسانی عقل کر سکتی ہے، اور نہ انسانی تاریخ کے عظیم افراد کے (جس میں انبیاء ومرسلین بھی شامل ہیں) حالات وواقعات کے محفوظ رکھنے کی کوششوں کا طویل تجربہ اس کی تائید کرتا ہے، سیرت کی کتابوں سے قطع نظر صرف حدیث وشمائل کی کتابوں پر ایک سرسری نظر ڈال لینا ہمارے مدعا کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے، قارئین صرف انہی احادیث کا جائزہ لے کر دیکھیں جو کتب صحاح میں حجۃ الوداع کے متعلق آئی ہیں، ان کو ان میں ایسی جزئیات وتفصیلات ملیں گی، جن کی کسی قریبی شخصیت کے حالات وواقعات کے دفتر سے بھی توقع مشکل ہے، ان کو ان روایات سے معلوم ہوگا کہ کیسے رسول اللہ ﷺ نے احرام کے وقت خوشبو لگائی، اور کس نے لگائی، اور یہ کس قسم کی خوشبو تھی، اور کس طرح آپ نے ﷺ اپنے قربانی کے جانور کو علامت کے طور پر کچوکہ لگایا، (۱۰) اس کی تفصیل اور جگہ کی تعیین کا بھی علم ہوگا کہ آیا کوہان کے دائیں جانب

کچوکہ لگایا یا بائیں جانب، اور پھر کیسے خون پونچھا، اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ کیسے آپ نے پچھنا لگوایا (۱۱) اور جسم مبارک کے کس حصہ پر لگوایا، اور کہاں اور کس حصہ پر لگوایا اور کہاں اور اور کس جگہ پر لگوایا، مدینہ اور مکہ کے درمیان کہاں کہاں آپ اترے، سفر میں کتنے دن لگے، یہ ساری معلومات اور اس طرح کی تمام تفصیلات وجزئیات آپ کو حاصل ہو سکتی ہیں، حالانکہ اس زمانہ میں نہ بیاض رکھنے کا رواج تھا، نہ روزناموں اور ڈائری لکھنے کا معمول، لیکن کوئی بھی معمولی سے معمولی واقعہ ایسا نہیں جو راویوں سے رہ گیا ہو، یہاں تک کہ آپ کو اس سانپ کا قصہ بھی معلوم ہوگا جو اس بھرے مجمع میں نکلا اور بچ کر نکل گیا، مارا نہ جاسکا، آپ کو اس کا بھی علم ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھ اس سفر میں سواری پر کس کو بٹھایا، اور اپنا ردیف بنایا، (۱۲) حلاق کا کیا نام تھا، آپ نے موئے مبارک کس طرح تقسیم فرمائے، کس کو دائیں حصے کے عنایت فرمائے، اور کس کو بائیں حصہ کے، اس کے علاوہ عرفات ومنی میں رسول اللہ ﷺ کے خطبات وفرمودات اور وصیتیں جو بے کم وکاست محفوظ کی گئیں، اور آپ کے اس حکم کے مطابق "الافلیبلغ الشاهد الغائب فرب مبلغ أوعى من سامع" (۱۳) ان لوگوں تک بھی پہونچ گئیں، جو اس موقع پر موجود نہ تھے، اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔

حدیث مسلمانوں کی مستند زندگی کے معیار ومیزان کی حیثیت سے

حدیث نبویؐ ایک ایسی صحیح میزان ہے، جس میں ہر دور کے مصلحین ومجددین اس امت کے اعمال وعقائد، رجحاناتِ وخیالات کو تول سکتے ہیں، اور امت کے طویل تاریخی وعالمی سفر میں پیش آنے والے تغیرات وانحرافات سے واقف ہو

سکتے ہیں، اخلاق واعمال میں کامل اعتدال وتوازن اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک قرآن وحدیث کو بیک وقت سامنے نہ رکھا جائے، اگر حدیث نبویؐ کا وہ ذخیرہ نہ ہوتا جو معتدل، کامل ومتوازن زندگی کی صحیح نمائندگی کرتا ہے، اور وہ حکیمانہ نبویؐ تعلیمات نہ ہوتیں، اور یہ احکام نہ ہوتے، جن کی پابندی رسول اللہ ﷺ نے اسلامی معاشرہ سے کرائی تو یہ امت افراط وتفریط کا شکار ہو کر رہ جاتی، اور اس کا توازن برقرار نہ رہتا، اور وہ عملی مثال نہ موجود رہتی، جس کی اقتداء کرنے کی خدا تعالی نے اپنے اس فرمان میں ترغیب دی ہے "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" (الاحزاب. ۲۱) (یقیناً تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ کی ذات اسوۂ حسنہ ہے) اور یہ فرما کر آپ کے اتباع کی دعوت دی ہے "قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفرلکم ذنوبکم" (سورۂ آل عمران. ۳۱) (آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہیں اللہ سے محبت ہے تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا، اور تمہارے گناہ معاف کردے گا) یہ ایک ایسا عملی نمونہ ہے جس کی انسانوں کو ضرورت ہے، اور جس سے وہ زندگی اور قوت واعتماد حاصل کر سکتا ہے، اور یہ اطمینان کر سکتا ہے کہ دینی احکام کا زندگی پر نفاذ نہ صرف آسان، بلکہ ایک امر واقعہ ہے۔

حدیث احتساب امت کا ایک طاقتور ذریعہ اور مصلحین ومجددین امت کی ایک تربیت گاہ

حدیث نبویؐ زندگی، قوت، اور اثر انگیزی سے بھر پور ہے، اور ہمیشہ اصلاح وتجدید کے کام، فساد اور خرابیوں اور بدعتوں کے خلاف صف آرا، اور برسر جنگ ہونے اور معاشرہ کا احتساب کرنے پر ابھارتی رہی ہے، اور اس کے اثر سے ہر

دور اور ہر ملک میں ایسے افراد پیدا ہوتے رہے، جنھوں نے اصلاح و تجدید کا جھنڈا بلند کیا، کفن پر دوش ہو کر میدان میں آئے اور بدعتوں اور خرافات، اور جاہلی عادتوں سے کھلی جنگ کی، اور دین خالص، اور صحیح اسلام کی دعوت دی، اسی لئے حدیث نبویؐ امت اسلامیہ کے لئے ایک ناگزیر حقیقت اور اس کے وجود کے لئے ایک لازمی شرط ہے، اس کی حفاظت، ترتیب و تدوین، حفظ اور نشر واشاعت کے بغیر امت کا یہ دینی ذہنی، عملی واخلاقی دوام و تسلسل برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔

سنت نبویؐ اور حدیث نبوی کے مجموعے ہمیشہ اصلاح و تجدید، اور امت اسلامیہ میں صحیح اسلامی فکر کا سرچشمہ رہے ہیں انہیں سے اصلاح کا بیڑا اٹھانے والوں نے تاریخ کے مختلف دوروں میں صحیح علم دین اور خالص فکر اسلامی اخذ کیا، انھیں احادیث سے انھوں نے استدلال کیا اور دین واصلاح کی دعوت میں وہی ان کی سند اور ان کا ہتھیار اور سپر تھی، بدعتوں، فتنوں اور شر و فساد سے جنگ و مقابلہ کے معاملہ میں وہی قوت محرکہ ودافعہ تھی، آج جو بھی مسلمانوں کو دین خالص اور اسلام کامل کی طرف آنے کی پھر دعوت دینا چاہتا ہے، اور ان کے اور نبوی زندگی اور کامل اسوہ کے درمیان تعلق استوار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، اور جس کو بھی ضرورت اور زمانہ کے تغیرات، نئے احکام کے استنباط کرنے پر مجبور کرتے ہیں، وہ اس سرچشمہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

تاریخ کی معتبر شہادت اور اصلاح وتجدید کی تحریکوں میں حدیث وسنت کا بنیادی حصہ

اس حقیقت پر اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی حدیث وسنت کی کتابوں سے مسلمانوں کے تعلق اور واقفیت میں کمی آئی، اور طویل مدت

تک یہ کمی باقی رہی تو داعیوں اور اخلاق کی تربیت، نفوس کا تزکیہ کرنے والے روحانی مربیوں کی کثرت، دنیا میں زہد اختیار کرنے اور کسی حد تک سنت پر عمل کرنے کے باوجود اس مسلم معاشرہ میں جو علوم اسلامیہ کے ماہرین، اور فلسفہ وحکمت کے اساتذۂ فن اور ادباء وشعراء سے مالامال تھا، اور اسلام کے قوت وغلبہ اور مسلمانوں کی حکمرانی میں زندگی گذار رہا تھا، نت نئی بدعتوں عجمی رسم ورواج، اور اجنبی ماحول کے اثرات نے اپنا تسلط قائم کردیا، یہاں تک کہ اندیشہ ہونے لگا کہ وہ جاہلی معاشرہ کا دوسرا ایڈیشن اور اس کا مکمل عکس بن جائیگا، اور رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی اور حدیث حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی "لتتبعن سنن من کان قبلکم شبرا بشبر وذراعا بذراع" (مستدرك حاكم) (تم پچھلی امتوں کے راستوں پر قدم بقدم چلوگے) اس وقت اصلاح کی آواز خاموش، اور علم کا چراغ ٹمٹمانے لگا۔

دسویں صدی ہجری میں ہندوستان کے دینی حالات، اور مسلمانوں کی زندگی کا جائزہ لیجئے، جبکہ برصغیر ہند کے علمی ودینی حلقوں کا حدیث شریف اور سنت کے صحیح مآخذ ومراجع سے تعلق تقریبا منقطع ہوگیا تھا، علم دین کے مراکز، اور حجاز ویمن، مصر وشام کے ان مدارس سے جہاں حدیث شریف کا درس ہوتا تھا، کوئی رابطہ نہ تھا، اور کتب فقہ، اصول اور ان کی شروح اور فقہی باریکیوں اور موشگافیوں اور حکمت وفلسفہ کی کتابوں کا عام چلن تھا، بآسانی دیکھا جاسکتا ہے کہ کس طرح بدعتوں کا دور دورہ تھا، منکرات عام ہوگئے تھے، اور عبادتوں اور تقرب الی اللہ کی کتنی نئی شکلیں اور نئے طریقے ایجاد کرلئے گئے تھے۔

راقم الحروف نے "تاریخ دعوت وعزیمت" کے حصۂ چہارم میں دسویں صدی ہجری کے ایک مشہور ومقبول شیخ طریقت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کی کتاب

"جواہر خمسہ" کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

"گجرات کو مستثنیٰ کر کے جہاں علمائے عرب کی تشریف آوری، اور حرمین شریفین کی آمد و رفت کی وجہ سے حدیث کی اشاعت ہو چکی تھی، اور علامہ متقی برہان پوری، اور ان کے نامور شاگرد علامہ محمد طاہر پٹنی پیدا ہوئے تھے، (دسویں صدی ہجری میں) ہندوستان صحاح ستہ، اور ان مصنفین کی کتابوں سے نا آشنا تھا، جنھوں نے نقد حدیث اور رد بدعت کا کام کیا، اور سنت صحیحہ اور احادیث ثابتہ کی روشنی میں زندگی کا نظام العمل پیش کیا، ہندوستان کے ان مقامی روحانی فلسفوں اور تجربوں کا اثر اپنے زمانہ کے مشہور و مقبول شطاری بزرگ شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کی مقبول کتاب "**جواہر خمسہ**" میں دیکھا جا سکتا ہے، جس کی بنیاد زیادہ تر بزرگوں کے اقوال اور اپنے تجربات پر ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحیح احادیث کے ثابت ہونے یا معتبر کتب شمائل و سیر سے اخذ کرنے کو ضروری نہیں سمجھا گیا، اس میں نماز احزاب، صلوۃ العاشقین، نماز تنویر البقر، اور مختلف مہینوں کی مخصوص نمازیں اور دعائیں ہیں، جن کا حدیث و سنت سے کوئی ثبوت نہیں ہے"۔ (۱۴)

یہ صرف "جواہر خمسہ" کی خصوصیت نہیں، بزرگوں کے ملفوظات کے غیر مستند مجموعوں میں اس کی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں، مشائخ کے لئے سجدۂ تعظیمی کا عام رواج تھا قبروں کو کھلے طریقہ پر سجدہ گاہ بنالیا گیا تھا، ان پر چراغ جلائے

جاتے تھے، چادریں چڑھائی جاتی تھیں، ان کے گرد و پیش کا ادب حرم مکی کی طرح کیا جاتا تھا، عرس و فاتحہ کے نام سے طرح طرح کے جشن منائے جاتے تھے، جن میں بہت بڑی تعداد عورتوں کی ہوتی تھی، صلوۃِ غوثیہ، صلوۃ معکوس، نذر لغیر اللہ، اولیاء و صلحاء کے نام پر، اور ان کی رضامندی کی نیت سے ذبح و قربانی، غیر اللہ کے نام پر روزہ، اور ایسی کتنی بدعات (جن کے حدود شرک سے مل جاتے تھے) مقبول عام و خاص تھیں، اولیائے و صالحین کے ایام پیدائش و وفات پر جلسے کئے جاتے تھے، اور میلے لگتے تھے۔

یہ صورت حال تھی کہ اللہ تعالی نے اس ملک میں امام ربانی حضرت شیخ احمد بن عبد الاحد سرہندی مجدد الف ثانیؒ (م ۱۰۳۴ھ) جیسے ربانی علماء اور رائمہ مصلحین پیدا فرمائے، (۱۵) جنھوں نے شعائر شرک، اور غیر اسلامی ہندی رسم ورواج کا شدت سے مقابلہ کیا، بدعتِ حسنہ کی مطلقاً تردید کی، وحدۃ الوجود پر سخت نکیر کی، سنت پر عمل، اور بدعت سے کھلی ہوئی جنگ کی دعوت دی، اور ایک موقعہ پر وہ تاریخی الفاظ تحریر فرمائے جو اس قابل ہیں کہ ان کو بار بار نقل کیا جائے :۔

مخدوما، فقیر را تاب استماع امثال ایں سخناں نیست، بے اختیار رگِ فاروقیم در حرکت می آید و فرصت تاویل و توجیہ آں نمی دہد، قائل آں سخناں شیخ کبیر یمینی باشد یا شیخ اکبر شامی، کلام محمد عربی علیہ و علی آلہ الصلاۃ والسلام و رکارست نہ کلام محی الدین ابن عربی و صدر الدین قونوی و عبد الرزاق کاشی، مارا بص کاریست نہ "فص" فتوحات مدینہ از "**فتوحات مکیہ**" مُستَغنی ساختہ است۔ (۱۶)

مخدوما! فقیر کو ایسی باتوں کے سننے کی تاب نہیں، بے اختیار میری رگِ فاروقی حرکت میں آجاتی ہے، اور تاویل و توجیہ کا موقعہ نہیں دیتی، ایسی باتوں کے

قائل شیخ کبیر یمنی ہوں یا شیخ اکبر شامی، ہمیں محمد عربی ﷺ کے کلام کی ضرورت ہے نہ کہ محی الدین بن عربی، صدر الدین قونوی، عبد الرزاق کاشی کے کلام کی، ہمیں نصوص کی ضرورت ہے، نہ کہ فصوص (۱۷) کی، فتوحات مدینہ نے، ہمیں فتوحات (۱۸) مکیہ سے بے نیاز کر دیا ہے۔

ان ہی کے معاصر محدث جلیل شیخ عبد الحق (ابن سیف الدین بخاری) دہلوی (م ۱۰۵۲) نے ہندوستان میں حدیث شریف کی نشر واشاعت، اور اس کی شرح وتدریس میں اپنی ساری کوششیں صرف کیں، (۱۹) ان دونوں کے بعد حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۱۷۶ء) اور ان کے مشہور اور نادرۂ روزگار فرزندوں نے قرآن وحدیث کی تعلیم، صحیح اسلامی عقائد کے بیان اور دین خالص کی دعوت کی ذمہ داری سنبھالی، اور صحاح ستہ کی تدریس، نشر واشاعت، اور تعلیمی نصاب میں ان کو نمایاں جگہ دینے کے سلسلہ میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، یہاں تک کہ مرکز اسلام سے ہزاروں میل دور سر اس عجمی ملک میں حدیث کا بازار ایسا گرم ہوا، اور یہ علاقہ طالبان علوم حدیث کا ایسا مرکز ومرجع بن گیا کہ دور دراز کے ممالک اور خود بلاد عربیہ سے علم حدیث کے شائقین وطالبین نے یہاں آکر فن حدیث کی تحصیل وتکمیل کی۔ (۲۰)

تیرھویں صدی کے پورے عالم اسلام میں اصلاح وتجدید کی سب سے زیادہ طاقتور اور مؤثر تحریکیں ہندوستان میں ظہور پذیر ہوئیں، قارئین کے لئے صرف حضرت سید احمد شہیدؒ اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کی ہمہ گیر اصلاحی تحریک (۲۱) کا مطالعہ کافی ہوگا، جس نے اس ملک کو ایک نئے ملک، اور اس قوم کو ایک نئی قوم میں تبدیل کر دیا، اور جس کی بدولت ایمان وحمیت اسلامی، جوش وولولہ جہاد دین

حنیف، اور صحیح اسلامی عقائد کی دعوت کی ایسی تیز، جاں فزااور روح پرور ہوائیں چلیں، جن سے قرون اولیٰ، اور عہد صحابہؓ کی یاد تازہ ہوگئی، دین خالص کی اس دعوت اور اصلاحی تحریک نے کتنی ہی مردہ سنتوں کو زندہ کیا، اور کتنی بدعات وخرافات، اور جاہلی عادات کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکا جو مسلم معاشرہ اور مسلمانوں کی طبیعتوں میں رچ بس گئی تھیں، ان کے بعد ان کے خلفاء اور ان کے خلفاء کے خلفاء نے یہ سلسلہ جاری رکھا، (۲۲) یہ سب کچھ سنت کے اثر، اور حدیث نبویؐ کی نشرواشاعت کے طفیل ہوا، پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے، کہ اگر علمائے اسلام کی دسترس میں کتب حدیث نہ ہوتیں، اور سنتوں بدعتوں میں تفریق وامتیاز کا یہ معتبر وسہل ذریعہ نہ ہوتا تو شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (م ۷۲۸ھ) کے عہد سے شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب (۱۲۰۶ھ) کے عہد تک مصلحین امت، اور دین خالص کے مبلغین کا یہ سلسلہ وجود میں نہ آتا، مصلحین روزگار اور تصحیح عقائد واصلاح رسوم کے علمبردار نظر نہ آتے، جن میں سے چند کے (بطور مثال) نام پیش کئے جاتے ہیں، علامہ محمد بن علی شوکانی (م ۱۲۵۵ھ) امیر محمد بن اسماعیل صنعانی (م ۱۱۸۲ھ) احمد بن عبداللہ بن ادریس حسنی (م ۱۲۹۳ھ) مولانا عبداللہ غزنوی امرتسری (شیخ محمد اعظم کابلی) (م ۱۲۹۸ھ) مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادیؒ (م ۱۲۸۹ھ) مولانا غلام رسول (قلعہ مہان سنگھ پنجاب) (م ۱۲۹۱ھ) مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (م ۱۳۲۳ھ) مولانا حسین علی ساکن واں بچھراں ضلع میاں والی (م ۱۳۶۳ھ) مولانا اشرف علی تھانویؒ (م ۱۳۶۲ھ) (۲۳) جن کے نام اور کام سے پچھلی اسلامی تاریخ منور ومعطر ہے۔

اسی شب وروز کے اشتغال بالحدیث اور اس کو زندگی کے مسائل میں حکم

اور قول فیصل ماننے کا نتیجہ تھا کہ حضرت شاہ محمد اسحاقؒ (بن محمد افضل دہلوی۔ متوفی ۱۲۷۲ھ) نے جو حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے نواسے اور درس وتدریس حدیث میں ان کے جانشین برحق تھے، ۱۲۵۵ھ میں ایک طالب حق رئیس (محمد زماں خاں صاحب رئیس بھیکم پور علی گڑھ) کے استفسارات کے جواب میں "**مسائل اربعین فی بیان سنته سید المرسلین**" کے نام سے فارسی میں ایک رسالہ تالیف فرمایا، (۲۴) جس میں شادی وغمی کی ہندوانہ رسوم اور بدعات مروجہ ہندوستان کی (جو زیادہ تر تقریبات سے تعلق رکھتی ہیں) واضح اور فیصلہ کن انداز میں تردید فرمائی گئی ہے، اس کتاب سے اس وقت کے ہندوستانی مسلم معاشرہ کو بڑا فائدہ پہنچا اور بہت سے خاندانوں نے اس کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنالیا، اور تقریبات شادی وغمی کے موقع پر سنت وشریعت کے احکام کی پابندی اختیار کی۔

اس سے پیشتر مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ نے "**ایضاح الحق الصریح فی احکام المیت والضریح**" کے نام سے ایک رسالہ تالیف فرمایا تھا، جو سنت وبدعت کی علمی تعریف وتشریح کے موضوع پر بہترین رسائل وکتب میں شمار ہونے کے قابل ہے لیکن اس کا طرز محققانہ عالمانہ اور اصولی ہے، اور اس سے اونچے پائے کے اہل علم ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں "**مسائل اربعین**" زیادہ عام فہم ہے اور اس کا تعلق ان بدعات ورسوم سے ہے، جو اس وقت کے مسلم معاشرے میں عام تھیں، اور روز مرہ کی زندگی میں داخل ہو چکی تھیں۔ یہی حال دوسرے عرب ممالک عراق، شام، مصر، تونس، الجزائر، ومراکش، اور عجمی ممالک افغانستان اور ترکستان وغیرہ کا ہے۔

دسویں اور گیارہویں صدی ہجری میں افغانستان (کابل وہرات وغزنی) کے علماء کے حالات پڑھئے ،اور ان کی تصنیفات دیکھئے، حمایت سنت، وردبدعت، علمی تحقیق اور مسائل کی تنقیح کا رنگ بہت کم نظر آئے گا، دفعۃ علامہ ملا علی قاری (علی بن سلطان محمد ہروی (م ۱۰۱۴ھ) کی شخصیت سامنے آتی ہے، جنھوں نے حجاز جاکر وہاں کے محدثین وفقہ کی شرح، مسائل کی ترجیح، اور اپنے زمانہ کی بعض بدعات کی بلاروروعایت تردید میں ان کا یہ مصلحانہ و محققانہ رنگ صاف جھلکتا ہے، ان کو ان کے مطالعہ و تحقیق، اور حق گوئی اور انصاف پسندی نے اس مقام تک پہونچادیا کہ انھوں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی حمایت کی، اور اس کی شہادت دی کہ وہ اکابر اہل سنت وجماعت اور اولیائے امت میں سے تھے، (۲۷) عراق میں علامہ شہاب الدین السید محمود الآلوسی بغدادی (م ۱۲۷۰ھ) صاحبِ **"تفسیر روح المعانی"** اور ان کے پوتے محمود شکری بن عبد اللہ شہاب الدین آلوسی (م ۱۳۴۲ھ) کا رنگ اپنے عہد کے علمائے عراق میں اسی درس ومطالعۂ حدیث کے اثر سے بالکل مختلف وممتاز نظر آتا ہے، شام میں علامہ جمال الدین القاسمی (۱۲۸۳-۱۳۳۲ھ) مصنف **"قواعد التحدیث من فنون مصطلح الحدیث"** و **"تفسیر قاسمی"** (۱-۱۲) کے اصلاحی رنگ کا اندازہ **"اصلاح المساجد من البدع والعوائد"** سے ہو سکتا ہے، وہ اپنے ہم عصر وہم وطن علماء میں (جن کا تمام تر اشتغال فقہ وعلوم حکمت، وادب وتاریخ سے تھا) ممتاز نظر آتے ہیں، مصر میں جامع ازہر، اور علمائے کبار کی موجودگی میں (جن کا علم حدیث سے اشتغال بہت کم رہ گیا تھا) (۲۶) بدعات کا عام شیوع تھا، مجلس میلاد، مولدِ حسینؓ، مجالس تعزیت وفاتحہ خوانی (ماتم) اور صوفیہ ومشائخ کے حلقوں میں

بیسیوں منکرات رائج تھے، اور بیشتر علماء سکوت سے کام لیتے تھے، لیکن حدیث کے اثر اور سنت کی قوت تسخیر نے مصر کے ایک عالم اور ازہر کے ایک استاد شیخ محمود خطاب سبکی (۲۷) کو پیدا کیا (۱۲۷۴ھ) جنھوں نے مصر میں علم اصلاح بلند کیا، بدعات و منکرات کی تردید کا منظم کام شروع کیا اور اس مقصد کے لئے ۱۳۳۰ھ) میں ایک جمعیت قائم کی جس کا نام "الجمعية الشرعية لتعاون العالمين بالكتاب والسنة المحمدية" تھا، واعظ اور مبلغ تیار کئے، جنھوں نے مصر کے قصبات اور دیہاتوں کا دورہ کیا، مصر کی مساجد سے ان بدعات اور نئی نئی باتوں کو خارج کیا جو مساجد کا ایک لازمہ بن گئی تھیں، اور سنت کے مطابق عبادات و فرائض کو ادا کرنے کا رواج عام کیا، (۲۸) خود ہندوستان میں علمائے فرنگی محل میں (جن کا علمی تبحر مسلم ہے، اور جن کا ترتیب دیا ہوا نصاب ہندوستان، افغانستان و ترکستان میں آج تک مقبول و رائج ہے) فخر المتاخرین مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ (م ۱۳۰۴ھ) کا (رسوم مروجہ اور بدعات کے بارے میں) رنگ الگ نظر آتا ہے، جس کے نمونے ان کے فتاوے میں دیکھے جا سکتے ہیں، اور یہ ان کے اشتغال بالحدیث، اور تدریس و خدمت کتب حدیث کا نتیجہ ہے، وہ خود تحدیث بالنعمہ کے طور پر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ایک بڑا انعام تھا کہ اس نے مجھے فن حدیث و فقہ حدیث کی طرف خصوصی توجہ کی توفیق عطا فرمائی۔

امت میں دینی ذوق اور اسلامی مزاج کا تسلسل وتوارث

حدیث و سنت کی بدولت حیات طیبہ کا امتداد و تسلسل اس وقت تک باقی رہا، اور امت کو اپنے ہر دور میں وہ روحانی، ذوقی، علمی و ایمانی میراث ملتی رہی جو صحابہ کرامؓ کو براہِ راست حاصل ہوئی تھی، اس طرح صرف عقائد و احکام ہی میں

"توارث" کا سلسلہ جاری نہیں رہا، بلکہ ذوق و مزاج میں بھی توارث کا سلسلہ جاری رہا، حدیث کے اثر سے عہد صحابہ کا "مزاج و مذاق" ایک نسل سے دوسری نسل، اور ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ تک منتقل ہوتا رہا، اور امت کی طویل تاریخ میں کوئی مختصر سے مختصر عہد ایسا نہیں آنے پایا، جب وہ "مزاج و مذاق یکسر ناپید اور معدوم ہو گیا ہو، ہر دور میں ایسے افراد رہے، جو صحابہ کرام کے مزاج و مذاق کے حامل کہے جا سکتے ہیں، وہی عبادت کا ذوق، وہی تقویٰ و خشیت، وہی استقامت و عزیمت، وہی تواضع و احتساب نفس، وہی شوق آخرت، وہی دنیا سے بے رغبتی، وہی جذبۂ امر بالمعروف و نہی عن المنکر، وہی بدعات سے نفرت، اور جذبۂ اتباع سنت، جو حدیث کے مطالعہ و شغف کا نتیجہ ہے، یا ان لوگوں کی صحبت و تربیت کا فیض ہے، جنھوں نے اس مشکوۃ نبوت سے روشنی حاصل کی ہو، اور اس میراث نبویؐ سے حصہ پایا ہو، امت کا یہ ذہنی و مزاجی توارث قرن اول سے اس چودھویں صدی ہجری کے عہد انحطاط و مادیت تک برابر قائم ہے۔

جب تک حدیث کا یہ ذخیرہ باقی، اس سے استفادہ کا سلسلہ جاری، اور اس کے ذریعہ سے عہد صحابہ کا ماحول محفوظ ہے، دین کا یہ صحیح مزاج و مذاق جس میں آخرت کا خیال دنیا پر، سنت کا اثر رسم و رواج پر، روحانیت کا اثر مادیت پر غالب ہے، باقی رہے گا، اور کبھی اس امت کو دنیا پرستی، سر تاپا مادیت، انکار آخرت، اور بدعات و تحریفات کا پورے طور پر شکار نہیں ہونے دے گا، بلکہ اس کے اثر سے ہمیشہ اس امت میں اصلاحی و تجدیدی تحریکیں اور دعوتیں اٹھتی رہیں گی، اور کوئی نہ کوئی جماعت حق کی علمبردار اور سنت و شریعت کے فروغ کے لئے کفن بردوش رہے گی، جو لوگ امت کو زندگی، ہدایت اور قوت کے اس سرچشمہ سے محروم کرنا

چاہتے ہیں، اور اس میں اس ذخیرہ کی طرف سے بے اعتمادی اور شک وارتیاب پیدا کرنا چاہتے ہیں، وہ نہیں جانتے کہ وہ امت کو کیا نقصان پہونچا رہے ہیں، اور اس کو کس عظیم سرمایہ اور کتنی بڑی دولت سے محروم کر رہے ہیں، وہ نہیں جانتے کہ وہ اس امت کو اسی طرح سے "محروم الارث" "منقطع الاصل، اور آوارہ کر دینا چاہتے ہیں، جس طرح یہودیت اور عیسائیت کے دشمنوں، یا حوادث روزگار نے ان عظیم مذاہب کو کر دیا، اگر وہ سوچ سمجھ کر ایسا کر رہے ہیں، تو ان سے بڑھ کو اس امت اور اس دین کا دشمن کوئی نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ پھر اس "مزاج ومذاق" کو دوبارہ پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں جو صحابہ کرامؓ کا امتیاز تھا، اور جو یا تو کامل طور پر براہ راست صحبت نبویؐ سے پیدا ہو سکتا ہے، یا بالواسطہ حدیث کے ذریعہ جو اس عہد کا جیتا جاگتا مرقع اور حیاتِ نبوی کا بولتا چالتا روزنامچہ ہے، اور جس میں عہد نبویؐ کی کیفیات بسی ہوئی ہیں۔

انکار حدیث کے نئے محرکات وعوامل

مغربی نو مسلم فاضل محمد اسد (LEOPOLD WEISS) نے سنت سے دامن چھڑانے، اور حدیث کا انکار کرنے کا حقیقی سبب (جس کے داعی اس دور میں پھر اس کا بیڑا اٹھا رہے ہیں) نئی نسل کی نفسیات اور مغربی تہذیب کے غلبہ اور طاقت سے مکمل واقفیت کی روشنی میں بیان کیا ہے کہ مغربی تہذیب کی قدروں اور پیمانوں، اور اس کے طرز زندگی اور فیشن، اور سنت نبویؐ میں کبھی گٹھ جوڑ نہیں ہو سکتا، اور اس زندگی کو جو رسول اللہ ﷺ سے گہری محبت، اور آپ کی ذات پر مکمل اعتماد اور سنت کے مراجع اور مآخذ پر پورے یقین اور اطمینان پر مبنی ہو، مغربی تہذیب کی تعظیم وتقدیس اور اس کو علم انسانی کی آخری دریافت سمجھنے کے تصور کے

ساتھ جمع نہیں کیا جاسکتا، غالباً بعض اسلامی ممالک کے حکام اور سیاسی لیڈران کے سنت پر حملہ اور انکار حدیث کا یہی سبب ہے، محمد اسد لکھتے ہیں۔

"آج جبکہ اسلامی ممالک میں مغربی تہذیب کا اثر و نفوذ بہت بڑھ چکا ہے، ہم ان لوگوں کے تعجب انگیز رویہ میں جن کو "روشن خیال مسلمان" کہا جاتا ہے، ایک اور سبب پاتے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ ایک ہی وقت میں رسول اللہ ﷺ کی سنتوں پر عمل کرنا، اور زندگی میں مغربی تہذیب کو اختیار کرنا ناممکن ہے، پھر موجودہ مسلمان نسل اس کے لئے تیار ہے کہ ہر مغربی چیز کو عزت کی نگاہ سے دیکھے، اور باہر سے آنے والے ہر تمدن کی اس لئے پرستش کرے کہ وہ باہر سے آیا ہے، اور طاقتور اور چمکدار ہے، مادی اعتبار سے یہ افرنگ پرستی ہی اس واقعہ کا سب سے بڑا سبب ہے کہ مکہ آج احادیث رسول اللہ ﷺ اور سنت کا پورا نظام رواج نہیں پا رہا ہے، سنت نبویؐ ان تمام سیاسی افکار کی کھلی اور سخت تردید کرتی ہے، جن پر مغربی تمدن کی عمارت کھڑی ہے، اس لئے وہ لوگ جن کی نگاہوں کو مغربی تہذیب و تمدن خیرہ کر چکا ہے، وہ اس شکل سے اپنے کو اس طرح نکالتے ہیں کہ حدیث و سنت کا بالکلیہ یہ کہہ کر انکار کردیں کہ سنت نبویؐ کا اتباع مسلمانوں پر ضروری نہیں، کیونکہ اس کی بنیاد ان احادیث پر ہے، جو قابل اعتبار نہیں ہیں، اور اس مختصر عدالتی فیصلہ کے بعد قرآن کریم کی تعلیمات کی

تحریف کرنا اور مغربی تہذیب وتمدن کی روح سے انھیں ہم آہنگ کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے"۔(۲۹)

جو لوگ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ امت اسلامیہ کو اس حیات بخش، اور ہدایت وقوت عطا کرنے والے صاف وشفاف سرچشمہ سے (حدیث کے حجت ہونے اور اس کے قدر ومنزلت میں شکوک اور شبہات پیدا کرنے کے ذریعہ) محروم کردیں اور اس پر سے امت کا اعتماد اٹھ جائے، وہ اس عظیم نقصان سے شاید ناواقف ہیں، جو اس امت کو پہونچا رہے ہیں، وہ شاید نہیں جانتے کہ اپنی اس نامحمود کوشش سے وہ اس امت کو اپنی میراث سے محروم، اپنے آغاز سے بے تعلق، اپنی اصل سے سرگشتہ وحیران بنا رہے ہیں، اور وہ معاملہ کر رہے ہیں، جو یہودیت ومسیحیت کے دشمنوں نے، یا انقلاب زمانہ نے ان مذاہب کے ساتھ کیا، اگر وہ باہوش وحواس یہ کام انجام دے رہے ہیں تو اس امت اور اس دین کا ان سے بڑھ کر کوئی دشمن نہیں، کیونکہ اس کے بعد نئے سرے سے پھر اس دینی ذوق کو وجود بخشنے کا کوئی ذریعہ نہیں رہ جاتا، وہ ذوق جو صحابہ کرامؓ کا امتیاز تھا، اور جو رسول اللہ ﷺ کی براہ راست صحبت، یا اس حدیث پاک کے واسطہ کے بغیر (جو اس عہد کی سچی تصویر، اس عہد کی کیفیات سے مملوء، اور اس کی عطر بیزیوں سے معطر ہے) پیدا نہیں کیا جاسکتا۔

فاضل مصنف محمد اسد نے اپنی کتاب میں جس کا عنوان ہے "اسلام دوراہے پر" اسلام دشمنی کے حقیقی اسباب اور اس سازش کی خطرناکی جو مسلم معاشرہ کو اس بے بدل قوت سے محروم، اور اس بے نظیر خزانہ سے خالی کردینا چاہتی ہے، بڑی اچھی تشخیص کی ہے، وہ کہتے ہیں۔

"سنت نبویؐ ہی وہ آہنی ڈھانچہ ہے، جس پر اسلام کی

عمارت کھڑی ہے، اگر آپ کسی عمارت کا ڈھانچہ ہٹادیں تو کیا آپ کو اس پر تعجب ہوگا کہ عمارت اس طرح ٹوٹ جائے، جس طرح کاغذ کا گھروندا" (۳۰)

انکار حدیث کا اثر اور اتباع سنت کی ضرورت اور اس کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :۔

"لیکن یہ اعلیٰ مقام جو اسلام کو اس حیثیت سے حاصل ہے کہ وہ ایک اخلاقی، عملی، انفرادی اور اجتماعی نظام ہے، اس طریقہ سے (یعنی حدیث اور اتباع سنت کی ضرورت کے انکار سے) ٹوٹ کر اور بکھر کر رہ جائے گا" (۳۱)

حدیث کے حجت، اور یقینی طور پر قابل اعتبار ہونے کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے، اور سنت کے انکار کی دعوت دینے کے مختلف دوروں میں، (۳۲) مختلف پیمانوں پر، اور مختلف مذہبی، سیاسی اور شخصی اغراض و مقاصد سے، اور شریعت اسلامی کی تنفیذ اور دینی پابندی کی ذمہ داری سے فرار کی خاطر ناعاقبت اندیشانہ کوششوں کے باوجود ہمیشہ سنت کا علم بلند رہا اور اس کی دعوت جاری رہی، اسلامی معاشرہ کا خمیر حدیث پاک سے تیار ہوا ہے، اور اس کے رگ و ریشہ میں حدیث سرایت کر چکی ہے، اور اس طرح اس کا جزو بدن بن چکی ہے کہ اس کو اسلامی معاشرہ کے جسم سے الگ کرنا اور محض قرآن کی بنیاد پر کوئی نیا مکمل معاشرہ قائم کرنا ممکن نہیں، خدائے تعالیٰ کا ارشاد ہے "وانزلنا الیك الذکر لتبین للناس مانزل الیهم" (النحل) (اور ہم نے آپ پر قرآن نازل کیا تاکہ آپ وضاحت کے ساتھ ان لوگوں کے لئے اس کو بیان کر دیں، جو ان کے لئے نازل کیا گیا ہے)۔

حدیث نبویؐ کے ساتھ ہمیشہ مطالعہ فہم و تحقیق، اور اس کے مراجع و مآخذ کی نشر و اشاعت اور اس کے مخطوطات و نوادر کی تحقیق و طباعت وغیرہ جیسی مختلف شکلوں میں اہتمام کیا جاتا رہا، اور اسلامی معاشرہ کا محاسبہ و جائزہ، دعوت الی الخیر، امر بالمعروف، و نہی عن المنکر، بدعتوں اور خرافات کی تردید، مغربی تہذیب کی اندھی تقلید، عقائدی، فکری اور تہذیبی ارتداد اور مغربی تمدن کو اپنی تمام خرابیوں و کمزوریوں، اور اسلامی زندگی کے مخالف عادات، اور قوانین کے ساتھ اختیار کر لینے پر سخت نکیر کا سلسلہ ہمیشہ جوش و خروش سے اس بنیاد پر قائم رہا کہ سنت کو فیصلہ کن حیثیت حاصل رہی، اور احادیث نبویہ کو قرآن کے بعد دوسرا بنیادی ماخذ یقین کیا جاتا رہا ہے، اور رسول اللہ ﷺ کی پیشن گوئی ہر دور میں حق ثابت ہوتی رہی "لاتزال طائفة من امتی ظاهرين على الحق لايضرهم من خذلهم حتى يأتى امر الله وهم كذلك" (۳۳) (میری امت کا ایک گروہ، ہمیشہ حق پر قائم رہے گا، یہاں تک کہ قیامت آجائے۔)

حدیث کی حجیت میں شکوک و شبہات پیدا کرنے والے، اور انکار سنت کا علم بلند کرنے والے اس "چراغ مصطفوی" کو اپنی کمزور پھونکوں سے بجھانے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں،

"يريدون ليطفئوا نور الله بافواههم والله متم نوره ولو كره الكفرون" (صف.۸)

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

(عربی سے ترجمہ مولانا سید سلمان حسینی ندوی)

حواشی :۔

(۱) تلموذ مشنا اور جمسا کا مشترک نام ہے، جو زبانی شریعت اور یہودی کے دوسرے رسم ورواج اور عادات پر مشتمل ہے، تلموذ کے نسخے جو۔۔۔ زیادہ سے زیادہ بڑی تقطیع پر بارہ جلدوں میں ہیں، تفاسیر وحواشی پر مشتمل ہیں اور بکثرت ہیں، (دائرۃ المعارف للبستانی) جیوش انسائیکلو پیڈیا میں ذکر کیا گیا ہے کہ تلموذ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ وثنیت (بت پرستی) میں یہودیوں کے لئے بڑی کشش پائی جاتی تھی۔ جیوئش انسائکلوپیڈیا جلد ۱۱، ۱۲: ص ۵۹۶۔۶۹۰

(۲) ملاحظہ ہو "کتاب مقدس" یعنی پرانا اور نیا عہد نامہ (مطبوعہ پرنٹس اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور) ص ۱۰۷۔ ص ۲۴۲

(۳) جلد ۱۳ ص ۱۰۷۱، چودھواں ایڈیشن۔

(۴) تفصیل کے لئے مولانا سید سلیمان ندوی کی گرانقدر کتاب "خطبات مدارس" کا دوسرا، تیسرا اور چوتھا خطبہ ملاحظہ ہو۔

(۵) بخاری ومسلم، نیز ملاحظہ ہو ابن کثیر آیت "ویؤثرون علیٰ انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ" (الحشر ۹)۔

(۶) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو صحیح بخاری، کتاب الاستئذان۔

(۷) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کی فاضلانہ تصنیف "تدوین حدیث" شائع کردہ مجلس علمی، کراچی۔

(۸) کتاب مذکور مطبوعہ ۱۸۷۰ء۔

(۹) ص ۱۴، ۱۵ مطبوعہ ۱۸۸۹ء، (ماخوذ از "خطبات مدراس" ص ۶۸۔۶۹)۔

(۱۰) حدیث وفقہ کی اصطلاح میں اس کو "إشعار الھدی" کہتے ہیں۔

(۱۱) عربی میں اس کو احتجام کہتے ہیں۔

(۱۲) صاحب "نسیم الریاض" نے ان خوش نصیب اصحاب کے نام بیان کئے ہیں، جن کو حیات نبوی میں یہ شرف حاصل ہوا ہے، ان کی تعداد ۳۸ بیان کی ہے، مشہور محدث ابن مندہ نے اس تعداد میں اضافہ کیا ہے۔

(۱۳) جو شخص اس حج کے موقعہ پر موجود ہے وہ میری ہدایات واقوال کو ان لوگوں تک پہونچادے جو موجود نہیں بالکل ممکن ہے کہ جس نے بالواسطہ سنا ہو وہ اس سے زیادہ ان کا سمجھنے اور یاد رکھنے والا ہو جو موقعہ پر موجود تھا، اور بلاواسطہ سن رہا تھا۔

(۱۴) تاریخ دعوت وعزیمت حصہ چہارم ص ۲۴۴۔

(۱۵)تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب "تاریخ دعوت وعزیمت" حصۂ چہارم باب پنجم ص ۹ ج ۲۳۔۲۵۳۔

(۱۶)مکتوبات امام ربانی۔ مکتوب نمبر ۱۰۰ ج ۱ ص ۱۲۲ مطبوعہ نولکشور کانپور ۱۹۰۶ء۔

(۱۷)ابن عربی کی مشہور کتاب "فصوص الحکم" کی طرف اشارہ ہے۔

(۱۸)ابن عربی کی دوسری مشہور کتاب "الفتوحات المکیۃ" کی طرف اشارہ ہے۔

(۱۹)ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" ج ۵ یا "حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی"۔ از پروفیسر خلیق احمد نظامی

(۲۰)ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر ج ۶، ۷۔

(۲۱)تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مؤلف کی تصنیفات "سیرت سید احمد شہیدؒ" ۱۔۲ "جب ایمان کی بہار آئی" یا رسالہ "تحقیق وانصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ" اور غلام رسول مہر کی تصنیف "سید احمد شہیدؒ"۔

(۲۲)ملاحظہ ہو راقم کی کتاب "کاروان ایمان وعزیمت" شائع کردہ سید احمد اکیڈمی، لاہور۔

(۲۳)مذکورہ بالا حضرات کے حالات وخدمات کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" ج ۷۔۸۔

(۲۴)یہ رسالہ پچاس صفحات پر مشتمل ہے، اور پہلی مرتبہ ۱۳۱۲ھ میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوا، اس میں چالیس رسوم مروجہ کے بارے میں حکم شرعی بیان کیا گیا ہے۔

(۲۵)مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۴ ص ۲۷۔

(۲۶)علامہ سید رشید رضا مصری نے "مفتاح کنوز السنۃ" مقدمہ میں لکھا ہے کہ "دسویں صدی ہجری کے بعد سے مصر وشام وعراق میں علم حدیث میں بڑا انحطاط آگیا تھا، اور چودھویں صدی ہجری میں تو یہ انحطاط اپنے آخری مرحلہ پر پہونچ گیا تھا" (مقدمہ مفتاح کنوز السنۃ ص ر ق)۔

(۲۷)حالات کے لئے ملاحظہ ہو "تذکرات سائح فی الشرق العربی" ص ۲۳۔۲۵۔

(۲۸)راقم نے اپنے سفر مصر ۱۹۵۱ء میں ان کی کوششوں کے اثرات دیکھے، اور ان کے تربیت یافتہ اصحاب، اور خود ان کے صاحبزادہ شیخ امین خطاب سے ملاقات کی (ملاحظہ ہو "شرق اوسط کی ڈائری)۔

(۲۹) ISLAM AT THE CROSS ROAD

(۳۰۔۳۱) "اسلام دوراہے پر"۔

(۳۲)تفصیل کے لئے کتاب "السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی" کا دوسرا باب ملاحظہ ہو جو مختلف ادوار میں سنت کے بارے میں پیدا کئے جانے والے شبہات کے بیان میں ہے ص ۱۲۳۔۱۵۳۔

(۳۳)"عن ثوبان ومعاویۃؓ" علامہ سخاوی نے لکھا ہے کہ اس حدیث کی متعدد اسانید شواہد ہیں۔

ناشاد شادی آباد سے عبرت و موعظت

۲۷/ نومبر ۱۹۸۳ء بروز شنبہ
مانڈو (قدیم شادی آباد) کے طویلہ محل کی
بالائی منزل پر کی گئی مفکر اسلامؒ کی ایک
شاندار تقریر۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ناشاد شادی آباد سے عبرت و موعظت

حمد و صلوٰۃ کے بعد۔

آج صفر ۱۴۰۳ھ کی ۱۰ر تاریخ اور نومبر ۱۹۸۳ء کی ستائیسویں تاریخ ہے، ہم لوگ اس وقت شادی آباد مانڈو میں ہیں، جو اب ناشاد ہے، اس کو اب ناشاد شادی آباد کہنا چاہئے، اور سچی بات یہ ہے کہ ہم سب آنے والے بھی ناشاد ہیں، اس لئے کہ جس انسان کے دل پر چوٹ نہیں لگتی وہ صحیح الفطرت انسان نہیں۔

کھنڈروں اور آثار قدیمہ کا شہر

ہم اس وقت یہاں قیام گاہ طویلہ محل کی بالائی منزل پر ہیں، ہمارے چاروں طرف کھنڈر پھیلے ہوئے ہیں، قبور بھی ہیں اور قصور بھی ہیں، کسی صاحب دل سے ایک مرتبہ کسی نے انسانی زندگی اور شان و شوکت کا انجام پوچھا تو انھوں نے کہا "هذه قبور هم وتلك قصورهم" "هذه" اشارہ قریب کا ہے، اور "تلك" اشارہ بعید کا ہے، یہ تو ہیں ان کی قبریں اور وہ رہے ان کے محل۔

یہاں قرآن مجید کی دو آیتیں ہیں، جو اس وقت ذہن میں تازہ ہوئیں ایک آیت ہے:

اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِي مَسٰكِنِهِمْ اِنَّ

فِی ذٰلِكَ لَآیٰتٍ اَفَلَا یَسْمَعُوْن (السجدہ. ۲۶) کیاان کواس (امر) سے ہدایت نہ ہوئی کہ ہم نے ان سے پہلے بہت سی امتوں کو جن کے مقامات سکونت میں یہ چلتے پھرتے ہیں، ہلاک کردیا، بے شک اس میں نشانیاں ہیں تو یہ سنتے کیوں نہیں؟

بھلا یہ دیکھتے نہیں کہ ان سے پہلے ہم نے کتنی پشتیں اور کتنی نسلیں کھپا دیں، وہ رخصت ہوئیں "یَمْشُوْنَ فِی مَسٰكِنِهِم "جس چیز نے متوجہ کیا وہ ہے لفظ "یمشون فی مسٰکنھم "یہ ایسا حسب حال ہے کہ کوئی فوٹوگرافی کی تصویر بھی اتنی حسب حال نہیں ہوسکتی "یَمْشُوْنَ فِی مَسٰكِنِهِم "ان کے رہنے کی، ان کے سکونت کی جگہوں پر چل پھر رہے ہیں، گذرے رہے ہیں "ان فی ذلك لایت" اب اللہ تعالیٰ متوجہ کرتا ہے کہ تم جس طرح چل پھر رہے ہو، یہ کچھ چلنا پھرنا نہیں ہے "إن فی ذلك لاٰیت" اس میں نشانیاں ہیں کیا سنتے ہیں، غور نہیں کرتے، دوسری آیت ہے کہ:

وَكَاَیِّن من اٰیة فی السَّمٰوٰتِ والارضِ یَمُرُّوْن عَلَیْهَا وَهُم عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ (یوسف. ۱۰۵) اور آسمان وزمین میں بہت سی نشانیاں ہیں، جن پر یہ گزرتے ہیں، اور ان سے اعراض کرتے ہیں۔

"هُم عَنْهَا مُعْرِضُوْن" اعراض جسمانی بھی ہوتا ہے، اعراض قلبی بھی، اور اعراض فکری بھی، اعراض فکری اور اعراض معنوی اعراض جسمانی سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

میں اس وقت انسانی زندگی کی بے ثباتی اور سلطنتوں اور حکومتوں اور جاہ وحشم کی بے وفائی اور حکومتوں اور تہذیبوں کے زوال وانحطاط پر کوئی روشنی ڈالنا نہیں چاہتا، وہ تو آپ کے سامنے ہے، اور عیاں راچہ بیاں، میں نے یہاں پچھلی مرتبہ

دو شعر پڑھے تھے۔

چمن کے تخت پر جس دم شہ گل کا تجمل تھا ہزاروں بلبلیں تھیں باغ میں ایک شور تھا غل تھا
کھلی جب آنکھ نرگس کی نہ تھا جز خار کچھ باقی بتا تا باغباں رو رو یہاں غنچہ، یہاں گل تھا

زوال پذیر ملکوں اور سلطنتوں سے سبق

لیکن میرے قلب پر ایک اور تقاضا غالب اور ایک مضمون وارد ہوا ہے، وہ یہ کہ میں اس سے پہلے قرطبہ اور غرناطہ بھی گیا ہوں، جہاں چھ سو برس تک بڑے جاہ جلال کے ساتھ عرب مسلمانوں نے حکومت کی، اور ایسا نقش قائم کیا کہ وہ یورپ کے لئے بھی رہنما بنا، آج بھی ان کے محلات شاہی اور وہاں کی مسجدیں اپنی نظیر نہیں رکھتیں، حالی مرحوم نے کہا تھا۔

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے
حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے وہ اجڑا ہوا کروفر جا کے دیکھے

جلال ان کا کھنڈروں میں ہے یوں چمکتا
کہ ہو خاک میں جیسے کندن دمکتا

میں غرناطہ بھی گیا، ابھی اورنگ آباد گیا تھا، میں نے کہا تھا کہ اورنگ آباد اور غرناطہ میں مجھے بڑی مماثلت نظر آتی ہے، اب کہتا ہوں کہ مجھے اس ناشاد شادی آباد اور غرناطہ میں بھی مماثلت نظر آتی ہے، ان سب میں ہم سب لوگوں کے لئے ایک سبق ہے، اور اسی کو عرض کرنا چاہتا ہوں۔

فاتحین اور حکمرانوں کی ایک غلطی

اسپین پھر اس کے بعد ہندوستان میں ان حکومتوں کے تخت پر جو لوگ متمکن تھے، ان کے کہیں تصور میں بات نہیں آتی تھی کہ کبھی ان کا یہاں سے کوچ

ہوگا اور وہ بالکل بے دخل ہو جائیں گے، وہ اپنا زوال خواب میں بھی نہیں دیکھتے تھے، بہت سی ایسی سلطنتیں ہوئی ہیں، جو اپنے کو "**دولت ابد قرار**" لکھتی تھیں، یہ سمجھتی تھیں کہ ہم اس ملک کا چارج براہ راست حضرت اسرافیلؑ کو دیں گے، ان لوگوں نے ملک فتح کئے، لیکن قوم فتح نہیں کی، انھوں نے زمین فتح کی لیکن دل فتح نہیں کئے، دونوں مثالیں ہمارے سامنے ہیں، انھوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ یہاں کی اصل آبادی کیا اہمیت رکھتی ہے، اور وہ کس حد تک قابل توجہ ہے؟ اللہ تعالیٰ کے قانون فطرت کے مطابق ایسا بہت کم سنا گیا ہے کہ کسی ملک کی آبادی سو فیصدی فنا ہو گئی ہو، کسی ملک میں مسلمانوں کو اس وقت تک اپنے مستقبل پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے، جب تک کہ وہاں کی اکثریت کو اپنے عقائد، اپنے مسلک زندگی اور حقائق اور احساسات میں (اور ایک لفظ میں) اس عقیدۂ ایمان میں شریک نہ کر لیا جائے، جو اللہ نے نبی عربی ﷺ کے ذریعہ اس امت کو نصیب فرمایا ہے، جب تک مسلمان ان کو اس دولت میں شریک نہ کر لیں اس وقت تک نہ ان کی سلطنت کا کوئی اعتبار ہے، نہ تہذیب کا اعتبار ہے۔

عرب فاتحین اولین کا امتیاز

یہ نکتہ تھا، جس کو ان عرب اولین نے سمجھا، جنھوں نے مصر، شام اور عراق فتح کیا تھا، وہاں کی قوم کو انھوں نے سینہ سے لگایا، ان کے ساتھ ایسی مساوات برتی، ان کے ساتھ ہمدردی کی اور ان کے مسائل سے ایسی دل چسپی لی اور ان میں ان کی رہنمائی کی، ان کے درد دکھ میں ایسے شریک ہوئے کہ وہ قوم ان کے دین اور ان کی انسانیت و شرافت کا کلمہ پڑھنے لگی، اور اس نے اپنی خواہش سے ان کی تہذیب اور ان کی زبان بھی اختیار کر لی، مصر میں آج بہت تھوڑی تعداد میں قبطی

ہیں، اور وہ عربی ہی بولتے ہیں، اور مجھے خوب یاد ہے کہ جس وقت مصر میں ایک قانون بنا تھا کہ غیر مسلم اقلیت کے بچوں کو قرآن مجید کی تعلیم سے مستثنیٰ کر دیا جائے تو عیسائیوں نے بڑا احتجاج کیا تھا، اور کہا تھا کہ ہماری عربی زبان کمزور ہو جائیگی اور ہم جاہل رہ جائیں گے، یہ قانون ہم پر نافذ نہ کیا جائے، ان میں حافظ بھی ہوئے ہیں، مصریوں کا مذہب بدل گیا، تہذیب بدل گئی، زبان بدل گئی، قومیت بدل گئی، سب نے عرب قومیت اختیار کرلی، اسی طرح عراق میں ہوا، اسی طرح شام میں ہوا، اور جب عرب اول اول سندھ میں آئے تو انھوں نے وہاں بھی اثر ڈالا، جس کا اثر آج تک ہے کہ سندھی زبان میں آج تک چٹائی کو حصیر کہتے ہیں، آج تک لہسن کو ثوم کہتے ہیں، آج تک جمعرات کو خمیس کہتے ہیں، ابھی تک سندھیوں کا رسم الخط عربی ہے، اسی طرح انڈونیشیا میں انھوں نے ایسا اثر ڈالا کہ انڈونیشیائی رسم الخط بھی اصلاً عربی تھا، اب وہاں قومیت کی تحریکیں اٹھیں تو یہ حقیقت نظر انداز ہو گئی۔

اصل آبادی کو نظر انداز کرنے کی غلطی

ہندوستان میں ہمارے یہاں کے حکمرانوں نے سب کچھ کیا مگر یہ نہیں سوچا کہ اس ملک کی اصل آبادی کو یہاں رہنا ہے، اور بظاہر اکثریت و اقلیت کا یہ تناسب سیکڑوں ہزاروں برس تک رہے گا، اس کو جب تک اپنے سے مانوس نہ کیا جائے، اس کے دلوں میں جب تک گھر نہ کرلیا جائے، اس کے دل میں جب تک ایمان کا تخم نہ بو دیا جائے، اور کم سے کم ان کے اندر اسلام کی قدر اور اسلام کی عظمت نہ پیدا کر دیجائے، جب تک انکی وحشت و نفرت دور نہ کی جائے، اس وقت تک حکومت کو کوئی اعتبار نہیں، ہم چاہے زمین میں، چاہے پہاڑوں پر فن تعمیر کے محیر العقول نمونے پیدا کر دیں، جیسا کہ قوم ثمود نے کیا تھا کہ "تنحتون من

الجبال بیوتا فرھین" انھوں نے پتھر تراش تراش کر بستیوں کی بستیاں آباد کرلیں، لیکن یہ چیز بالکل قابل اعتبار نہیں تھی، اصل کام کرنے کا یہ تھا کہ یہاں کی آبادی کو مانوس کیا جاتا، اور اپنے اخلاق سے، تعلیم سے، تربیت سے، طرز عمل سے، محبت سے، خلوص سے یا ان کو (انکی رضامندی بلکہ خواہش واصرار سے) اسلام میں داخل کرلیتے، یا اسلام سے اتنا مانوس کرلیتے کہ اسلام سے کسی قسم کی کوئی وحشت اور اجنبیت نہ رہتی، اسپین میں جو کچھ ہوا اور آج ہم جو یہاں دیکھ رہے ہیں، یہ اسی غفلت کا نتیجہ ہے، یہاں کے مسلمان حکمرانوں کے اندر احساس برتری رہا، ہم حکمراں طبقہ کے افراد ہیں، ہم حکمرانی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، اور یہ محکومیت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، یہ ہمارے ترکی النسل سلاطین اور افغانی النسل سلاطین کے ذہن سے نہیں نکلا، اس کے بالکل برخلاف عربوں کے اندر یہ تھا، کہ نہیں ہم سب بھائی بھائی ہیں، ہم یہاں داعی اور مبلغ ہو کر کے آئے ہیں، اور ہمیں یہاں اللہ کا دین پھیلانا اور پہونچانا چاہئے۔

بربر کی مثال

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بربر جیسی ناقابلِ تسخیر قوم جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی، عربوں سے پہلے اس نے کسی کی حکومت تسلیم نہیں کی، یہاں تک کہ رومن امپائر (ROMANEMPIRE) اپنے پورے عروج اور شان وشوکت کے ساتھ رہی لیکن بربر آزاد کے آزاد رہے، انھوں نے رومیوں کی کوئی چیز قبول نہیں کی، وہ رام اور تسخیر ہوئے تو عربوں سے ۳۰ـ۳۲ء میں فرانس نے ایڑی چوٹی کا زور لگادیا، کہ بربروں میں اپنی قومیت وقدیم تہذیب کو زندہ کرنے کا جذبہ پیدا ہو، انھوں نے بربروں میں یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کی کہ وہ الگ

ہیں، عرب الگ ہیں، فرانسیسیوں نے الظہیر البربری کے نام سے شاہ مراکش کی طرف سے ایک فرمان نکلوایا کہ بربروں کو اندرونی آزادی دی جاتی ہے، وہ اپنی قدیم تہذیب کا احیاء کریں، اپنا رسم الخط الگ بنائیں، اس کا لغت اور ڈکشنری بنائیں، اور اپنے کو ایک مستقل قوم سمجھیں، بربروں نے اس سے انکار کردیا، اس وقت ہمارے مشائخ ہی میدان میں آئے، انھوں نے ایک وظیفہ نکالا "یا لطیف الطف بنافی ما جرت به المقادر، ولا تفرق بيننا وبين اخواننا البرابر" یہ ان کا ہر نماز کے بعد وظیفہ تھا، اس وقت اس وظیفہ نے وہ کام کیا کہ فرانسیسی حکومت بالکل ناکام ہوگئی، ادھر بربروں نے انکار کردیا، اور ادھر ان عربوں نے کہا کہ یہ ہمارا گوشت پوست ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ وہ ایسے شیر وشکر نظر آتے ہیں کہ پہچان نہیں پڑتے۔

اسپین کی عرب حکومت کی غلطی

اسپین میں عربوں سے یہ غلطی ہوئی کہ وہاں کی عیسائی آبادی اور اکثریت کو انھوں نے نظر انداز کیا، وہ فنون لطیفہ کی ترقی اور تعمیرات میں لگ گئے، الزہراء جیسا شہر انھوں نے آباد کیا، جس کی نظیر دنیا میں ملنی مشکل ہے، الحمراء جیسا قلعہ بنایا جو لوگ اسے دیکھ آئے ہیں، وہ کہتے ہیں، اس کے سامنے مغلوں کے تعمیری نمونے بھی نہیں جچتے، اندلس کے زوال پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں جو اسباب بیان کئے گئے ہیں، اس میں یہ بھی ہے کہ عربوں نے اس آبادی سے آنکھیں بند کرلیں جو ان کے گرد سمندر کی طرح پھیلی ہوئی تھی، اپنے حال میں مگن اور اپنے خول میں بند رہے، وہ علوم ادبیہ اور شعر وشاعری میں مست رہے، انھوں نے خاص اسٹائل پیدا کیا، فن تعمیر کیا ایک نیا نمونہ، ایک نیا آرکیٹیکٹ (ARCHITECT) دنیا کو دیا،

یہ سب کچھ کیا، لیکن ملک کی آبادی کی طرف سے انھوں نے آنکھیں بند رکھیں، اس کو دین فطرت میں لانے کی کوئی اہم اور کوئی منظم کوشش نہیں کی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب وہ بے دخل ہوتے ہوتے غرناطہ کی آخری سرحد تک پہونچے جہاں سے پھر آبنائے جبل الطارق تھی، اور وہاں ان کو آخری دھکا دیا گیا، تو وہ تعمیرات کو تو چھوڑ گئے، باقی چیزوں کو لے کر وہ زمین سے ایسے بے دخل ہوئے جیسے کبھی یہاں تھے ہی نہیں۔

غلطی کا اعادہ نہ ہو

ہم نے بھی اگر ہندوستان کی اصل آبادی کو نظر انداز کیا، اور اسلام کا پیغام اس تک نہیں پہونچایا، اور اسے اپنے اخلاق سے تسخیر نہیں کیا اور ان کے دلوں میں ہم نے گھر نہیں کیا، تو (اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے) یہ ملک بھی کسی وقت اسپین بن سکتا ہے، ترکستان میں بھی یہی ہوا، مسلمانوں نے ایک سرحد بنالی کہ بس اس کے آگے نہیں جاتے، ادھر روس کا سارا علاقہ طاقت حاصل کر رہا تھا، لیکن بخارا اور سمرقند میں بیٹھے ہوئے ہمارے مسلمان بادشاہ یہ سمجھ رہے تھے کہ ہم قیامت تک یہیں رہیں گے، اور کسی کی کیا مجال کہ سرحد پار کرے اور یہاں آئے، نتیجہ یہ ہوا کہ جب یورپین روس سے انقلاب کا ریلا آیا تو سب بہا کر لے گیا۔

ہم مسلمانوں کو اس حقیقت کو اب سمجھ لینا چاہئے کہ اگر سو فیصد مسلمان تہجد گزار ہو جائیں، اور ہر مسلمان کے ہاتھ میں تسبیح آجائے اور ہر مسلمان اشراق اور چاشت کا پابند ہو جائے، لیکن اگر اکثریت اس سے نامانوس ہے، اکثریت اپنے دل میں اس کی طرف سے زہر لئے ہوئے بیٹھی ہے، اور سینہ میں انگارے سلگ رہے ہیں، تو خدانخواستہ جس وقت اس ملک میں کوئی بھونچال آئے گا، تو ہم اپنی ان تمام

عبادتوں، نوافل کے ساتھ بے دخل ہو جائیں گے، اس وقت نوافل تو نوافل، جو بنیادی چیزیں ہیں وہ بھی نہیں رہیں گی، اس لئے دینی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس آبادی کو اپنے سے مانوس بنائیں، اسلام کا پیغام گھر گھر پہونچائیں، ان کو بتائیں کہ اسلام کیا ہے؟

آج ایران کا ایک نمونہ دنیا کے سامنے آیا ہے کہ بس مارو اور بزن، بزن پچیس آدمی کل مارے گئے، اور پچاس آدمی آج مارے گئے، یہ اسلام کی تعلیم نہیں ہے، ان کو بتایا جائے کہ دین کس طرح پھیلا، ایک اکیلی ذات سے دین پھیلا ہے، اور جو ایمان لاتے رہے وہ بھی غیر مسلح اور کمزور لوگ تھے، یہ آخر کون سی تلوار تھی، جو میدان میں آئی، اور اس نے دین کو پھیلا دیا، ہم اپنے طرز زندگی سے، طرز عمل سے، اپنے اخلاق سے، اپنی خوش معاملگی سے، اپنی دیانت داری سے، اپنے میٹھے بول سے یہاں کی اکثریت کو زیادہ سے زیادہ مانوس کرنے کی کوشش کریں، ورنہ دوستو! بقول اقبال ؎

میں نہ عارف، نہ مجدد، نہ محدث، نہ فقیہ — مجھ کو معلوم نہیں کیا ہے نبوت کا مقام
ہاں مگر عالم اسلام پہ رکھتا ہوں نظر — فاش ہے مجھ پہ ضمیر فلکِ نیلی فام
عصر حاضر کی شب تار میں دیکھی میں نے — وہ حقیقت کہ ہے روشن صفتِ ماہ تمام

یہ ایسی حقیقت ہے جس کے لئے کسی بڑی فراست دور بینی کی ضرورت نہیں، کیا میرٹھ اور مرادآباد میں عابد وزاہد لوگ نہیں تھے، خدا معاف کرے، کیا وہاں دینی تعلیم نہیں تھی؟ کیا وہاں مدرسے نہیں تھے؟ مسجدیں نہیں تھیں؟ لیکن جب فساد کی لہر آئی تو سب کو نقصان پہونچ گیا، جس وقت کوئی لاوا پھٹے گا کسی کو وہ آتش فشاں سے پھر وہ کسی چیز کی تمیز نہیں کریگا، اس کو ہم رو رہے ہیں، کئی

برس سے کہ دیکھو شہروں کی فضا ایسی بناؤ کہ اگر کوئی مفسد آئے اور لڑنا چاہے، اور وہاں فساد کرانا چاہے تو اس کو وہیں کے شہری ناکام بنادیں، وہ کہیں کہ ہم کس کے خلاف ہاتھ اٹھائیں؟ یہ مسلمان جن کی وجہ سے یہاں کی وبائیں دور ہوتی ہیں، بلائیں دور ہوتی ہیں، ان کی وجہ سے ہم خدا کا نام سنتے ہیں، جو ہمارے بچوں سے پیار کرتے ہیں، جو ہمارے مریضوں کی خبر لیتے ہیں، جو اسپتالوں میں جاکر بلا تفریق مذہب وملت مسلمان، ہندو سب مریضوں سے ہمدردی، غم گساری کرتے ہیں، برادرانِ وطن کو پتہ ہی نہیں کہ اسلام کیا ہے؟ وہ اپنے اندر رحمت کا کیا پیام رکھتا ہے؟ وہ انسانیت کو کیا دیتا ہے؟ اور مسلمان کیسے خلیق، کیسے عالی ظرف، کیسے ہمدردِ بنی نوع انسان، کیسے رقیق القلب، کیسے مخلص، کتنے فرض شناس ہوتے ہیں، یہ کوئی نہیں جانتا۔

صوفیائے کرام کا کارنامہ

یہ کام یہاں ہمارے صوفیائے کرام نے کیا، اگر وہ نہ کرتے تو آج اتنا بھی نہ ہوتا ہم اتنی تعداد میں بھی یہاں نہ ہوتے، آپ پڑھیں تو، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ غیاث پور انسانیت کی پناہ گاہ تھی کہ مارے، کھدیرے، ستائے ہوئے، گھروں سے نکالے ہوئے لوگ آتے تھے، اور ان کو وہیں پناہ ملتی تھی، روٹی بھی کھاؤ، بستر بھی ملے گا، یہاں پڑے رہو، کوئی تمھیں ترچھی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا، یہ غیاث پور کی خانقاہ ہی کا اثر تھا کہ میوات کا سارا علاقہ مسلمان ہوگیا، وہیں سے وہ دھارا چلا ہے، یہ بات دہلی کے اور اطراف میں کیوں نہیں؟ اس پر کبھی آپ نے غور کیا؟

یہی وہ چیز ہے جس کو ہم کہتے ہیں، مگر نقار خانہ میں طوطی کی آواز بھی کچھ ہوتی ہے، ہماری آواز تو طوطی کی آواز کے برابر بھی نہیں، یہاں آکر ایک چوٹ سی لگی

کہ آخر اس آسانی کے ساتھ یہاں کے باشندے کیسے چلے گئے، جنھوں نے اپنی ذہانت، اپنی کارکردگی، اپنے عزم کے سکے بٹھادیئے تھے۔

وظنو ا انهم ما نعتهم حصونهم من الله (الحشر. ۲) اور وہ لوگ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ ان کے قلعے ان کو خدا (کے عذاب) سے بچالیں گے۔

قلعے نہیں بچاتے، اصل میں پیغام بچاتا ہے، دین بچاتا ہے، عمل بچاتا ہے، اخلاق بچاتے ہیں، اور وہ رشتہ اور تعلق جو عام انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے کہ ماں اور باپ کی گود میں جگہ نہیں وہ کہتے ہیں، ہماری گود میں آجاؤ، حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے کیسے اجمیر میں بیٹھ کر اتنا بڑا کام کر لیا، یہی وہ انسان دوستی، اور وہ رحمت ورافت تھی جو ان کو حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ اور اولیائے عظامؒ سے، میراث میں ملی تھی، وہ گویا شیروں کے بھٹ میں آکر بیٹھ گئے، ہم آپ اس وقت اندازہ نہیں کر سکتے کہ اجمیر کی اس وقت کے ہندوستان میں کیا حیثیت تھی؟ اس وقت خدا کا ایک بندہ ایران سے چل کر کے آتا ہے، اور سیدھے آکر کے وہاں بیٹھ جاتا ہے، اور کوئی اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ لوگ ان سے ڈرتے تھے، نہیں، ان کی سیرت، ان کے حالات دیکھ کر لوگوں کے ہاتھ ان کے خلاف اٹھ نہیں سکتے تھے، وہ سمجھتے تھے، جیسے مہاپاپ ہے، ایسے آدمی کو تکلیف دینا، معلوم نہیں کیا آفت آجائیگی، زلزلہ آجائیگا، ابھی تک یہ حقیقت نظر انداز ہوتی رہی، اس کا نتیجہ دیکھئے، مغلیہ سلطنت کس آسانی کے ساتھ ختم ہوگئی، یہ جو علاقائی حکومتیں تھیں، ان کا کروفر، اللہ اکبر، کہتے ہیں کہ مانڈو میں سترہ لاکھ کے قریب آبادی تھی، سترہ لاکھ کی آبادی اس زمانہ میں؟ ایسے ہی گولکنڈہ ایک زمانہ میں ایشیا کا عظیم ترین نہیں تو دو تین عظیم ترین شہروں میں سے تھا، اس کی تہذیب ضرب المثل تھی، کوہ

نورو ہیں سے مغل بادشاہوں کو ملا تھا، کسی طریقہ سے اس پر غور کیا جائے، کہ اس آبادی کی اپنے عقیدہ اور مسلک میں ادنیٰ درجہ کا کوئی فرق کئے بغیر مانوس کیا جائے اور یہ بالکل ممکن ہے، ہمارے بزرگوں نے کر کے دکھادیا، ان کے توادنیٰ معمولات میں بھی فرق نہیں آتا تھا بلکہ اور بڑھ جاتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک کام انھوں نے یہ بھی کیا کہ ان کو قریب کیا، اور ان کو مانوس بنایا۔

بس یہی مجھے عرض کرنا تھا کہ ہمیں یہ عبرت لینی چاہئے کہ کیوں یہاں سے مسلمانوں کا مکمل زوال ہو گیا، اور ایسا زوال ہوا کہ اب

بتا تا با غباں رورو، یہاں غنچہ، یہاں گل تھا

وآخر دعوانا أن الحمدلله رب العالمين۔

دین کا نبویؐ مزاج، اور اس کی حفاظت کی ضرورت

یہ تقریر مرکز جماعت اسلامی کشمیر (سری نگر میں) جماعت کے رفقاء، ہمدردوں، اور کارکنوں اور دوسرے تعلیم یافتہ حضرات کے سامنے ۳؍نومبر ۱۹۸۱ء بروز سہ شنبہ قبل ظہر کی گئی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دین کا نبویؐ مزاج، اور اس کی حفاظت کی ضرورت

حمد صلوۃ وخطبۂ مسنونہ کے بعد!

جناب قائم مقام امیر جماعت، رفقاء احباب اور معزز حاضرین! میں سب سے پہلے تو آپ کی اس عزت افزائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جس کا اظہار آپ نے اس دعوت اور پھر اس سپاسنامہ کے ذریعہ کیا، اللہ تعالیٰ آپ کے حسن ظن کو حق بجانب ثابت کرے، اور توقعات کو پورا کرے جن کا آپ نے اس محبانہ سپاسنامہ میں اظہار فرمایا ہے میرا احساس ہے کہ اس وقت میں ایک ایسی صاحب علم وفکر جماعت سے خطاب کر رہا ہوں، جس کی تشکیل فکر ومطالعہ پر ہوئی ہے، یہ عوام کا کوئی مجمع نہیں ہے، اس لئے میری تقریر میں اگر خطیبانہ عنصر نہ ہو تو آپ اس کو بے محل نہ سمجھیں۔

آپ نے جس محبت، حسن ظن اور اعتماد کا اظہار فرمایا ہے، اس کا بھی حق

ہے، اور میرے ضمیر اور میرے محدود فکر و مطالعہ اور تجربہ کا بھی تقاضہ ہے کہ میں آپ کے سامنے وہ چیز رکھوں جو مجھے خود بھی عزیز ہے، اور اس کو اہم اور ضروری سمجھتا ہوں، حدیث میں آتا ہے "لایؤمن أحد کم حتی یحب لأخیه مایحب لنفسه" تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا (لفظ تو حدیث کے یہی ہیں، مگر ہمارے علماء نے بہت سے اعتراضات اور خدشوں سے بچنے کے لئے اس کا مفہوم اس طرح بیان کیا ہے کہ "تم میں سے کوئی شخص مومن کامل نہیں ہو سکتا") جب تک کہ اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، ذمہ دار حضرات اور جماعت کے افراد سے اس کی بھی امید کرتا ہوں کہ جس تناسب اور جس انداز سے میں بات کہہ رہا ہوں، اسی تناسب اور انداز کے ساتھ آپ اخذ بھی کریں گے، اور اسی طرح دوسروں تک بھی پہونچائیں گے۔

حضرات! جس جماعت سے کسی تعلیم، تحریک، فلسفہ یا دعوت کو اخذ کیا جاتا ہے، اسی جماعت کا مزاج اس تحریک، تعلیم یا دعوت یا فلسفہ میں جاری ساری ہوتا ہے، یہ ایک قدرتی بات، ایک فطری عمل اور سنۃ اللہ ہے، آپ جن استادوں سے پڑھتے ہیں، ان استادوں کا طریق فکر، بلکہ انداز گفتگو بعض اوقات چال ڈھال بھی ان سے ملنے لگتی ہے، آپ جس گروہ کے ساتھ زیادہ اٹھتے بیٹھتے ہیں، شعوری یا غیر شعوری طریقہ پر آپ کے فکری سانچہ کو، آپ کے احساسات کو، آپ کے طریق تعبیر اور اظہار مافی الضمیر کو متأثر کرتا ہے، یہ قدرتی بات ہے، ایک فنِ طب ہی کو لیجئے (خواہ طب قدیم ہو یا طب جدید) میں نے دیکھا ہے، اسی طریقے سے ہونہار شاگرد نسخہ لکھتے ہیں، اسی طریقہ سے مرض کی تشخیص کرتے ہیں، وہی پرہیز اور اسی طرح کی احتیاطیں بتاتے ہیں، بلکہ بعض اوقات دیکھا ہے کہ وہ نقل بالکل

مطابق اصل ہوتی ہے، اسی طریقہ سے جو لوگ کشتی کا فن سیکھتے ہیں، وہ اپنے استادوں کے کرتب، داؤں پیچ، اکھاڑے میں اترنے اور دو دو ہاتھ کرنے کا انداز اپنا لیتے ہیں۔

اقبالؔ نے اپنی غزل اور شاعری کے متعلق کہا ہے، مگر حقیقت اس سے زیادہ وسیع ہے ؎

ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو

یہ دین جس کی نعمت سے اللہ نے ہم کو اور آپ سب کو سرفراز فرمایا ہے، نہ دانشوروں سے اخذ کی گیا ہے، نہ حکماء و فلاسفہ سے، نہ سیاستدانوں سے، نہ اہل حکومت و بانیان سلطنت سے، نہ فاتحین سے نہ خالص ذہین لوگوں سے، یہ ماخوذ ہے انبیاء علیہم السلام سے، اس لئے اس دین کے اخذ کرنے والوں میں، اس دین پر چلنے والوں میں، اس دین کی دعوت دینے والوں اور دین کا فکر پیش کرنے والوں میں، انبیاء علیہم السلام کا مزاج جاری و ساری ہونا چاہیے، یہی اس "دانشگاہ" کے طالب علموں کی سب سے بڑی ترقی، سعادت اور (تعبیر غلط نہ ہو تو) معراج ہے کہ وہ "نبوی مزاج" زیادہ سے زیادہ اخذ کریں، اور اس میں کامیاب ہوں۔

میں اس موقعہ پر آپ کو ایک لطیفہ سناتا ہوں، جس سے شاید میری بات زیادہ سمجھ میں آئے، کہتے ہیں کہ اورنگ زیب عالمگیر کے پاس ایک بہروپیا آتا تھا، وہ مختلف روپ بدل کر آتا تھا، اورنگ زیب ایک فرزانہ و تجربہ کار شخص تھے، جو اس طویل و عریض ملک پر حکومت کر رہے تھے، اس کو پہچان لیتے، وہ فوراً کہہ دیتے کہ تو فلاں ہے، میں جانتا ہوں، کہ وہ ناکام رہتا، پھر دوسرا بھیس بدل کر آتا پھر وہ تاڑ جاتے اور کہتے میں نے پہچان لیا تو فلاں کا بھیس بدل کر آیا ہے تو تو فلاں ہے، بہروپیا

عاجز آگیا، اخیر میں کچھ دنوں تک خاموشی رہی، ایک عرصہ تک وہ بادشاہ کے سامنے نہیں آیا، سال دو سال کے بعد شہر مین یہ افواہ گرم ہوئی کہ کوئی بزرگ آئے ہوئے ہیں، اور وہ فلاں پہاڑ کی چوٹی پر خلوت نشین ہیں، چلہ کھینچے ہوئے ہیں، بہت مشکل سے لوگوں سے ملتے ہیں، کوئی بڑا خوش قسمت ہوتا ہے، جس کا وہ سلام یا نذر قبول کرتے ہیں، اور اس کو باریابی کا شرف بخشتے ہیں، بالکل یکسو اور دنیا سے گوشہ گیر ہیں، بادشاہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تحریک کے مکتب کے پروردہ تھے، اور ان کو اتباع سنت کا خاص اہتمام تھا، وہ اتنی جلدی کسی کے معتقد ہونے والے نہیں تھے، انھوں نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا، ان کے اراکین دربار نے کئی بار عرض کیا کہ کبھی جہاں پناہ بھی تشریف لے چلیں، اور بزرگ کی زیارت کریں، اور ان کی دعا لیں، انھوں نے ٹال دیا، دو چار مرتبہ کہنے کے بعد بادشاہ نے فرمایا کہ اچھا بھئی! چلو کیا حرج ہے، اگر خدا کا کوئی مخلص بندہ ہے، اور خلوت گزیں ہے، تو اس کی زیارت سے فائدہ ہی ہوگا، بادشاہ تشریف لے گئے، اور مؤدب ہو کر بیٹھ گئے، اور دعا کی درخواست کی، اور نذر دکھائی، درویش نے لینے سے معذرت کی، بادشاہ وہاں سے رخصت ہوئے تو درویش کھڑے ہو گئے، اور آداب بجالائے، فرشی سلام کیا، اور کہا کہ جہاں پناہ! مجھے نہیں پہچان سکے، میں وہی بہروپیا ہوں جو کئی بار آیا، اور سرکار پر میری قلعی کھل گئی، بادشاہ نے اقرار کیا، کہا کہ بھائی بات تو ٹھیک ہے، میں اب کی نہیں پہچان سکا، لیکن یہ بتاؤ کہ میں نے جب تمہیں اتنی بڑی رقم پیش کی جس کے لئے تم یہ سب کمالات دکھاتے تھے، تو تم نے کیوں نہیں قبول کیا، اس نے کہا کہ سرکار! میں نے جن کا بھیس بدلا تھا، ان کا یہ شیوہ نہیں، جب میں ان کے نام پر بیٹھا، اور میں نے ان کا کردار ادا کرنے کا بیڑہ اٹھایا تو پھر مجھے شرم آئی کہ میں جن کی نقل کر رہا ہوں، ان کا

یہ طرز نہیں کہ وہ کسی بادشاہ کی رقم قبول کریں، اس لئے میں نے نہیں قبول کیا، اس واقعہ سے دل ودماغ کو ایک چوٹ لگتی ہے کہ ایک بہروپیا یہ کہہ سکتا ہے، تو پھر سنجیدہ لوگ، صاحب دعوت انبیاء علیہم السلام کی دعوت قبول کر کے ان کا مزاج اختیار نہ کریں، یہ بڑے ستم کی بات ہے، میں نے یہ لطیفہ تفریح طبع کے لئے نہیں بلکہ ایک حقیقت کو ذرا آسان طریقہ پر ذہن نشین کرنے کے لئے سنایا۔

ہم داعی و مبلغ ہوں، یا دین کے ترجمان یا شارح، ہمیں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ یہ دین اور دعوت ہم نے انبیاء علیہم السلام سے اخذ کی ہے، اگر انبیاء علیہم السلام یہ دعوت لے کر نہ آتے تو ہم کو اس کی ہوا بھی نہ لگتی، قرآن شریف میں آتا ہے کہ جب جنت والوں کو آخرت میں انعام ملے گا، اور وہ جنت میں پہونچیں گے تو وہ کہیں گے کہ "الحمدُ للهِ الذیٰ هَدٰنا لِهٰذا وَمَا كُنّا لِنَهتَدِیَ لَولَا اَنْ هَدٰنا اللّٰهُ" (شکر ہے اس خدا کا جس نے کہ ہمیں کہاں تک پہونچایا، اور ہم یہاں تک پہونچنے والے نہ تھے، اگر اللہ ہمیں یہاں تک نہ پہونچاتا) ہدایت کے معنی پہونچانے کے ہیں، اس کے بعد انھوں نے ایک بڑی حقیقت بیان کی جس کی طرف میں متوجہ کرنا چاہتا ہوں، ہم جو یہاں تک پہونچے، عقل ودانش کی راہ سے نہیں پہونچے، تجربہ کی راہ سے نہیں پہونچے، نفس کشی اور ریاضت و مجاہدہ کی راہ سے نہیں پہونچے، فلسفہ وحکمت کی راہ سے بھی نہیں پہونچے، پہلے تو انھوں نے اجمالا کہا ہے "وما کنا لنهتدی لولا ان هدٰنا الله" (ہماری رسائی یہاں تک نہ تھی، اگر خدا ہمیں یہاں تک نہ پہونچادیتا) لیکن خدا کے پہونچانے کے طریقے ہوتے ہیں، اس کا بھی ایک ذریعہ ہوتا ہے، تو اس کا ذریعہ کیا ہوا؟ "لقد جاء ت رسل ربنا بالحق" ہمارے رب کے قاصد حق لے کر آئے، جانِ سخن یہ ہے کہ خدا کے ایلچی

اور سفیر حق لے کر نہ آتے تو یونہی بھٹکتے رہتے، اور آج جنت کے بجائے ہمارا کوئی دوسرا مقام ہوتا، تو یہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ جس چیز نے ہم کو اس قابل بنایا، وہ چیز دانشوروں، فلسفیوں، سیاست دانوں، اور تجربہ کاروں سے اخذ کی ہوئی نہیں ہے، پیغمبروں سے اخذ کی ہوئی ہے، اور اس کا کوئی ذریعہ نبوت ورسالت اور اس کے حاملین (انبیاء کرام) کے علاوہ نہیں ہو سکتا ہم نے اس کو قبول کر لیا تو اس قابل ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ان نعمتوں ان سعادتوں اور صداقتوں سے فیض یاب اور بہرہ اندوز ہوں، اور دوسروں تک بھی ان کو پہونچائیں۔

اب ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ نبوت کا مزاج کیا ہے؟ نبوت کے لئے محرک کیا چیز ہوتی ہے؟ نبی کے سوچنے کا انداز کیا ہوتا ہے؟ اس لئے میں اس وقت آپ کے سامنے تین چیزیں عرض کرتا ہوں۔

پہلی بات یہ ہے نبی کی دعوت، جدوجہد، اور قول وعمل کا سب سے بڑا محرک رضائے الٰہی کا جذبہ ہوتا ہے، کوئی اور چیز ان کے سامنے نہیں ہوتی کہ اس کے نتیجہ میں یہ ملے یا وہ ملے، یہ جذبہ ایک ایسی شمشیر برہنہ ہے، جو ہر چیز کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے، سوائے رضائے الٰہی کے، ان کا کچھ مطلوب نہیں ہوتا، میرا مالک مجھ سے راضی ہو جائے، بس مجھے سب کچھ مل گیا طائف کی دعا کی روح پر آپ غور کریں، اور طائف کے منظر کو آپ سامنے رکھیں کہ حضور ﷺ بڑی امیدوں، اور بڑی توقعات کے ساتھ طائف تشریف لے جاتے ہیں، طائف کا سفر آسان نہیں تھا، سخت دشوار گذار راستہ، پہاڑ کی چڑھائی، اور خچر کی سواری، ایک اکیلا رفیق (زید ابن حارثہ) آپ وہاں پہونچے تو کیا ہوا؟ وہاں کے سرداروں نے کچھ اوباشوں کو اشارہ کر دیا اور انھوں نے پتھر پھینکنے شروع کئے، اور اتنی سنگ باری کی کہ نعلین مبارک سے

قدم مبارک نہیں نکلتے تھے، قدم مبارک لہولہان ہو گئے تھے، اس وقت پاؤں پر اتنا زخم نہیں آیا تھا، جتنا دل پر آیا تھا، کیا امید لے کر آئے تھے، اس سے آپ کو معلوم ہو گا کہ رضائے الٰہی کی قیمت کیا ہے، آپ نے فرمایا "اللهم اليك أشكو ضعف قوتي وقلة حيلتي وهو اني على الناس ،رب المستضعفين إلى من تكلني إلى بعيد يتجهمني أوإلى عدو ملكته أمري "میں اس کا ترجمہ کر دیتا ہوں، فرماتے ہیں کہ اے میرے پروردگار میں تجھ سے فریادی ہوں اپنی کمزوری کا، اور اپنی بے چارگی اور بے سروسامانی کا، لوگوں کی نگاہوں میں بے وقعتی ،بے بسی و بے کسی کی آپ سے شکایت کرتا ہوں، اے کمزوروں کے پروردگار تو مجھے کس کے حوالہ کرتا ہے ؟ایک ایسے بیگانہ کے جو مجھ سے ترش روئی کے ساتھ پیش آتا ہے، یا کسی دشمن کے حوالہ کرتا ہے کہ جس کے ہاتھ میں تو نے میری زمام اختیار دے دی ہے۔

اب دیکھئے یہاں نبی کا مزاج اپنی پوری شان تابانی کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے، اوپر کے الفاظ کے بعد جو نقل ہوئے معا فرماتے ہیں "إن لم يكن بك على غضب فلا أبالي غير أن عافيتك هي اوسع لي "(اگر تو ناراض نہیں ہے، تو مجھے کسی بات کی پروانہیں ہے، البتہ اتنا ضرور ہے کہ انسان ہوں تیری عافیت کا طالب ہوں) تو پہلی چیز جو نبی کے مزاج کی بنیاد ہوتی ہے، وہ رضائے الٰہی ہے، وہ پیغام پہونچاتے ہیں، اور جب ان کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ہم نے پیغام پہونچادیا، اور ہمارا رب ہم سے راضی ہو گیا تو پھر ان کی بالکل پروانہیں ہوتی کہ نتیجہ کیا نکلا۔

اس کی ایک واضح مثال حضرت نوحؑ کا واقعہ ہے کہ "لَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا" پچاس برس کم ایک ہزار برس وہ دعوت دیتے رہے، اور انھوں نے کس طرح دعوت دی، دن رات ایک کر دیئے، سورہ نوح کی آیات پڑھئے :۔

قَالَ رَبِّ اِنِّی دَعَوتُ قَومِی لَیلًا وَنَهَارًا (نوح.۵) کہا اے میرے رب میں نے اپنی قوم کو رات اور دن بلایا۔

ثُم اِنِّیٓ اَعلَنتُ لَهُم وَاَسرَرتُ لَهُم اِسرَارًا (نوح.۹) پھر میں نے انھیں علانیہ بھی کہا، اور مخفی طور پر بھی کہا۔

اس سب کے بعد کیا ہاتھ آیا کہ "وَمَا اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِیلٌ" ان کے ہاتھ پر چند آدمی ایمان لائے جو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، لیکن ان کو اس پر کوئی ملال، کوئی شکوہ نہیں، جو میرا کام تھا، وہ میں نے کر دیا، میں نے اپنے رب کو راضی کر دیا، اب آگے اللہ کا کام ہے۔

تو پہلی بات یہ ہے کہ دین کے ہر عمل کا مقصد صرف رضائے الٰہی ہونا چاہئے، اس رضائے الٰہی کے سلسلہ میں اگر ساری سلطنت ہمارے ہاتھ سے نکلتی ہو تو وہ سلطنت نکلی نہیں بلکہ آئی، اور رضائے الٰہی کے بغیر ہفت اقلیم کی سلطنت ملتی ہو تو وہ سلطنت ملی نہیں بلکہ کھوئی، اس لئے میں حضرت حسینؓ کے کارنامہ کو بہت بڑا کارنامہ سمجھتا ہوں، اور میں ان کو بالکل ناکام نہیں سمجھتا، انھوں نے ایک نظیر قائم کر دی کہ حق کے لئے کس طرح سینہ سپر ہوا جاتا ہے، کس طرح جان دی جاتی ہے، انھوں نے اس کی نظیر قائم کر دی کہ کسی غلط چیز کے خلاف (خواہ اس پر کوئی لیبل لگا ہو) اگر آدمی جدوجہد کرے تو اس کا جواز ہے، اگر حضرت حسینؓ کا یہ کارنامہ نہ ہوتا تو بعد میں بڑی مشکل پیش آتی، کہیں کھلے طریقہ پر دین کو پامال کیا جا رہا ہے، یا اسلام کشی، اسلام دشمنی کی جا رہی ہے، یا دین میں بالکل تحریف کی جا رہی ہے، لیکن اس کے خلاف کوئی آواز بلند نہ کی جا سکتی کہ عہد سعادت میں اس کی کوئی نظیر نہیں۔

فرق تو بہت بڑا ہے، تاریخ کا بھی بڑا فاصلہ ہے، اور شخصیت کا بھی بڑا فرق

ہے، لیکن یہی معاملہ شہدائے بالاکوٹ اور حضرت سید احمد شہیدؒ، اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کا ہے کہ آج ایک چپہ زمین پر ان کی یا ان کی جماعت کی حکومت نہیں، اور خدا کا شکر ہے، اور میں اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں شکر ادا کرتا ہوں، میرا بھی ان کے خاندان سے تعلق ہے، الحمد للہ ہم نے ان کے کام اور ان کے نام سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، ہمارے خاندان کے افراد ملازمتیں کرتے ہیں، محنت کرتے ہیں، عام مسلمانوں کی طرح رہتے ہیں نہ کوئی سجادگی ہے، نہ کوئی مجاوری، اور نہ یہ کہ انھوں نے جو ریاست بنائی تھی، اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، لیکن ہم خوش اور مطمئن ہیں کہ انھوں نے اپنا فرض ادا کیا، اور خدا کے سامنے سرخرو ہیں۔

سودا قمار عشق میں خسرو سے کو ہکن
بازی اگر چہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا

انبیاء علیہم السلام کے پیش نظر صرف رضائے الٰہی کا مسئلہ ہوتا ہے، اور ہر چیز میں وہ سوچتے ہیں کہ اس سے اللہ راضی ہوتا ہے یا نہیں؟ سربلندی اور اقتدار اور حکومت یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں، اپنے وقت پر اپنی شرطوں کے ساتھ ملتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی چیز مطلوب نہیں، چنانچہ آپ دیکھئے کہ قرآن مجید میں ایک جگہ تو یہ ہے کہ:

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (القصص. ۸۳) یہ دار آخرت ہم ان لوگوں کے لئے مخصوص کریں گے، جو زمین میں سربلندی نہیں چاہتے اور نہ فساد چاہتے ہیں، اور اچھا انجام متقین کے لئے ہے۔

لیکن دوسری جگہ فرماتا ہے:

وَلَاتَهِنُوا وَلَاتَحزَنُوا وَاَنتُمُ الاَعلَونَ اِنْ کُنتُمْ مُؤمنینَ (آل عمران ۱۳۹) ہمت نہ ہارو غم نہ کرو، تمہیں اعلیٰ ہو تمہیں کو علو حاصل ہوگا، اگر تم مومن ہو۔

اب دونوں میں تطبیق کس طرح دیں گے؟ صاف مطلب یہ ہوا کہ تم علو مت چاہو، ہم علو دیں گے، چنانچہ آنحضرت ﷺ، صحابہ کرام کسی نے علو نہیں چاہا، اور تواضع اور ایثار اور قربانی سے کام لیا، اللہ تعالیٰ نے جتنا منظور تھا، ان کو علو عطا فرمایا، تو پہلی چیز تو یہ ہے کہ مطلوب صرف رضائے الٰہی ہو، اور رضائے الٰہی کے ساتھ اگر ساری دنیا کے فوائد اور ساری دنیا کے مفادات سے دست بردار ہونا پڑے تو وہ کامیابی ہے، اور رضائے الٰہی کے بغیر اگر ساری دنیا کی سلطنت ملتی ہو تو وہ ناکامی ہے، یہ نبوی مزاج ہے، جو بغیر کسی تکلف کے، اور بغیر کسی پلاننگ کے پیغمبروں اور ان کے سچے متبعین میں پیدا ہو جاتا ہے، قرآن شریف میں اسی مضمون کو اس طرح سے ادا کیا گیا ہے "یَومَ لَایَنفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُونَ اِلاَّ مَنْ اَتَی اللهَ بِقَلبٍ سَلِیمٍ" جس دن نہ مال ہی کچھ فائدہ دے سکے گا نہ بیٹے، ہاں جو شخص خدا کے پاس پاک دل لے کر آیا (وہ بچ جائے گا) اس میں غیر اللہ کے مقابلہ میں کوئی اور محرک، کوئی اور طاقت، کوئی اور خواہش نہ ہو، اور حضرت ابراہیمؑ کی تعریف ان لفظوں میں کی گئی ہے "اِذجَاءَ رَبَّہٗ بِقَلبٍ سَلِیمٍ" (جب وہ اپنے رب کے پاس (عیب سے) پاک دل لے کر آئے) قلب کو قلب سلیم بنانے کی کوشش ہمیشہ جاری رہنی چاہئے، اور برابر اپنے قلب کا احتساب فاری رہنا چاہئے کہ اس کے اندر سیاسی مقاصد، مادی مفادات، علو اور سربلندی کا شوق تو کام نہیں کر رہا ہے، اقبالؔ نے صحیح کہا ہے

برا ہیمی نظر پیدا ذرا مشکل سے ہوتی ہے
ہوس سینے میں چھپ چھپ کر بنا لیتی ہے تصویریں

آنحضرت ﷺ نے فرمایا "إ ن الشیطان یجری من المؤمن مجری الدم" شیطان مومن کے جسم میں بعض اوقات اس طرح سرایت کر جاتا ہے جس طرح خون رگوں میں دوڑ جاتا ہے، حضرت امیر کبیر سید ہمدانیؒ کی دعوت یہی قلب سلیم کی دعوت تھی، تزکیہ واحسان کا لب لباب، اور اللہ کے مخلص بندے جو نفوس اور قلوب کا علاج کرتے تھے، ان کا کام یہی تھا کہ قلب سلیم پیدا ہو، وہ چاہتے تھے کہ ان کے پاس اٹھنے بیٹھنے والے قلب سلیم کے حامل ہو جائیں، ان کے اندر سے دنیا کی محبت، مال کی محبت جاہ کی محبت، اور اولاد کی وہ محبت (جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام کی تعمیل میں مزاحم ہو) نکل جائے۔

دوسری یہ ہے کہ وہ انبیاء (اور نائبین انبیاء)، دین کی تعلیم، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام کے بارے میں بڑے غیور ہوتے ہیں، نہ کوئی (ذہنی) رشوت قبول کرتے ہیں، اور نہ کوئی رشوت دیتے ہیں، کوئی مانے نہ مانے، کوئی ان کی طرف آئے یا نہ آئے، وہ اپنی بات اسی انداز میں کہتے ہیں، جس انداز میں خدا نے ان کو وہ بات عطا کی اور سمجھائی ہے، مثلاً ایسا ہوا کہ کفار نے مسلمانوں سے کہا کہ کچھ دن تم ہمارے بتوں کی عبادت کر لو، اور کچھ دن ہم تمہارے بتوں کی، خدا کے پیغمبر نے جواب دیا، ہرگز نہیں :لَااَعْبُدُ مَاتعبدُونَ وَلاَ انتُم عٰبدونَ مَااَعْبُدُ(الکافرون ۱۰۹.۲)نہ تو میں تمہارے معبودوں کی عبادت کرتا ہوں، اور نہ تم ہی میرے معبود کی عبادت کرتے ہو۔

طائف کے قبیلۂ ثقیف نے چاہا تھا کہ "لات" کو جو قبیلہ بنی ثقیف کا بڑا بت تھا، گویا قریش کے بت "ہبل" کا ہمسر تھا، نہ توڑا جائے، اور اس کی کچھ عرصہ تک عبادت کرنے کی اجازت دے دی جائے انھوں نے کہا کہ ایک سال! فرمایا

ہر گز نہیں! چھ مہینے! فرمایا ہر گز نہیں، ایک مہینہ، فرمایا ہر گز نہیں، ایک دن، ہر گز نہیں، اور اس کے بعد حضرت مغیرہ بن شعبہ کو بھیجا، انھوں نے جا کر اس کو پاش پاش کر دیا، انھوں نے کہا کہ ہم دین میں داخل ہوتے ہیں، لیکن نماز سے ہم کو معاف کر دیا جائے، فرمایا "لاخیر فی دین لارکوع فیه" ایسے دین مین کچھ رکھا نہیں جس میں خدا کے سامنے جھکنا نہ ہو۔

تو ایک بات تو یہ ہے کہ وہ کسی قسم کا سمجھوتہ (COMPROMIZE) نہیں کرتے، وہی زبان، وہی الفاظ بولتے ہیں، جو ان کے پیغام اور کار رسالت سے مناسبت رکھتے ہیں، آخرت کی صاف صاف دعوت دیتے ہیں، جنت و دوزخ کو پیش کرتے ہیں، ایمان بالغیب کا مطالبہ کرتے ہیں، ان کے زمانہ نیں بھی مختلف فلسفے ہوتے ہیں، ان کے زمانہ میں بھی مختلف گروہوں کی مخصوص اصطلاحات ہوتی ہیں، وہ اس سے ناواقف نہیں ہوتے، ان کے زمانہ کے بھی رائج الوقت سکے ہوتے ہیں، وہ ایسا ایک سکہ بھی استعمال نہیں کرتے، صاف بات کہتے ہیں، اللہ پر ایمان لاؤ، اس کی صفات پر، اس کے افعال پر ایمان لاؤ، اس کے ملائکہ پر ایمان لاؤ تقدیر پر ایمان لاؤ حشر نشر، حیات بعد الموت پر ایمان لاؤ، اگر ایسا کرو گے تو تمہیں جنت ملے گی، ایک مرتبہ بھی نہیں کہتے کہ تمہیں حکومت ملے گی، ہمیشہ یہ کہتے ہیں، تمہیں جنت ملے گی، خدا کی رضا ملے گی، خدا تم سے راضی ہوگا، قرآن و حدیث میں مجھے کہیں نہیں ملتا کہ دین کی دعوت قبول کرنے سے تم کو دنیا میں علو و اقتدار حاصل ہوگا، اگر کہیں حکومت اور امن و حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے تو اس کا انداز یہ ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ اٰمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ

وَلیبدلنّھُم مِن بَعدِ خوفِھِم اَمنًا یَعبُدُونَنِی لَا یُشرِکُونَ بِی شَیئًا وَمَن کَفَرَ بَعدَ ذٰلِکَ فَاُولٰئِکَ ھُمُ الفٰسِقُونَ (النور: ۵۵) اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے، جو تم میں سے ایمان لائے، اور نیک عمل کئے کہ انھیں ضرور ملک کی حکومت عطا کرے گا، جیسا کہ ان سے پہلوں کو عطا کی تھی، اور ان کے لئے جس دین کو پسند کیا ہے، اسے ضرور مستحکم کردے گا اور البتہ ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا، وہ میری عبادت کریں گے (اور) میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے، اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بد کردار ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

اَلَّذِینَ اِنْ مَّکَّنّٰھُم فِی الارضِ اَقامُوا الصَّلوٰۃَ واٰتوا الزَّکوٰۃَ۔ (الحج۔۴۱) وہ لوگ اگر ہم انھیں دنیا میں حکومت دے دیں، تو نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں۔

یعنی یہ اقامتِ صلوۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ جو ہے، یہ مقصود ہے، ذریعہ نہیں ہے، اس کے راستہ سے حکومت الٰہی تک نہیں پہونچنا ہے، بلکہ حکومت الٰہی کے ذریعہ سے اس کی طرف بڑھنا ہے، اس کے لئے زیادہ سے زیادہ ماحول سازگار کرنا ہے پھر ان کو رائج کرنا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ وہ اپنے دین کے مقاصد، مبادی و حقائق اور عقائد کے بارے میں حد درجہ کے غیور، بلکہ ذکی الحس ہوتے ہیں، اور اس میں ذرا سی بھی تبدیلی و تحریف گوارہ نہیں کرتے۔

جب مدینہ والوں نے بیعت عقبہ میں پوچھا کہ یارسول اللہؐ ہم آپ کا ساتھ دیں گے، اور آپ کی پوری نصرت کریں گے تو ہمیں ملے گا کیا؟ آپ کے لئے بڑا آسان تھا (اور اس کے قرائن موجود تھے) کہ ارے بھائی ہم آجائیں گے اور تم ہمارے ساتھ مل جاؤ گے، تو بادشاہت قائم کرلیں گے، ایک اسٹیٹ بن جائیگا، اس

لئے کہ تم منتشر ہو، ہماری وجہ سے وحدت پیدا ہو جائیگی، تم کمزور ہو طاقت آئیگی، لیکن اس کے جواب میں فرمایا تو یہ فرمایا کہ اللہ کی رضا حاصل ہو گی۔

اس کی ایک مثال اور دیتا ہوں، جبلہ ابن ایہم ایک بڑا عرب سردار تھا، غسانی ریاست ملک شام میں ایک پورا اسٹیٹ تھا، ایسے ہی جیسے برطانوی عہد میں ہمارے یہاں حیدرآباد وغیرہ کی ریاستیں تھیں، وہ اسلام لایا تو ہزاروں اس کے ساتھ مسلمان ہوئے، مکہ آیا تو طواف کرنے لگا، ایک معمولی عرب بدو بھی طواف کر رہے تھے، طواف میں اس کا شاہی لباس چادر لٹک رہی تھی، جیسا کہ بڑے آدمیوں کا دستور تھا، اس پر اس بدو کا پاؤں پڑ گیا، چادر گر گئی تو اتنا جسم کا حصہ اس کا کھل گیا، اس نے اس بدو کے ایسے زور سے تھپڑ مارا کہ بدو کی ناک کا بانسہ ٹوٹ گیا، بدو کی یہ ہمت تو نہیں ہو سکتی تھی کہ وہیں تھپڑ مارتا، اس نے حضرت عمر فاروقؓ امیر المؤمنین کے پاس شکایت کی اور کہا کہ جبلہ ابن ایہم نے مجھے تھپڑ مارا ہے، حضرت عمرؓ نے کہا کہ قصاص ضروری ہے، لوگوں نے کہا کہ اس کا تو مسلمان رہنا مشکل ہے، فرمایا کہ اس کی پروا نہیں! جبلہ نے کہا کہ میں تو ایسے دین میں نہیں رہ سکتا، جہاں میری ایسی بے حرمتی ہو، وہ چلا گیا، لیکن حضرت عمرؓ کی پیشانی پر شکن بھی نہیں آئی، جائے، وہ جانے اس کا کام جانے، لیکن ہم حکم الٰہی کو نہیں بدلیں گے، حضرت اسامہؓ نے سفارش کی کہ فلاں معزز قبیلہ کی عورت نے چوری کی ہے، اس پر یا رسول ﷺ حد جاری نہ ہو، آپ نے فرمایا "لوان فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت یدھا" اگر فاطمہ بنت محمد اعاذھا اللہ تعالیٰ، کا ہے کو ایسا ہوتا، کبھی نہ ہوتا بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹتا، فرمایا کہ اللہ کے حدود میں سفارش کرتے ہو، اور اتنا فرمایا کہ حضرت اسامہؓ دہل گئے، پھر کچھ نہ کہا اور حد

جاری ہوئی۔

تو ایک بات یہ ہے کہ انبیاءؑ دین کو اسی طرح پہونچاتے ہیں، انھیں اصطلاحات کے ساتھ پہونچاتے ہیں، جو پیغمبروں کی دعوت اور آسمانی کتابوں میں آئے ہیں، بلکہ الفاظ تک کا تحفظ کرتے ہیں، اور دین کی تعبیر ایسی نہیں کرتے کہ جس سے یہ خیال ہو کہ بہت سے لوگ تو پڑھے لکھے ہیں، بہت ذہین ہیں کھینچ کر چلے آئیں گے، بالکل جیسی چیز ان کو ملتی ہے ویسی ہی چیز ان کے سامنے رکھ دیتے ہیں، لیکن حکمت کے ساتھ، ان کا عمل اس آیت پر ہوتا ہے: اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (النحل. ۱۲۵) اپنے رب کے راستہ کی طرف دانشمندی، اور عمدہ نصیحت سے بلاؤ۔

لیکن اس میں یہ خطرہ مول نہیں لیتے کہ ذہن ایک دوسرے رخ پر چلا جائے، یہ نبوی مزاج ہے، اور یہ دین جو اس وقت تک محفوظ رہا ہے، وہ خدا کے فضل کے بعد اسی وجہ سے ہے کہ امت کے ہر دور میں علمائے ربانی اس کی حفاظت کرتے رہے، انھوں نے اس کی روح کی بھی حفاظت کی، مراتب کی بھی حفاظت کی کہ دین میں جس حکم، جس رکن کا جو مقام ہے، وہ باقی رہے، جو چیز جس مقام کی ہے وہیں رکھی جائے، عبادت عبادت ہے، فرائض فرائض ہیں، ارکان ارکان ہیں، ایمانیات ایمانیات ہیں، آخرت آخرت ہے، انھوں نے دنیا کو آخرت پر غالب ہونے نہیں دیا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ امت میں بے عملی ہے، ہم سب بھی خطاکار اور کمزور مسلمان ہیں، لیکن یہ دین محفوظ ہے، آج تک دین میں تحریف نہیں ہو سکی، اس کے برخلاف عیسائی کلیسا کے ذمہ داروں، اور بائبل کے شارحین نے اپنے زمانہ کے بعض جدید نظریات بائبل میں شامل کر لئے، بائبل میں شامل نہ ہو سکتے تو اس کی

شرح اور اس کی تفسیر میں ان کو شامل کر لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ نظریہ بدلا تو بائبل بھی متزلزل و مشکوک اور ساقط الاعتبار ہو گئی، بائبل کی تفسیر میں انھوں نے لکھدیا کہ زمین چپٹی ہے، اس لئے کہ اگر چپٹی نہ ہو گول ہو تو خدا کا دیدار قیامت کے دن سب کو کیسے ہوگا؟ بائبل کی یہ تشریح غلط ثابت ہو گئی، اور زمین کی کرویت کا نظریہ تسلیم کر لیا گیا، بائبل پر بھی قدرتاً اس کا اثر پڑا، اس کی حقانیت پر، اس کے منزل من اللہ اور کلام الٰہی ہونے پر بھی اثر پڑا۔

"آخری بات عقیدۂ آخرت کا اہتمام ہے، وہ انبیائے کرام کی دعوت کا بنیادی نقطہ ہے، جو لوگ انبیائے کرام کے اقوال واحوال کے مطالعہ میں زندگی گذارتے ہیں، اور ان کے کلام کا صحیح ذوق رکھتے ہیں، وہ صاف محسوس کرتے ہیں کہ جیسے آخرت ہمیشہ ان کی نظروں کے سامنے ہوتی ہے، اور اس کی تصویر (نعمت و مصیبت، اور سعادت و شقاوت کی تمام تفصیلات کے ساتھ) ان کی آنکھوں کے سامنے کھڑی رہتی ہے، وہ ہمہ وقت جنت کے شدید اشتیاق، اور جہنم سے شدید خوف کے عالم میں رہتے ہیں یہ بات ان کے لئے بالکل مشاہدہ، اور ایک واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے، جو ان کے شعور واحساس اعصاب اور قوت فکر یہ پر غالب آجاتا ہے۔

آخرت پر ایمان اور وہاں ملنے والی ابدی سعادت اور لازوال شقاوت اور ان تمام انعامات (جنھیں اللہ نے اپنے نیک بندوں کے لئے مہیا کر رکھا ہے) اور تمام عذابوں (جو نافرمان کافروں کے لئے تیار کئے گئے ہیں) کا ہمہ وقت نگاہوں کے سامنے ہونا، یہی انبیائے کرام کی دعوت، اور ان کی پند و نصیحت کا اصل محرک تھے، یہی ان کو پریشان کرتا رہتا ہے، ان کی آنکھوں سے نیند اڑا دیتا ہے، ان کی پر سکون و پاکیزہ زندگی کو مکدر کر دیتا ہے، اور ان کو کسی حالت میں سکون، اور کسی پہلو قرار

نہیں ملتا، نگاہوں کے سامنے پھیلے ہوئے شر و فساد، حالات کی ابتری، اور ماحول میں خرابیوں کے پروان چڑھنے کی صورت میں بھی (جس سے وہ سخت اذیت محسوس کرتے ہیں) ان کے دل و دماغ پر سب سے زیادہ اثر انداز، اور ان کے لئے سب سے طاقتور محرک یہی فکر آخرت ہے، اور وہ اسی کو اپنی دعوت و تبلیغ کی اصل وجہ، اور خوف و اضطراب کا اصل سبب قرار دیتے ہیں"

پھر وہی شروع کی بات میں عرض کرتا ہوں کہ یہ دین جو ہم کو ملا ہے، یہ دانشوروں سے نہیں ملا ہے، مصنفوں سے نہیں ملا، مفکروں سے بھی نہیں ملا، سیاست دانوں سے بھی نہیں ملا، حکماء اور فلاسفہ سے بھی نہیں ملا، یہ ملا ہے پیغمبروں سے، اس لئے ہر بات میں ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اس موقعہ پر پیغمبر ہوتا تو کیا کہتا، نبی ہوتا تو کس زبان میں بات کرتا، کس چیز کی دعوت دیتا، اس کی دعوت میں کس چیز کا تناسب کیا ہوتا، مجھے امید ہے کہ جو حضرات محض طالبِ دین ہیں، وہ اسی کو معیار بنائیں گے، اور ہمیشہ اسی کو پیش نظر رکھیں گے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا (الفرقان. ۷۳) اور وہ لوگ جب انھیں ان کے رب کی آیتوں سے سمجھایا جاتا ہے، تو ان پر بہرے اندھے ہو کر نہیں گرتے۔

میں آپ کا شکر گذار ہوں، اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو سب کو توفیق دے، اور ہمیں استقامت عطا فرمائے، اور ہم جب اس کے سامنے حاضر ہوں، تو ہم سرخرو ہوں، وہی آیت مبارکہ جس سے اس مجلس کا افتتاح کیا گیا ہمارے پیش نظر رہنی چاہئے: يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ

وُجُوهُهُم فِفِي رَحْمَةِ اللّٰهِ هُم فِيهَاخٰلِدُونَ(آل عمران.۱۰۶.۱۰۷جس دن بعضے منہ سفید ،اور بعضے منہ سیاہ ہوں گے ،ان سے کہا جائیگا ، تم ایمان لاکر کافر ہوگئے تھے ،اب اس کفر کے بدلہ میں عذاب چکھو ،اور وہ لوگ جن کے منہ سفید ہوں گے تووہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے ،وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اے اللہ! ہمیں ان لوگوں میں شامل فرما جن کے متعلق تو نے فرمایا ہے :وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُم فِفِي رَحْمَةِ اللّٰهِ هُم فِيهَا خٰلِدُون (آل عمران .۱۰۷)اور وہ لوگ جن کے منہ سفید ہوں گے تووہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے ،وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین.



مسلمان کی اصل طاقت و قیمت، ایمان و سیرت ہے

رانی پورہ مین روڈ اندور کے جلسۂ
عام میں ۲۶ر نومبر ۱۹۸۳ء بروز جمعہ بعد
نماز عشاء کی گئی مفکر اسلامؒ کی ایک شاہکار
تقریر۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسلمان کی اصل طاقت و قیمت، ایمان و سیرت ہے

حمد و صلوٰۃ کے بعد!

یٰاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا وَّیُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَیَغْفِرْلَکُمْ وَاللّٰہُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِیْمِ (الانفال. ۲۹) مومنو! اگر تم خدا سے ڈرو گے، تو وہ تمھارے لئے امر فارق پیدا کر دے گا، (یعنی تم کو ممتاز کر دے گا) اور تمھارے گناہ مٹا دے گا، اور تمھیں بخش دے گا، اور خدا بڑے فضل والا ہے۔

بھائیو اور دوستو! آپ حضرات جانتے ہیں کہ مسلمان کی دو حیثیتیں ہیں، ایک حیثیت عام انسان کی ہے، جس قانون اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے ضابطہ کے مطابق سب انسان دنیا میں آتے ہیں، وہ بھی دنیا میں آیا ہے، وہی اعضائے انسانی، وہی جسم اور جسم کے تقاضے، جسم کی کمزوریاں، جسم کی بیماریاں لے کر کے آیا ہے، جو انسانوں میں مشترک ہیں، قانون فطرت اس کے ساتھ بھی لگا ہوا ہے، وہ بچہ سے جوان ہوگا، جوان سے بوڑھا ہوگا، پھر ایک وقت عمر طبعی کو پہونچنے کے بعد (اگر اللہ کو منظور ہوا) اس کا اخیر وقت بھی آئیگا اور وہ کیسا ہی عبادت گذار، خدا ترس، کیسا ہی زبردست عالم فاضل ہو، مصنف ہو، مفکر ہو، فلسفی ہو، دانشور ہو، شیخ طریقت ہو،

صاحب کشف وکرامات ہو، اس کو دنیا سے جانا ہے ،"انك میت وانهم میتون" اللہ تعالیٰ نے یہ صاف فرمایا ہے، تو پھر مسلمان کا استثناء کیسے ہو سکتا ہے۔

مسلمان کے دو وجود

ایک وجود مسلمان کا انسانی وجود ہے، فطری وجود ہے، جسمانی وجود ہے، اس کے لحاظ سے وہ عام انسانوں کی طرح ہے ،اس کو کھانے کی بھی ضرورت ہے، کمانے کی بھی ضرورت ہے، کھانے کے لئے کمانے کی ضرورت، کمانے کے لئے کھانے کی ضرورت ہے، سونے کی، صحت کا خیال رکھنے کی، حفظان صحت کے اصولوں پر چلنے کی ضرورت ہے، بیمار ہو جائے، تو دوا علاج کی ضرورت ہے، کمزور ہو جائے تو اچھی غذا اور طاقتور دواؤں کی ضرورت ہے، سردی میں سردی کا لباس پہننے کی ضرورت ہے، گرمی میں گرمی کا لباس رکھنے کی ضرورت، مکان کی ضرورت اور سیکڑوں ضرورتیں ہیں، جو اس کے ساتھ لگی ہوئی ہیں، یہ اس کا انسانی وجود ہے، اس میں وہ قانونِ قدرت کے ماتحت ہے، اسی طرح سے وہ قانون قدرت کا غلام ہے، جیسے دنیا کے تمام انسانی وجود، اور نوع انسانی کے تمام افراد، آدم کی ساری اولاد ہے کوئی استثناء اس میں نہیں ہے، یہاں تک کہ خدا کے پیغمبر بھی کھاتے پیتے تھے، اور یہ طعنہ دیا گیا تھا

"مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْاَسْوَاقِ" (یہ کیسا رسول ہے، کھاتا پیتا ہے، اور بازار میں چلتا پھرتا ہے) اس لحاظ سے مسلمان میں کوئی ایسی غیر معمولی طاقت اور کوئی ایسا امتیاز نہیں ہے کہ دنیا میں دوسرے ذلت کے ساتھ رہیں اور وہ عزت کے ساتھ رہے، دوسرے ناکام ہوں اور وہ ہمیشہ کامیاب ہو، دوسرے مفتوح ہیں، اور وہ ان سب کا فاتح ہو، دوسرے محکوم ہوں وہ ان کا حاکم ہو،

اور زمین، آسمان اور کائنات ساری اس کے ارادے اور اس کی منشا کا احترام کرے، اس کے لئے راستہ صاف کرے، سمندر اس کے لئے پایاب ہو جائیں، دریاؤں میں سے راستہ اس کے لئے نکال دیا جائے، پہاڑ اس کا راستہ روکنے سے ہٹ جائیں، اس میں مسلمان کے (جیسا ہمارے یہاں کہتے ہیں) کچھ سرخاب کے پر نہیں لگے ہیں، قانون قدرت اس پر ویسے ہی جاری وساری ہوگا، جیسے تمام انسانوں وجودوں اور تمام انسانی اجسام پر جاری ہوا کرتا ہے، غلطی کریگا سزا پائیگا، بدپرہیزی کرے گا بیمار ہو جائیگا، کمزوری دکھائے گا، مار کھائیگا، آنکھ جھپکے گی پٹ جائیگا، ہاتھ پاؤں نہیں چلائے گا، محنت نہیں کرے گا، تو بھوکوں مرنے لگے گا، اس میں اس کے اور انسانی کنبہ کے دوسرے افراد میں کوئی فرق نہیں۔

لیکن ایک دوسری حیثیت ہے، وہ حیثیت اگر اس کے ساتھ قائم ہو جائیگی تو پھر وہ انسان رہتے ہوئے بھی کچھ اور چیز بن جاتا ہے، پھر اس کا معاملہ براہ راست اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہو جاتا ہے، پھر وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر بن جاتا ہے اس کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے قانون کی جو ہزاروں لاکھوں برس سے چلے آرہے ہیں، بعض اوقات معطل، بعض اوقات مؤخر کر دیتا ہے، اور اس کو غالب کرتا ہے، اس کو عزت دیتا ہے، اس کو فتح عطا فرماتا ہے، اس کو نیک نامی بخشتا ہے، اس کو فاتح اور منصور بناتا ہے، یہ حیثیت ارادی اور اضافی ہے، یعنی اس کے لئے فیصلہ اور اضافہ کی ضرورت ہے، کوئی اپنے ساتھ لے کر کے نہیں آتا اس کو ماں کے پیٹ سے، جہاں سے جسمانی اعضاء لایا ہے ایسے ہی ایمان اور شریعت کی پابندی بھی لایا ہے، اس کو کسی ارادہ کی، فیصلہ کی ضرورت نہیں، وہ تو اس کے ساتھ گویا جسم کا ایک حصہ ہے، اب اسے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، یہ بھی ایک موروثی اور پیدائشی چیز ہے،

ایسا نہیں ہے۔

ٹارچ کی قیمت اس کے سیلز سے ہے

اس کی موٹی سی مثال میں آپ کو دیتا ہوں، یہ ٹارچ ہے، اس میں سیلز رکھے جاتے ہیں، اگر قسمت سے سیلز رکھ دیئے گئے، اور مسالہ بھر دیا گیا تو اس ٹارچ میں اور اس ٹارچ میں جو خالی ہے، زمین وآسمان کا فرق ہوگا، یہ ٹارچ کہلائے گی، یہ اندھیرے میں اجالا کردے گی، روشنی کا ایک تیز دھارا اس میں سے نکلے گا، یہ ہاتھ میں ہوگی تو آدمی ٹھوکر کھانے سے بچے گا، دیوار سے ٹکرا جانے سے بچے گا، کسی سوتے ہوئے بچہ پر پاؤں رکھ کر چلے جانے سے بچے گا، اور معلوم ہوگا کہ اس کے ساتھ ایک بڑی طاقت ہے۔

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا. (الانعام. ۱۲۲) بھلا جو (پہلے) مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کے لئے روشنی کردی، جس کے ذریعہ سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے، کہیں اس شخص جیسا ہو سکتا ہے، جو اندھیرے میں پڑا ہوا ہو، اس سے نکل ہی نہ سکے؟

اللہ تعالیٰ نے (جیسے کوئی ہچے کر کے بتاتا ہے) ہچے کر کے بتایا ہے، اور دو اور دو چار اس طریقہ سے سمجھایا ہے، بھلا وہ جو مردہ تھا "اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ" ہم نے اس کو زندہ کیا، اور اتنا ہی نہیں "وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ" ہم نے اس کو ایک روشنی عطا کی جس کے سہارے سے وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے "كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا" کیا وہ اس کی طرح ہو سکتا ہے کہ جو اندھیروں میں بھٹکتا ہے پھرتا ہے، نکلنے کا اس کو کوئی

راستہ ہی نہیں ملتا۔

مسلمان پر بھی فطری واخلاقی قانون نافذ ہے

مسلمان بحیثیت انسان کے عام انسانوں کی طرح ہے، اس کی کوئی ضمانت نہیں ہے، کوئی ٹھیکہ نہیں ہے، خدا کی طرف سے کوئی ذمہ نہیں ہے، کہ وہ غلطی کرے جب بھی ٹھیک، اس کی چت بھی اور پٹ بھی چت، خدا کے یہاں اندھا قانون نہیں ہے، جیسے انسانوں کے یہاں کا ہوتا ہے، کہ برہمن کے یہاں پیدا ہو گیا تو برہمن ہے، کوئی اس کو شرف وعزت سے محروم نہیں کر سکتا، وہ الٹا کرے تو سیدھا، اور سیدھا کرے تو سیدھا، بس اس کی ہر بات برہمن کی بات ہے، برہمن کی بات ہی اور ہوتی ہے، میں سیدوں کا، شیوخ کا نام بھی لے سکتا ہوں، آپ سید صاحب ہیں، سید کے گھر پیدا ہوئے ہیں، اب ان کے ستر خون معاف ہیں، اب یہ جو چاہیں کریں، ظلم کریں تو ظلم نہیں، جرم کریں تو جرم نہیں، غلطی کریں تو غلطی نہیں، دو دو چار کہنے کے بجائے پانچ کہیں تو ماننا چاہئے، اس لئے کہ سید صاحب نے کہا ہے کہ دو دو مل کر پانچ ہوتے ہیں، یہ کسی معمولی آدمی نے نہیں کہا، ان کے اندر سارے اخلاق رذیلہ پائے جائیں، ان کے اندر قساوت ہو، سنگدلی، ظلم کا مادہ ہو، کوئی حرج نہیں، میں سب پر ایک حکم نہیں لگاتا، میں یہ کہتا ہوں کہ یہ تصور جو کسی اونچے خاندان میں پیدا ہو جائے تو پھر وہ دنیا سے الگ ہے، اور اس پر خدا کا قانون اور عقل کا قانون نہیں چلتا، وہ قانون سے بالاتر ہے، جیسے شاہانِ ایران جن کے یہاں سیکڑوں برس سے موروثی سلطنت چلی آرہی تھی، کیانی خاندان تھا، ساسانی خاندان تھا، رومن ایمپائر کے جو تاجدار ہوا کرتے تھے، وہ ماں کے پیٹ سے شہزادے ہی ہو کر پیدا ہوا کرتے تھے۔

اسلام کا معاملہ، اور خدا کے دین کا معاملہ یہ نہیں ہے، ایمان اور تقویٰ ایک ارادی واضافی چیز ہے جو بالارادہ ہوتا ہے، اور اس کا اضافہ کیا جاتا ہے۔

پاور ہاؤس سے کنکشن ضروری ہے

دیکھئے یہ بلب ہے، یہ وائرنگ ہے، وائرنگ بالکل صحیح ہے، لیکن اس کا پاور ہاؤس سے کنکشن نہیں ہے، اور وہ کرنٹ اس میں نہیں آتا تو اگر اس کی وائرنگ آپ ریشم کی کریں، اور سونے کے تار لگائیں، لیکن کنکشن نہیں ہے، بجلی کی رواس میں نہیں آرہی ہے تو سب بیکار ہے، روشنی ہے، نہ کوئی فائدہ ہے، معاملہ ٹارچ میں سیلز اور مسالہ رکھنے کا ہے، یہ مسالہ بارگاہ نبوت سے ملتا ہے، اس کے لئے ایک ہی جگہ، ایک ہی ٹھکانہ ہے، حضور ﷺ کی بعثت کے بعد اب وہ سیلز اور کہیں نہیں مل سکتے، نہ امریکہ میں، نہ روس میں، نہ دنیا کے کسی کارخانہ میں، وہ ایمانی سیلز رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں، وہ اگر آپ ٹارچ میں رکھتے ہیں، فٹ کر دیتے ہیں، تو ذرا سا بٹن دبائیے، ذرا سا ہاتھ کا اشارہ کیجئے اور روشنی کی ایک تیز رَو نکلے گی، جس سے آپ کو بھی راستہ نظر آئیگا، دوسروں کو بھی راستہ نظر آئیگا، اور اس کی یہی قیمت ہے اور یہی اسلام کی شان ہے کہ جب وہ سیلز بھر دیئے جاتے ہیں، تو صرف اس مسافر ہی کو جس کے ہاتھ میں وہ ہے جو اس کا ملک ہے، اسی کو راستہ نظر نہیں آئیگا، بلکہ بیسیوں جو بالکل اندھوں کی طرح راستہ چل رہے تھے، ان کو بھی راستہ نظر آنے لگے گا، یہ ہے مسلمان کی شان۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا (الانفال ۔ ۲۹) اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرو گے اور اس سے شرم کرو گے اس کا لحاظ کرو گے، اور اس کے احکام کا احترام کرو گے، اس کی شریعت کو قبول کرو گے، اس پر چلنے کا فیصلہ کرو گے،

اس پر عمل کرنا شروع کروگے، تو وہ تمھارے لئے امر فارق پیدا کردے گا (یعنی تم کو ممتاز کردیگا)۔

مابہ الامتیاز صفت

فرمایا "یَجْعَل لَکُم فُرقَانًا" اللہ تم کو ایک مابہ الامتیاز چیز عطا کرے گا، تمھاری سطح ایک دم سے بلند ہو جائیگی، تم اس پستی سے، ماحول کی خرابی سے نکل جاؤ گے، جب انسان اپنے کو اللہ کی روشنی سے محروم کرلیتا ہے، تو پھر اس کا کیا حال ہوتا ہے؟ وہ اس ٹارچ کی طرح ہو جاتا ہے، جس کے سیلز ختم ہو چکے، یا اس میں رکھے نہیں گئے، اب اس سے تو یہ لکڑی، اچھی کہ اس سے ہم کتے کو مار سکتے ہیں، اس سے اپنا دفاع کرسکتے ہیں، اپنی حفاظت کرسکتے ہیں، اس ٹارچ سے تو یہ کام بھی نہیں کرسکتے، ٹارچ کی ساری قیمت اس کے سیلز ہیں، اس کو نکال دیجئے تو اس سے لاٹھی اچھی، بندوق کے اندر کارتوس ہے، تو وہ بندوق، بندوق ہے، اس کی بڑی قیمت ہے، آپ شیر کا شکار کرسکتے ہیں، لیکن اگر اس کے اندر کارتوس نہیں رکھا جاسکتا، یا کارتوس ہی خالی ہے، تو اس سے لاٹھی اچھی، جب مسلمان کے سیلز ختم ہو جائیں، جب اس کے اندر سیلز رکھے ہی نہ جائیں، یا وہ اپنی ناقدری سے، کفران نعمت سے ان سیلز کو بیکار کردے تو پھر مسلمان میں اور غیر مسلم میں کیا فرق؟ پھر تو وہ غیر مسلم جو اس سے زیادہ مضبوط ہے، اچھا ہے، اس سے زیادہ پیسے والا ہے، وہ اچھا ہے، اس سے بڑی کوٹھی رکھنے والا ہے، وہ اچھا ہے، جس کی موٹر اس سے اچھی ہے وہ اچھا، اور بعض اوقات تو ایسا ہو سکتا ہے کہ اس کے گھر کا کتا بھی اس سے اچھا کھاتا ہو، جیسے بہت سے انگریزوں کے یہاں کتے پلے ہوئے ہوتے ہیں۔ جن کو وہ ملتا ہے، جو اچھے اچھے انسانوں کو نہیں ملتا، بات صرف ہاتھ پاؤں، کان، ناک، آنکھ کی اور

صورت شکل کی، اور انسان کے نام کی نہیں، جس میں جسمانی طاقت زیادہ ہوگی، وہ اس سے بڑا، جس کے پاس اونچی کوٹھی ہوگی وہ اس سے چڑھا، پھر تو سارا معاملہ اس پر آگیا کہ کس کے پاس پیسے زیادہ ہیں، کس کے پاس طاقت زیادہ ہے۔؟

مسلمانوں کی اصل طاقت

ہم مسلمانوں کی جو اصل خصوصیت، ہمارا مابہ الامتیاز، ہمارا سرمایہ، ہمارا فخر، ہماری طاقت وہ سیلز تھے، جو رسول اللہ ﷺ اللہ کے یہاں سے لے کر آئے ہیں، اور انسانوں کے دماغ اور انسانوں کے دل کے اندر رکھے، دماغ میں بھی سیلز رکھے ہیں، اور دل میں بھی، ایمان کا کچھ تعلق انسان کے ضمیر اور قلب سے ہے، کچھ انسان کے دماغ اور فکر سے ہے، اس سے خاص طرح کے اخلاق پیدا ہوتے ہیں، خاص طرح کا طرز عمل، زندگی کا رویہ اور مسلک پیدا ہوتا ہے، خاص طرح کے برتاؤ کرنے کا طریقہ آتا ہے، خالق کی معرفت ہوتی ہے، مخلوق سے محبت ہوتی ہے، خدا کا خوف ہوتا ہے، بندوں کی شرم ہوتی ہے، اللہ کا ڈر اور اس کی محبت ہوتی ہے، اور انسانوں کے ساتھ ہمدردی ہوتی ہے، غریبوں پر آدمی رحم کھاتا ہے، بے ایمانی سے بچتا ہے، چوری سے پناہ مانگتا ہے، اس کو جرائم سے، ظلم سے گھن آتی ہے، بالکل سیرت ہی بدل جاتی ہے، یہ کس کا کرشمہ ہے، یہ ان سیلز کا کرشمہ ہے۔

معنوی خودکشی

مسلمان اپنے کو سیلز سے محروم کردے تو یہ معنوی خودکشی ہے، جیسے کوئی زہر کھا کر مرجائے، یا کوئی گلے میں پھندا ڈال کر کے اپنا گال گھونٹ لے، مسلمان ہے، لیکن اس کے اندر ایمان کے وہ سیلز نہیں ہیں، عقیدہ کے وہ سیلز نہیں ہیں، وہ "فرقان" نہیں ہے، جس کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

یٰاَیھا الَّذِینَ امنوُ اِنْ تَتقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَکُم فُرقَانًا (الانفال. ۲۹) مومنو اگر تم خدا سے ڈرو گے تو وہ تمھارے لئے امر فارق پیدا کر دیگا۔

اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرنے لگو گے، اور احتیاط کی زندگی گذارو گے، آپ کی لائی ہوئی تعلیمات پر عمل کرو گے، ادھر چلو، ادھر چلو ادھر مت چلو، اس راستہ چلو، اس راستہ نہ چلو، اس لکیر کو نہ چھوڑو، یہ سرحد پار نہ ہونے پائے، اس کا نام تقویٰ ہے، تقویٰ کے معنی بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو نماز ہی نماز پڑھتا چلا جائے، رات کو پلک سے پلک نہ لگے، اس کو لوگ متقی کہتے ہیں، تقویٰ کے معنی یہ ہیں کہ جن چیزوں سے اللہ اور اس کے رسولؐ نے منع کیا ہے اس سے بچیں، اس کے تصور سے خیال بھی آجائے تو خدا کی پناہ مانگیں، اور جن چیزوں کا حکم دیا ہے، ان کی پابندی کریں، ہفت اقلیم کی سلطنت مسلمانوں کو مل جائے، ان کے قدموں پر بادشاہوں کے تاج رکھدیئے جائیں، اور قارون کا خزانہ ان کو مل جائے لیکن ان کے اندر وہ سیلز نہ ہوں، نبوت کی لائی ہوئی روشنی نہ ہو، وہ فرقان نہ ہو، جو اللہ تعالیٰ دین پر چلنے والوں کو عطا کرتا ہے، تو دو کوڑی کی قیمت نہیں، مسئلہ بہت صاف اور بہت ہی واضح ہے، میں کوئی پہیلی نہیں بجھا رہا ہوں، ہماری آپ کی ساری طاقت، سارا امتیاز، اللہ کے یہاں بھی جو مرتبہ اور مقام ہے، اور مخلوق کی نگاہ میں بھی جو وزن اور طاقت ہے، وہ سب ان سیلز کے صدقہ میں ہے، سیلز سلامت سب کچھ سلامت، عقیدہ سلامت، یہ دل سلامت سب سلامت، یہ دماغ سلامت سب سلامت، عقیدہ سلامت، اخلاق سلامت مسلمان مسلمان ہے، نہ پہاڑ اس کا راستہ روک سکتے ہیں اور نہ سمندر۔

ایمان وسیرت کی کرامت

میرے بھائیو! بات یہ ہے کہ یہ سب سیلز کی کرامت ہے، یہ مسالہ جو اس کے اندر بھرا ہوا ہے، ایمان کا مسالہ، عقیدہ کا مسالہ، اخلاق کا مسالہ مقاصد کا مسالہ، ہمارا عقیدہ الگ، ہمارا ایمان الگ، ہمارے اخلاق الگ ہونے چاہئیں، پھر کیا ہوگا، "یجعل لکم فرقانا" اللہ تم کو ایسی مابہ الامتیاز چیز بخشے گا کہ دور سے پہچانے جاؤ گے، جہاں جاؤ گے تمھاری عزت ہوگی، مسلمانوں کا کیا حال تھا، آبادیوں کی آبادیاں بلاتی تھیں، آج کتنے ملک فتح ہوئے ہیں، جہاں کی آبادی نے بلایا تھا مسلمانوں کو، تاریخ والوں نے پوری حقیقت لکھی نہیں، بیان نہیں کی، اب بہت سی حقیقتیں سامنے آرہی ہیں، مصر کے لوگوں نے بلایا تھا، دعوت دی تھی عربوں کو کہ آؤ ہمیں اس مصیبت سے نجات دو کہ ذرا سا اختلاف ہے عقائد کا، ہمارا اور رومیوں کا تو ہم سے وہ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کرتے ہیں، الفرڈ بٹلر ALFRED BUTLER کی کتاب ہے "**عربوں کا مصر فتح کرنا**" اس نے لکھا ہے کہ بوروں میں بھر بھر کر رومی ان قبطیوں کو سمندر میں ڈال دیتے تھے، کیوں؟ محض اس لئے کہ ان میں اور رومیوں میں حضرت عیسیٰ کے بارے میں کچھ اختلاف تھا، کہ بالکل وہ خدا کی طرح ہیں، بالکل وہ خدا کا جزء ہیں، یا انسان ہیں، اور ان میں تھوڑی سی خدائی بھی ہے، اس میں اختلاف تھا تو اتنا بڑا ظلم ہوتا تھا کہ کوئی حد نہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ ان قبطیوں نے دعوت دی تھی، اور کہا تھا کہ خدا کے لئے آؤ، اور ہمیں چھڑاؤ ایسے معلوم نہیں کتنے ملک تھے، اور جب مسلمان کہیں کسی فوجی مصلحت سے کسی صوبہ کو، کسی شہر کو چھوڑتے تھے، تو لوگ دھاڑیں مار مار کر روتے تھے اور کہتے تھے کہ تم کیوں ہمیں چھوڑ کر جارہے ہو، اور ان ظالموں کے حوالہ کر رہے ہو اور جب وہ کہتے تھے کہ نہیں ہم پھر آئیں گے تو کہتے تھے کہ اللہ تم کو جلد لائے، اور

دعائیں کرتے تھے۔

ہندوستان پر ہمارا حق اور اس کی ذمہ داری

میرے مسلمان بھائیو! تم کو اس ملک میں رہنا ہے، تمھارا حق اس سرزمین پر ہے، تم نے اس ملک کو بنایا، سنوارا، تم نے اس ملک کو تہذیب سے، تمدن سے اور ترقیوں سے مالا مال کر دیا، تمھارے اوپر بھی اس ملک کا احسان ہے، اس نے تمھیں ایسے آڑے وقت میں پناہ دی، اور یہ فیاض ملک ثابت ہوا، جب پناہ نہیں مل رہی تھی، جب تاتاری ایران اور ترکستان کے باغ بہار شہروں پر حملہ کر رہے تھے، اور شہر کے شہر بے چراغ ہو رہے تھے، اس وقت بڑے بڑے مسلمان خاندان یہاں آئے، اور اس ملک نے اپنے بازو پھیلا دیئے، اپنی گود خالی کر لی تو ہمارے اوپر اس ملک کا حق ہے، اور اس ملک پر ہمارا حق ہے، دنیا کی کوئی طاقت ایسی نہیں ہے، جو بیچ میں کھڑی ہو جائے، اور کہے کہ نہیں تمھارا اس ملک پر حق نہیں ہے، مگر آپ کو اپنے اندر ایمان و سیرت اور دعوت و ہدایت کا امتیاز پیدا کرنا ہوگا، جب آپ اس ملک میں عزت کے ساتھ رہ سکیں گے، توحید کی طاقت آپ کے اندر ہو، اس سے بڑھ کر دنیا میں کسی طاقت کا تجربہ ابھی تک نہیں کیا گیا، ایک آدمی جس کے اندر توحید کا عقیدہ ہوتا ہے، وہ ساری دنیا کو، دنیا کی ساری طاقتوں کو خاطر میں نہیں لاتا، کوئی دولت و عزت اس کی نظر میں نہیں سماتی، ہمارے اندر توحید کا نکھرا ہوا صاف عقیدہ ہو کہ خدا کے سوا نفع و ضرر کی طاقت کسی میں نہیں "لا نافع ولاضار الاالله لا اله الاالله "وہی نافع وہی ضار "وان يمسسك الله بضر فلا كاشف له الاهو وان يردك بخير فلاراد لفضله "اے محمد (رسول اللہ ﷺ) اگر اللہ تعالیٰ تمھارے ساتھ ضرر کا ارادہ کر لے تو کوئی روک نہیں سکتا، نفع کا ارادہ کر لے تو کوئی

آڑے نہیں آسکتا۔ (سورۂ یونس۔ ۱۰۷)

مسلمان کے امتیازات

پھر اس کے ساتھ تمھارے اندر شریعت کی پابندی ہو، تم شریعت کے احکام پر چلتے ہو، جب ساری دنیا کی قومیں اپنے اپنے مذہب کے احکام کو چھوڑ چکیں، اب صرف رسوم ورواج رہ گئے صرف تہوار رہ گئے، صرف میلے ٹھیلے رہ گئے، صرف سوشل چیزیں رہ گئیں، تو اس حالت میں تم نمازوں کے پابند ہو، تم شریعت کے احکام پر چلنے والے ہو، تم حلال وحرام میں فرق کرنے والے ہو، اور اس کے ساتھ پھر تمھارے اخلاق اعلیٰ ہوں، دنیا دودھ میں پانی ملائے، تم حرام سمجھو، دنیا کے درزی کپڑا چرائیں، تمھارے درزی اس کو حرام سمجھیں، دنیا ڈنڈی مارے اور کم تولے، تم اس کو حرام سمجھو، اس راستہ سے آئے ہوئے پیسے کو تم نجس وناپاک سمجھو، مرجانا دس مرتبہ اچھا ہے لیکن رشوت لینا اچھا نہیں، اگر کوئی غیر مسلم چار گھنٹے کام کرتا ہو تو تم چھ گھنٹے اپنے آفس میں بیٹھ کر کام کرو کہ نہیں ہم جب اس کی تنخواہ پاتے ہیں تو پھر ہمیں خدمت کرنی چاہئے، اور اس ملک نے ہم پر احسان کیا ہے، ہم نے اس ملک میں صدیاں گذاریں، ہم پھلے پھولے، ہم نے ہر طرح کا لطف اٹھایا، یہاں کی تمام نعمتوں سے فائدہ اٹھایا، ہم اس ملک کے ساتھ غداری نہیں کر سکتے، ہم اس ملک میں کام چوری کی عادت نہیں اختیار کریں گے، گپ کرتے رہے، اور ایک دو فائلیں دیکھیں جیسے آج کل رواج ہے اور پھر لنچ کا وقت آگیا، لنچ کھایا، اس کے بعد پھر کچھ گپ کی، کچھ چائے پی، کوئی دوست آگیا تو اس سے بات کرنے لگے، نہیں، ڈیوٹی پر وقت پر جانا، وقت پر آنا، پورا کام کرنا، ہر آدمی کے ساتھ خیر خواہی کرنا، کوئی انسان کسی مذہب وملت کا ہو، وہ اگر تمھاری مدد کا محتاج ہو، تو تم بالکل نہ دیکھو کہ یہ

کلمہ گو ہے یا نہیں، تمہیں اس کی مدد کرنی چاہئے، کوئی اگر ظلم کر رہا ہو تو اس کا ہاتھ پکڑنا چاہئے، ظالم کو روکنا چاہئے، مظلوم کی حمایت کرنی چاہئے، سچی بات کوئی کہے اس کی قدر کرنی چاہئے۔

ملک کے حالات میں تبدیلی

یہ اخلاق اگر ہمارے ہوں گے تو وہی بات ہوگی "اِن تَتَّقُوا اللہَ یَجعَل لَکُم فرقانًا" اگر تم اللہ سے ڈروگے اللہ تمھارے لئے فرقان پیدا کردے گا، ہندوستان ہی میں دنیا دیکھے گی کہ مسلمان کا کیا احترام ہوتا ہے، مسلمان کو کس طرح لوگ آنکھوں میں جگہ دیتے ہیں، کس طرح مسلمان کو ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمان نہ رہے گا تو اس ملک کا رہنا مشکل ہے، مسلمان ہی اس ملک کو تباہی سے بچا سکتے ہیں، اپنے اندر یہ اعتماد پیدا کرو، اپنے اندر یہ قوت پیدا کرو، جب آپ کے یہ اخلاق ہوں گے، تو انشاء اللہ پھر آپ کے لئے راستہ صاف ہے، آپ اپنے کو بھی بچائیں گے، اپنی عزت وناموس کو بھی بچائیں گے، اور اس ملک کو بھی تباہی سے بچائیں گے۔

ملک تباہی کے کنارے کھڑا ہے اور مسلمان اس کو بچا سکتے ہیں

میں صاف کہتا ہوں کہ یہ ملک تباہی کے کنارے کھڑا ہے، کیوں کھڑا ہے؟ پیسے کی لالچ کی وجہ سے، بے ایمانی کی وجہ سے، رشوت کی وجہ سے، کام چوری کی وجہ سے، فرض ناشناسی کی وجہ سے، اور یہ بھاؤ بھید جو ہیں، روشنی کا مینار اِدھر اُدھر نہیں جاتا، کھڑا رہتا ہے، سب کو راستہ دکھاتا ہے، آپ ہمت سے کام لیں اور اپنے اندر فرقان پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

ایمانی صفات، اسلامی اخلاق اور دعوت وہدایت اور ہمدردیِ خلائق کے جذبہ کے ساتھ آپ کو یہاں کی زندگی سے کٹنا بھی نہیں چاہئے، آپ یہ نہ کہیں کہ صاحب ہماری بلا سے یہ ملک ڈوبے یا بچے ہم نہیں جانتے، ہم تو بس اپنی عاقبت کی فکر میں ہیں، نہیں، یہ بات ٹھیک نہیں ہے، مسلمان کا منصب نہیں ہے کہ آپ کے ہوتے ہوئے ملک تباہ ہو جائے، خدا آپ سے پوچھے گا، آپ جس کشتی پر سوار ہیں، وہ کشتی ڈوبے، پھر آپ کی کیا خصوصیت رہی، آپ ڈوبتی ہوئی کشتی کو ہاتھ لگادیں تو وہ ساحل تک پہونچ جائے، یہ آپ کی شان ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی ذمہ واری

یہ تقریر ۱۳/ اکتوبر ۱۹۸۲ء کی شام کو مولانا ابوالکلام آزاد اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ باغ عامہ حیدرآباد میں ایک بڑے اجتماع میں کی گئی، یہ جلسہ نواب میر اکبر علی خاں صدر انسٹی ٹیوٹ کی دعوت پر ہوا تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہندوستان میں مسلمانوں کی ذمہ داری

حمد وصلاۃ کے بعد!

وَلَاتُفْسِدُوافِی الْاَرضِ بَعْدَ اِصلاحِھا. (سورۃ الاعراف. ۸۵) اور زمین میں اصلاح کے بعد خرابی نہ کرو۔

حضرات! میں نے آپ کے سامنے قرآن شریف کی ایک آیت پڑھی ہے، خدا کے پیغمبر شعیبؑ نے اپنی قوم سے کہا (اور حقیقت میں انھوں نے سارے پیغمبروں اور پیغام ربانی کی ترجمانی کی) میری قوم کے لوگو! اللہ کی زمین میں اصلاح کے بعد خرابی اور فساد نہ پھیلاؤ، ان کے یہ الفاظ کتنے سادہ لیکن کتنے معنی خیز، کتنے عمیق اور درد میں ڈوبے ہوئے ہیں؟ عام طور پر کہا جاتا ہے، بھائیو! فساد نہ مچاؤ؟ انتشار انگیزی نہ کرو، بد نظمی نہ پھیلاؤ، لیکن حضرت شعیبؑ نے فرمایا: ولاتفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا" جب خدا کی زمین، اس کے کسی ملک میں معاشرہ اور تمدن، اور حیات انسانی کی چول بٹھانے، اس کو اپنی جگہ پر لانے، انسانوں کا رشتہ اپنے مالک سے استوار کرنے، بنی نوع انسان کے درمیان تعلقات کو درست کرنے، دوسروں کے حقوق اور اپنے فرائض کو تسلیم اور قبول کرنے، انسانی جان ومال کے احترام اور خوش معاملگی کا درس دیا گیا ہو، اور اللہ کے بندوں نے بڑی

تعداد میں، اور بعض اوقات پورے پورے ملک اور پوری پوری قوم نے کسی خطۂ ارضی میں اس کو قبول کر لیا ہو، تو خدارا اس کے بعد ان کوششوں پر پانی نہ پھیرو، اس نخل اصلاح کو خون پسینہ سے سینچا گیا، اس کی خاطر اپنے خاندانوں، اور عزت وناموس کی بازی لگادی گئی، دنیا کے تمام مفادات سے آنکھیں بند کر لی گئیں، ایک ہی حقیقت کو یاد کیا گیا کہ زمین پر آدمیوں کی طرح اور خدا کے بندوں کی طرح رہنا سکھایا جائے، جس طرح کہ تسبیح کے دانوں کو تسبیح میں، یا ہار کے موتیوں کو ہار میں گوندھ دیا جاتا ہے، اسی طرح نسل انسانی کے افراد کو اخوت انسانی کے دھاگے میں گوندھ دیا گیا ہے "کلکم من ادم ،وادم من تراب" (اے انسانو! تم سب آدمؑ کی اولاد ہو، اور آدمؑ مٹی سے بنے تھے) خدا کے لئے اس دھاگہ کو نہ توڑو، ورنہ یہ دانے بکھر جائیں گے، اور تاریخ کی شہادت ہے کہ یہ دانے جب اخوتِ انسانی کے اس رشتہ کو چھوڑتے ہیں، تو صرف بکھرتے ہی نہیں، بلکہ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں، ان میں باہمی ایک ایسی سلبی کشش پیدا ہو جاتی ہے، جیسی مقناطیس کی ایجابی کشش، جس طرح موجیں موجوں سے ٹکراتی ہیں، نہنگ نہنگوں سے دست گریباں ہوتے ہیں، اسی طرح یہ دانے بکھرنے کے بعد صرف یہ نہیں کہ مٹی میں مل جائیں، وہ جمع ہو کر، اور جس کو جتنا موقعہ ملتا ہے، اپنے قریب کے دانوں کو جمع کر کے دور کے دانوں سے آکر ٹکراتا ہے، میں نے ایک جگہ کہا تھا کہ وحشتیں وحشتوں ہی سے نہیں ٹکراتیں، وحدتیں بھی وحدتوں سے ٹکراتی ہیں، وہ وحدت جس کی اساس غلط ہے، وہ وحدت جو اخوت انسانی اور عبودیت ربانی پر قائم نہیں جو حقوق وفرائض کی صحیح تقسیم وتوازن، خوف خدا، اور انسانی جان ومال کے احترام پر قائم نہیں، وہ وحدت خطرناک ہے، جو دانہ اپنی لڑی سے جدا ہوا، وہ اپنے حدود میں محدود نہیں رہتا، وہ

ٹکرائیگا ضرور، پیغمبروں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ تسبیح کے یہ دانے تسبیح کی لڑی میں پروئے رہیں، ٹوٹنے نہ پائیں، شیطان نے کوشش کی کہ یہ دانے بکھریں، حضرت شعیبؑ کے اس مقولہ میں بڑا درد، اور دل کی تڑپ نظر آتی ہے، خدا کے پیغمبروں نے صدیوں کے عمل میں انسان کو انسانیت کا سبق پڑھایا، اور انسان بن کر رہنا سکھایا، انھوں نے کہا کہ تمہاری یہ تعریف نہیں کہ مچھلیوں کی طرح پانی میں پیرو، چڑیوں کی طرح ہوا میں اڑو، شیر کی طرح خدا کی زمین پر چلو، زمین خدا کی، تم خدا کے، پھر سرکشی کہاں سے آئی؟ انھوں نے یہ نہیں فرمایا کہ "وَلَاتُفْسِدُوا فِی الْاَرْضِ بَعْدَاِصْلَاحِھَا" (زمین کے درست ہو جانے کے بعد اس میں بگاڑ نہ پیدا کرو) "اصلاح" لفظ متعدی ہے، اصلاح کے لئے ایک مصلح چاہئے، دعوت چاہئے، جدوجہد چاہئے، توفیق الٰہی چاہئے، اس لفظ میں یہ سب چیزیں آگئیں، نبوت کی تاریخ آگئی، جب خدا کے پیغمبروں، اور انسانیت کے چارہ سازوں نے اپنی مبارک کوششوں سے اس خطۂ ارضی کو جنت کا نمونہ بنادیا، یہاں انسان، انسان پر جان دینے کے لئے تیار ہو گئے، رہزن پاسبان، اور درندے چوپان بن گئے، ایثار و قربانی کے ایسے نمونے دنیا کے سامنے آئے کہ اگر تاریخ کی معتبر شہادت، اور شہرت و تواتر نہ ہو تو ان کا یقین کرنا ممکن نہیں تھا۔

خدا کی نگاہ مین بڑا جرم، اور خدا کے پیغمبروں اور مصلحین کی نگاہ میں بڑا ظلم ہے کہ کسی معاشرہ کو جس کے ہر فرد کی قسمت دوسرے فرد سے وابستہ ہے، اپنے ذاتی مفاد اور کوتاہ نظری کی بناء پر زیر و زبر کر دیا جائے، اگر کوئی خرابی کسی معاشرہ (سوسائٹی) یا ملک میں پیدا ہو، اور آدمی سمجھے کہ ہماری بلا سے، ہمارا کیا بگڑتا ہے، فلاں محلہ میں، فلاں برادری میں، شہر کے فلاں حصہ میں، ملک کی ایک

ریاست میں اگر آدمی آدمی کو مار رہا ہے، لوگوں کے گھر جلائے جارہے ہیں، یکا دکا مسافر کو پھُر اگھونپا جارہا ہے، تو کیا حرج ہے، ہمارے محدود حلقہ میں تو کوئی بات نہیں، اس صورت حال اور طرز فکر کا جو نتیجہ ہوگا، اس کی مثال مجھے اصلاحی ادب ہی میں نہیں، ادبیات انسانی میں اس سے بہتر نہیں ملی، جو ایک صحیح حدیث نبویؐ میں دی گئی ہے، رسول ﷺ نے فرمایا کہ ایک کشتی پر مسافر سوار ہیں، اس میں دو طبقے ہیں، ایک بالائے، ایک زیریں، (یہ بھی اعجاز نبوی ہے، جہاں تک مجھے معلوم ہے، اس وقت کشتی رانی کے فن نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ اس میں فرسٹ کلاس، اور ڈک کلاس ہوں، اور اگر یہ ترقی ہو چکی تھی، تو کم سے کم جزیرۃ العرب جس میں دریا نہ ہونے کے برابر ہیں، اور حجاز کا خطہ اس سے اور بھی ناآشنا تھا) کچھ مسافر اوپر کے طبقہ میں ہیں، جن کو ہم (بالا نشین) کہہ سکتے ہیں، کچھ حصۂ زیریں کے لوگ ہیں، جو عام طور پر غریب غرباء ہوتے ہیں، میٹھے پانی کا انتظام اوپر کیا گیا ہے، اپر کلاس والوں کی رعایت بھی ذرا زیادہ کی جاتی ہے، نیچے والے مجبور ہیں کہ پانی لینے کے لئے اوپر جائیں، وہاں سے پانی لے کر آتے ہیں، پانی کی فطرت ہے کہ اچھلتا ہے، پھر کشتی خود ایک متحرک چیز ہے، ڈانوان ڈول ہوتی ہے، لوگوں کی ہزار احتیاطوں کے باوجود پانی چھلکتا ہے، پانی پہچانتا نہیں کہ یہ فلاں امیر صاحب بیٹھے ہوئے ہیں، یہ فلاں نواب صاحب کے کپڑے پھیلے ہوئے ہیں، ایک مرتبہ ہوا، دو مرتبہ ہوا، چار مرتبہ ہوا، آخر میں اپر کلاس کے ان مسافروں سے برداشت نہیں ہو سکا، اور انھوں نے کہا صاحب! یہ تماشہ ہم نہیں دیکھ سکتے، پانی یہ لے جائیں اور پریشان ہم ہوں؟ ہم پانی نہیں لے جانے دیں گے، اپنا انتظام کرو، نیچے والوں نے کہا کہ پانی کے بغیر تو گذارا نہیں، اب اگر ہم اوپر سے نہیں لا سکتے، تو ہم نیچے ہی سوراخ کر لیتے ہیں، بیٹھے ہی بیٹھے

اپنے برتنوں میں پانی بھر لیا کریں گے، اب ہمیں منت کش غیر نہیں ہونا پڑیگا، اور کسی کی ناز برادری نہیں کرنی پڑے گی، رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر ان بالا نشینوں کی عقل پر پتھر نہیں پڑے ہیں، اور ان کی شامت نہیں آئی ہے تو وہ خوشامد کریں گے، ہاتھ پکڑیں گے اور کہیں گے کہ نہیں بھائی، تم اوپر ہی سے پانی لے جاؤ، لیکن خدا کے لئے یہ غضب نہ کرو کہ نیچے ہی نیچے سوراخ کر لو، اس لئے کہ کشتی ڈوبے گی تو پھر سب کو لے کر ڈوبے گی، نہ اپر کلاس والے بچیں گے نہ لور کلاس والے۔

ہم کو آپ کو سب کو بظاہر اسی ملک میں زندگی گذارنی ہے، لیکن یہ تمدنی انسانی یا معاشرۂ انسانی کی کشتی ہے، اور ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، اگر ہم نے خود غرضی سے کام لیا، اور اپنے اپنے گھر میں میٹھے پانی کا انتظام سوچ لیا، تو پھر خیریت نہیں، وہ میٹھا پانی کیا ہے؟ یہ کہ ہماری غرض پوری ہو جائے، ہمارا کام نکل جائے، پھر ہمیں دوسرے سے مطلب نہیں، یہ کشتی میں سوراخ کرنے ہی کے مرادف ہے، آج ہمارے ملک کی کشتی میں کتنے سوراخ کئے جا رہے ہیں، ہر شخص اپنی محدود غرض کو دیکھتا ہے، اس نے دوسروں سے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں، اور اس حقیقت کو بھلا دیا ہے، بیروت میں جو کچھ ہوا وہ اسی کوتاہ نظری کا نتیجہ تھا، اسرائیل نے سمجھا کہ موقعہ اچھا ہے، اس وقت ہمیں اپنا کام نکال لینا چاہئے، اس سے بحث نہیں کہ اپنے مطلب براری کی اس قربان گاہ پر کتنے آدمی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں، انسانیت کی کیا گت بنتی ہے، وہاں کے ماروئی فرقے کی تنظیم (فلانجسٹ) نے یہ سمجھا کہ یہ وقت ہے، جب ایک بڑی طاقت کا سایہ ہم کو حاصل ہے، ہم اس کی چھتری کے نیچے ہیں، اس لئے ہمیں اپنا کام کر لینا چاہئے، یہ تو ایک بڑی مہیب،

نامناسب اور بھدی شکل میں ہوا، اور ساری دنیا نے اس پر نفریں کی، لیکن اس سے کم درجہ کی شکل میں ہمارے ملک میں بھی یہی ہو رہا ہے کہ مختلف طبقے، مختلف برادریاں ہندوستانی سماج کے مختلف حصے اپنے اغراض کی تکمیل میں لگے ہوتے ہیں، برادری والا برادری کے آدمی کو ترجیح دے گا، چاہے کتنا ہی نااہل ہو، اقرباء پروری، اور برادر نوازی کا ہمارے معاشرہ میں دور دورہ ہے، خدا کے پیغمبروں نے دنیا کو امن کا سبق دیا تھا، اگر آپ وسیع النظری اور ایمان داری کے ساتھ سراغ لگائیں گے، اور کڑی سے کڑی ملائیں گے تو معلوم ہوگا کہ دنیا میں اب بھی انسانیت کا جو بچا کھچا سرمایہ ہے، محبت واخوت کی دلوں میں جو چاشنی ہے، امن وامان، اور خوف خدا کا انسانی زندگی پر جو پرتو ہے، انسانی جان ومال اور عزت وناموس کی نگاہوں میں جو اہمیت اور قیمت رہ گئی ہے، وہ خدا کے پیغمبروں، پھر ان کے پیغام اور کام کو زندہ رکھنے والے اہل دل کی محنتوں کا نتیجہ اور کوشش کا ثمرہ ہے:۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا (آل عمران. ۱۰۳) اللہ تعالیٰ کا اپنے اوپر احسان کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل ملا دیئے، تم اس کے فضل سے بھائی بھائی ہو گئے، اور تم آگ کے گڑھے کے بالکل کنارے کھڑے تھے، اللہ نے تم کو اس سے صاف صاف اور بال بال بچالیا۔

چھٹی صدی مسیحی میں انسانیت ہلاکت اور اجتماعی خودکشی کے عمیق ومہیب خندق کے کنارے پہونچ چکی تھی، اور چھلانگ لگانا ہی چاہتی تھی کہ خدا کا ایک بندہ (نبی امی روحی فداہ) ﷺ مبعوث ہوتا ہے، اور جیسا آپ نے خود ایک

موقعہ پر فرمایا کہ "میری اور تمہاری مثال ایسی ہے کہ جیسے کسی نے آگ روشن کی، اس پر پروانے دیوانہ وار ٹوٹنے لگے، اسی طرح تم آگ پر گرنا چاہتے ہو، اور میں تمہاری کمر پکڑ پکڑ کر اس سے ہٹاتا ہوں" آپ انسانی تاریخ دیکھیں بارہا ایسا ہوا ہے کہ انسان صرف ایک خونخوار جانور بن کر رہ گیا ہے، خدا کا کوئی پیغمبر آیا اور اس نے حیوان قاتل کو انسان کامل، رہزن کو پاسبان، اور درندے کو گلے کا چوپان بنادیا، امجد ناشناسوں اور انسانیت سے ناآشناؤں کو معلم اخلاق واضع قانون، اور ہادیِ عالم بنادیا ۔

درفشانی نے تری قطرے کو دریا کر دیا دل کو روشن کر دیا آنکھوں کو بینا کر دیا
جو نہ تھے خود راہ پر غیروں کے ہادی بن گئے کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

ہمارے ملک ہندوستان میں بھی محبت کا جو بچا کھچا سرمایہ پایا جاتا ہے، وہ انھیں صوفیائے کرام کی دین ہے جو محبت کا پیغام لے کر کے آئے تھے، محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ (جن کے خلیفہ کے خلیفہ حضرت خواجہ گیسو دراز آپ کے اسی علاقہ میں محو خواب ہیں) فرماتے ہیں کہ دیکھو اگر کسی نے ایک کانٹا رکھا، اور تم نے بھی کانٹا نثار کھدیا تو کانٹے ہی کانٹے ہو جائیں گے، اور اگر اس نے کانٹا رکھا، اور تم نے پھول رکھا تو پھول رکھے جائیں گے، کانٹے کا علاج کانٹا نہیں ہے، کانٹے کا علاج پھول ہے ایک مرتبہ فرمایا کہ لوگوں کا اصول تو یہ ہے کہ ٹیڑھے کے ساتھ ٹیڑھا، اور سیدھے کے ساتھ سیدھا، "با نغزاں نغزی، با کوزاں کوزی" اور ہمارا اصول یہ ہے کہ سیدھے کے ساتھ سیدھا، اور ٹیڑھے کے ساتھ بھی سیدھا، "با نغزاں نغزی، اور با کوزاں ہم نغزی" خواجۂ بزرگ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، اور ان سے بھی پہلے اس ملک میں آنے والوں میں حضرت سید ابوالحسن علی ہجویری سے لے کر اس سلسلہ کے صحیح جانشینوں تک کے حالات جہاں

تک دیکھیں گے، ہر جگہ محبت کا درس ملے گا، شکستہ دلوں، اور انسانیت سے مایوس جاں بلب انسانوں کی دل جوئی، دل نوازی، اور چارہ سازی، انھوں نے یہ سبق پیغمبروں ہی کی تعلیمات اور سیرت سے سیکھا تھا، پھر ہر ملک میں جاکر سکھایا، اسی محبت سے انھوں نے دل فتح کئے اور ؎

جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ

وہ اپنی محبت سے گھائل نہیں کہ یہ ان کے ساتھ ناانصافی ہے، گھائل تو کریں تیر کمان والے، وہ قائل اور دل سے مائل کر لیتے تھے، اور پھر لوگ ان کو اپنے والدین خاندانی سرپرستوں، اور خونی رشتوں پر ترجیح دینے لگتے تھے، شیخ احمد کھٹو کا (جن کے نام پر احمد آباد شہر کا نام رکھا گیا) واقعہ دیکھئے کہ وہ ایام شیر خوارگی میں دہلی میں ایک طوفان اور تیز آندھی میں اپنی دائی سے چھوٹ کر کہیں سے کہیں پہونچ گئے تھے، پھر ان کو ایک قافلہ نے جو وہاں سے گذر رہا تھا، سلسلہ مغربیہ کے ایک شیخ کے پاس کھٹو گجرات پہونچا دیا تھا، اسی لئے مؤرخ ان کو "**گنج باد آورد**" کہتے ہیں، برسوں کے بعد جب وہ سن بلوغ کو پہونچ گئے تو ان کے گھر کے لوگ کسی طرح پتہ لگا کر کھٹو پہونچے، اور ان کے شیخ سے ملے، شیخ نے کہا "نوجوان کو اختیار ہے، وہ چاہے یہاں رہے، چاہے اپنے گھر جائے، شیخ احمد نے گھر اور والدین پر، اور دہلی کی پُر آسائش زندگی پر یہاں کے فقر و فاقہ کو ترجیح دی، اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔

اس وقت مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ کھڑے ہوں، اور ملک کو تباہ ہونے سے بچائیں، یہ تنہا حکومت کی ذمہ داری نہیں ہے، اس کے ساتھ بیسیوں الجھنیں، اور سیاسی مصلحتیں لگی ہوئی ہیں، قرآن کی روشنی میں یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ دین کے سچے داعیوں، انسانیت کے بہی خواہوں، اور ملک و معاشرہ کے مخلص

معماروں کی محنتوں پر پانی نہ پھیر نے دیجئے "وَ لَا تُفْسِدُوا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا" کا پیغام دیتے رہئے، خدا کے یہاں آپ سے سوال ہوگا کہ تمہارے ہوتے ہوئے یہ ملک کیسے تباہ ہوا، تمہیں ایسا کردار اور نمونہ پیش کرنا چاہئے تھا کہ لوگ سمجھتے کہ پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا، عہدہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا، عزت ہی سب کچھ نہیں ہوتی، خدا کا خوف اصل چیز ہے، پھر محبت اور ہمدردیِ خلائق، میں یقین رکھتا ہوں کہ آپ یہ نمونہ دکھا کر محبوبیت کا مقام حاصل کرلیں گے، اور آپ کو اس ملک کی قیادت کا مقام تفویض ہوگا، ہم نے افراد کے محبوب بننے کے واقعات تو کتابوں میں بہت پڑھے ہیں، اور ہمیں یاد ہیں، لیکن ملتوں کے محبوب بننے کے واقعات سے ہم غافل ہیں، خدا نے اس ملت کو (جب اس نے انسانیت کو بچانے اور چمکانے کے لئے اپنے ذاتی مفادات کی قربانی پیش کی اور حق وصداقت کا دامن مضبوط پکڑا) محبوب جہاں بنادیا تھا، چین سے عرب کو پیغام گیا، "اطلبوا العلم ولو بالصین" سلطنت عباسیہ کے پاس انھوں نے مہم بھیجی کہ یہاں کوئی ایسا آدمی نہیں، جس پر ہم پورے طور پر اطمینان کرسکیں، اور وہ مقدمات کا بے لاگ فیصلہ کرسکے، خدا کے لئے آپ وہاں سے کچھ آدمی بھیجئے جو فصل خصومات کا کام کریں، یہ ملت کے محبوب ہونے کا مقام ہے، یہ اس وقت کا حال ہے جب یہ ملت "کنتم خیر امة اخرجت للناس" پر ایمان رکھتی تھی، اس کا عقیدہ تھا کہ ہم اپنی کاربراری، خاندانی آسودگی اور قومی خوش حالی اور برتری کے لئے نہیں پیدا کئے گئے ہیں، انسانیت کی فلاح اور خدمت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، آپ نے سنا ہوگا کہ حضرت ابو عبیدہؓ کے کمان میں جو اسلامی فوج حمص (شام) میں مقیم تھی، اور رومیوں کے مقابلہ میں صف آرا تھی، دربارِ خلافت سے حکم آیا کہ تمام اسلامی افواج یرموک کے محاذ پر جمع

ہو جائیں، وہاں ایک فیصلہ کن جنگ ہونے والی ہے، حضرت ابو عبیدہؓ نے حکم دیا کہ افواج اسلامی یہاں سے منتقل ہوں، اور جو جزیہ (حفاظتی وانتظامی ٹیکس) شہر کی غیر مسلم آبادی سے وصول کیا گیا ہے، وہ واپس کر دیا جائے، خازن کو حکم دیا کہ ایک پیسہ رہنے نہ پائے، جب یہودیوں اور عیسائیوں کو ان سے وصول کی ہوئی رقم واپس کی گئی، تو انھوں نے دریافت کیا کہ ایسا کیوں کیا جارہا ہے؟ امیر افواج، اور امین الامت نے جواب دیا کہ یہ رقم اس بنیاد پر وصول کی گئی تھی کہ ہم آپ کی حفاظت کریں گے، اب اس وقت ہم حفاظت کی پوزیشن میں نہیں ہیں، ہم اس مقام کو چھوڑ کر دوسرے محاذ پر جارہے ہیں، معلوم نہیں پھر کب آنا نصیب ہو، اس لئے ہمیں اس کے رکھنے کا حق نہیں ہے، مورخین نے لکھا ہے، کہ لوگ روتے تھے، اور کہتے تھے کہ وہ ہمیں سے پیسہ لیتے تھے، اور ہمارا ہی خون پیتے تھے، اور تمہارا معاملہ ہمارے ساتھ یہ ہے، کہ اس ملت کی محبوبیت کے آپ کتنے واقعات سنیں گے، آپ دیکھیں گے کہ جدھر سے مسلمان گذر جاتے تھے، وہاں کے لوگ آنکھیں بچھاتے تھے کہ یہ فرشتۂ رحمت آئے، ان کی وجہ سے وبائیں دور ہوں گی، مال اور فصل میں برکت ہوگی، ہمارے یہاں کے اختلافات ختم ہوں گے، خدا کی رحمت وبرکت کا نزول ہوگا، اسی حقانیت، اخلاق ومحبت، اور عدل وانصاف نے بربر جیسی ناقابل تسخیر قوم کو (جس کو رومن امپائر نے بھی ناقابل سمجھ کر چھوڑ رکھا تھا) اسلام کا حلقہ بگوش اور عربی تہذیب وثقافت، اور علوم وآداب کا ایسا عارف وحامل بنادیا کہ فرانیسی حکومت کی (جس نے ان کو جداگانہ قومیت، اور علیحدہ تہذیب کا سبق پڑھانے اور اپنی قدیم تہذیب ورویات وزبان کو زندہ کرنے کی زبردست ترغیب دی، اور مسلمان عربوں سے متنفر بنانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کردیا) سب تدبیریں اور

کوششیں ناکام ہوئیں، اور بربر آج بھی خدا کے فضل سے اسلامی عربی تہذیب میں ڈھلے ہوئے ہیں، اور اس کی محبت و غیرت میں عربوں سے کم نہیں کچھ زیادہ ہی ہیں۔

حضرات! ابھی تک ہم نے ملت کے محبوب بننے کے مسئلہ پر سنجیدگی سے غور نہیں، کیا اصل میں محبوب بنانے والی صفات ہیں، وہ صفات اگر فرد میں پیدا ہوں تو فرد محبوب بن جائے، ملت میں پیدا ہوں، تو ملت محبوب بن جائے آج ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے اس کے سوا عزت و قیادت کا کوئی راستہ نہیں۔

حکومت کا تو کیا شکوہ کہ وہ ایک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مسلم سے کوئی چارہ

خلوص، قربانی، اور ایثار، خدمت کا جذبہ محبوبیت دلانے والی صفات ہیں، حکومتیں اس کے جلو میں چلتی ہیں، تمدن اور تہذیبیں اس کا رکاب تھامتی اور اس پر فخر کرتی ہیں، اگر یہ نہیں ہے تو نہ حکومت کا بھروسہ ہے، نہ عہدوں کا، نہ سیاسی دانش مندی اور جوڑ توڑ کا، آج ضرورت ہے کہ ہمارے مسلمان نوجوان یہ ثابت کریں کہ ہم میں زیادہ صلاحیت کار (EFFICIENCY) ہم میں زیادہ احساس ذمہ داری، ہم میں زیادہ فرض شناسی اور ایمان داری ہے، ہم کو اگر لاکھوں روپے کی رشوت دی جائے، اور ہم کو روپے کی سخت ضرورت ہو، تو ہم اس کو ہاتھ لگانا بھی حرام سمجھیں گے، بلکہ رشوت پیش کرنے والے سے کہیں گے کہ تم نے میری اور میری ملت کی توہین کی، تمہیں یہ خیال کیسے آیا کہ کوئی مسلمان رشوت لے سکتا ہے؟ تمہارا چہرہ یہ بتائے کہ جیسے تمہیں کسی نے گالی دے دی، مسلمان زندگی کے جس محاذ پر بھی ہو، وہ کردار کا ایک نمونہ ثابت ہو، وہ اپنے عمل سے ثابت کردے کہ اس کو کوئی فرد یا پارٹی، بلکہ حکومت بھی خرید نہیں سکتی، ملت کا مستقل مسئلہ کردار ہی

سے حل ہوگا، مسلمانوں کے ایک باعزت ملت کی حیثیت سے رہنے کا یہی واحد راستہ ہے، قرآن کہتا ہے :۔

إِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَابِقَومٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوا مَابِاَنفُسِہِم (سورۂ رعد. ۱۱) خدا اس (نعمت) کو جو کسی قوم کو (حاصل) ہے، نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنی حالت کو نہ بدلے۔

ہمارا اقتدار ہماری غلطیوں سے گیا، ہم نے اپنا استحقاق اور اعتماد اپنی غلطیوں سے کھویا، ہم اس کو پھر اپنی ہی صلاحیتوں سے حاصل کر سکتے ہیں، اس میں دنیا کی کوئی قوم مدد نہیں کر سکتی، لبنان و فلسطین کے عربوں نے دھوکا کھایا، کسی نے روس پر اعتماد کیا، کسی نے امریکہ پر، لیکن خدا نے صاف کہدیا ہے کہ شیطان وقت پر دغا دیتا ہے "وَکَانَ الشَّیطٰنُ لِلاِنسَانِ خَذُولاً" بیروت اور آس پاس کے عرب منہ دیکھتے رہ گئے، اور کوئی کام نہ آیا، ان کو خدا پر، اپنی دینی تعلیمات پر، اپنی صلاحیت و نافعیت پر، اپنی دعوت، اور اپنے حسن عمل پر بھروسہ کرنا چاہئے تھا، اور اسی سے حالات کا مقابلہ کرنا چاہئے تھا، یہ کہنا کہ ہماری قسمت فلاں سے وابستہ ہے، صحیح نہیں، مسلمانوں کا خدا کے سوا کوئی ناصر اور حامی نہیں، اس کے بعد اگر کوئی چیز مدد کر سکتی ہے تو اپنی صلاحیت، اپنا امتیاز، اپنی افادیت، آپ یہ ثابت کریں کہ آپ ملک کی ضرورت ہیں، ملک آپ کے بغیر صحیح طریقہ پر چل نہیں سکتا، اور اس کی کشتی سیاسی جماعتی، اور انفرادی اغراض کے طوفانوں سے جو دولت پرستی، طاقت پرستی، تنگ نظری، اور خدا ناشناسی نے پیدا کر دیئے ہیں، بچ کر کنارے نہیں لگ سکتی، اور اپنی منزل پر نہیں پہونچ سکتی۔

آپ حضرات میں اب بھی ان لوگوں کی بڑی تعداد ہوگی، جنھوں نے سلطنت آصفیہ کا پرانا دور دیکھا ہے، ان کو رہ رہ کر اس دور کی یاد ستاتی ہوگی، میں کہتا

ہوں، اب اس کو یاد کر کے افسوس کرنے کی ضرورت نہیں، اب ایک نئی زندگی کا آغاز اور ایک نئے دور کا افتتاح کیجئے۔

سبق پھر پڑھ شجاعت کا صداقت کا عدالت کا
لیا جائیگا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

دنیا خیر امت کی امامت کے بغیر صحیح طریقہ پر چل ہی نہیں سکتی، پوری تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے، اور حیوانی، ہوس رانی، اور طاقت و دولت کے زور پر حکمرانی کو چلنا نہیں کہتے، کیا امریکہ چل رہا ہے، کیا روس چل رہا ہے؟ جس کے دور اقتدار میں، اور جس کی حمایت و حفاظت میں اتنا بڑا اندھیر اہو، جیسا ابھی بیروت میں ہوا، خدا اس سے خوش ہو سکتا ہے؟ اور اس کو زندگی اور اقتدار کی مہلت زیادہ دن دے سکتا ہے؟۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

ان دونوں کو اپنے اعمال کا خدا کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا، انھوں نے انسانی قوموں کو بالکل جنگل کا شکار سمجھ لیا ہے، ان کے لئے بھی ایک یوم الحساب ہوگا، اور وہ کچھ دور نہیں، جو چیز اپنی افادیت کھو چکی ہے، اس کے لئے بقا نہیں ہے، یورپ تو بقائے اصلح (SURVIVAL OF THE FIT-TEST) کے نظریہ تک پہونچا ہے، لیکن قرآن بقائے انفع کو کہتا ہے، صرف صالحیت ہی کافی نہیں، نافعیت بھی ضروری ہے:۔

فَاَمَّاالزَّبَدُ فَیَذْھَبُ جُفَاءً وَاَمَّا مَایَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ کَذٰلِکَ یَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ (الرعد. ۱۷) سو جھاگ تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے، اور (پانی) جو لوگوں کو فائدہ پہونچاتا ہے، وہ زمین میں ٹھہر ارہتا ہے، اس طرح خدا مثالیں بیان فرماتا ہے (تاکہ) تم سمجھو۔

تاریخ بتاتی ہے کہ کسی قوم کا اخلاقی زوال پہلے شروع ہوتا ہے، سیاسی زوال بعد میں آتا ہے، یونان، رومتہ الکبریٰ، سلطنت ساسانیہ، قدیم ہندوستان، اور اسلامی سلطنتوں کی تاریخ اسی کی شہادت دیتی ہیں، ہمارے ملک کے ذمہ داروں، سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں، دانش گاہوں کے سربراہوں، ملک کے ارباب حل وعقد اور دانشوروں کو پوری حقیقت پسندی، وسیع النظری سے ملک کے حالات کا جائزہ لینا چاہئے، اور اس مہیب اخلاقی زوال سے لرزہ براندام ہو جانا چاہئے، جس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، اور جس سے یہ بات روز روشن کی طرح نمایاں ہو گئی ہے کہ اس ملک میں صرف پیسہ، عہدہ، ذات، برادری، اور سیاسی مقاصد کی تکمیل ہی حقیقت ہے، باقی صرف فلسفے، اور مذہبی لوگوں کی سادہ لوحی، اور واعظوں کی لفاظی ہے، پھر اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ اتنے لمبے چوڑے ملک میں راس کماری سے لے کر سری نگر تک، یہ آواز بلند کرنے والا کوئی نہیں، یہ کہنے والا کہ اخلاق درست کرو، انسانیت کا سبق پڑھو، ملک کو بچاؤ کوئی نہیں، یہ کہنے والے ہزار ہیں کہ ہماری پارٹی میں آؤ، فلاں کی قیادت تسلیم کرو، اس کا شکوہ نہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے، غلط ہو رہا ہے، سب کا مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ غلط صحیح ہوتا ہے ہمارے جھنڈے کے نیچے، اور ہمارے زیر اقتدار ہو، دل کا یہ درد، دیوار کا یہ نوشتہ، افق پر چمکنے والے اقبال وزوال کے ستارے میں نے آپ کے سامنے رکھ دیئے ہیں، اب آپ کا خاص طور پر نوجوانوں کا کام ہے کہ اس سے فائدہ اٹھائیں، خود بچیں اور ملک کو بچائیں، خود فائدہ اٹھائیں اور ملت کو فائدہ پہونچائیں۔

لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان

وماعلینا الا البلاغ.

دعوت اور حکمتِ دعوت

یہ تقریر ۲؍نومبر ۱۹۸۱ء مطابق ۴؍محرم الحرام ۱۴۰۲ھ بوقت صبح دس بجے جمعیۃ اہل حدیث جموں وکشمیر کے صدر دفتر ہال میں کی گئی، حاضرین میں ایک بڑی تعداد علماء، اساتذہ اور اہلِ علم وفکر کی تھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعوت اور حکمتِ دعوت

خطبۂ مسنونہ کے بعد!

اُدْعُ اِلیٰ سَبِیلِ رَبِکَ بِالحِکمۃِ وَالمَوعِظۃِ الحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُم بِالَّتِی ھِیَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِہٖ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْن (النحل. ۲۵) آپ اپنے پروردگار کی راہ کی طرف بلائیے حکمت سے اور اچھی نصیحت سے اور ان کے ساتھ بحث کیجئے پسندیدہ طریقہ سے، بیشک آپ کا پروردگار (ہی) خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہی ہدایت پائے ہوؤں کو (بھی) خوب جانتا ہے۔

حضرات! اللہ رب العزت کا یہ خطاب اپنے آخری نبی ﷺ سے آخری امت کے لئے ہے، کیونکہ اس امت کے بعد اور کوئی امت نہیں، یہ سورہ نحل کے آخری رکوع کی آیت ہے، جس میں دعوت وارشاد کے طریقہ کو بیان کیا گیا ہے، فرمان الٰہی ہے: اُدْعُ اِلیٰ سَبِیلِ رَبِکَ بِالحِکمۃِ وَالمَوعِظۃِ الحَسَنَۃِ (النحل. ۱۲۵) آپ اپنے رب کی راہ کی طرف علم وحکمت اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ بلائیے۔

حکمت سے مراد ہے عقل، دانائی سلیقہ، حسن تدبیر، سچی اور صحیح بات کو واضح کر کے دل میں اتارنے کا طریقہ، اس طرح کہ مداہنت، یا موقعہ پرستی کا شائبہ نہ ہونے پائے، سیاست کا اس میں دخل نہ ہو، سیاست الگ چیز ہے، اور حکمت و موعظت الگ ہے۔

اپنے عہد میں خدا کے محبوب ترین بندہ موسیٰؑ کو اس عہد کے خدا کے مغضوب ترین بندہ، ظالم جفاکار فرعون کے پاس جانے اور دعوت دینے کا حکم ملتا ہے، لیکن سلیقہ اور نرمی سے بات کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

اِذهبَا اِلیٰ فرعونَ اِنّه طغیٰ (طٰہٰ. ۴۳) دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت نکل چکا ہے۔ اس سرکش اور طاغی کے ساتھ بھی دعوت کا کیا طریقہ اختیار کرنا ہے؟ فَقُولَا لَه قولاً لَیِّناً (طٰہٰ. ۴۴) پھر اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا۔ بات پکی اور سچی ہو، مگر انداز تکلم سلیقہ، نرمی، خوش آہنگی کا ہو: لَعلّه یَتذکّرُ اَو یَخشیٰ (طٰہٰ. ۴۴) شاید وہ (عذاب الٰہی سے) ڈر جائے۔

تاکہ وہ نصیحت پکڑے، یا سلیقہ کی بات سن کر اس کے دل میں خشیت و خوف پیدا ہو جائے، اور اپنے کفر و طغیان، اور شر و ظلم سے باز آئے، اگر بھلی بات کے کہنے کا انداز بری طرح ہو تو وہ کارآمد ثابت نہیں ہوتا، شاعر نے سچ کہا ہے۔

کہتے ہیں وہ بھلے کی و لیکن بری طرح

بھلی بات کو بھلی طرح کہنا ہی حسن سلیقہ اور حکمت ہے، اگر مخاطب سے سوال و جواب بھی کرنا پڑے تو اس میں بھی سلیقہ ہونا چاہئے، مناظرہ اور مجادلہ کے موقعہ پر بھی اس کی ہدایت ہوئی: وَجَادِلْهُم بِالَّتِی هِیَ اَحسنُ (النحل. ۱۲۵) اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجئے۔

تاکہ سننے والے اور دیکھنے والے داعی کے طریقۂ استدلال سے متاثر ہوں، چاہے مخاطب پر اثر نہ ہو، اگر طریقۂ بحث و مجادلہ احسن طریقہ پر ہوگا تو مخاطب عقل سلیم اور نیک فطرت کی بناء پر خود متاثر ہوگا، اگر ایسا نہ ہوا تو بھی حاضرین وسامعین پر حسنِ مجادلہ کا ضرور اثر پڑے گا، یہی حقیقت آیت :اِن ابراھیمَ کَانَ اُمَّۃً قَانِتاً لِلّٰہِ حَنِیفاً وَّلَم یَکُ مِنَ المُشرِکِیْنَ (النحل. ۱۲۰) بیشک ابراہیم بڑے مقتدا تھے اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار تھے بالکل ایک طرف کے ہورہے تھے اور وہ شرک کرنے والوں میں نہ تھے۔

اس سے واضح ہوتی ہے، انکو اس طریقۂ استدلال، سلیقہ، حکمت و موعظت ،اور احسنِ مجادلہ کے باوجود :حَنِیفاً مُّسلِماً وَمَا کَانَ مِنَ المُشرِکِین (آل عمران. ٦٧) طریق مستقیم والے (یعنی) صاحب اسلام تھے اور مشرکین میں سے (بھی) نہ تھے۔ کا خطاب عطا فرمایا گیا، اس لئے کہ ان کی دعوت میں حکمت تھی، مداہنت نہ تھی، لینت تھی، سیاست نہ تھی، لہذا ایک مومن مسلمان کو بھی یہ طرز تبلیغ اختیار کرنا لازم ہے، عقائد کی اصلاح کے لئے بھی "اُدعُ اِلیٰ سبیلِ ربکَ بِالحِکمۃِ" کا طریق کار ہی مفید ہے، بات کتنی ہی ضروری اور لازمی ہو، داعی کے سامنے مقصد یہ ہونا چاہئے کہ مریض کا علاج کرنا ہے، اس میں پیار، نرمی، اور محبت ہو، سختی، درشتی، تیزی و تندی کی وجہ سے مریض تجربہ کار مشہور ڈاکٹر اور حکیم کے پاس جانے سے بھی ڈرتا ہے، علاج معالجہ کی بات ہی الگ ہے۔ امت کو پیغام ملتا ہے :لَقَد جَاءَکُم رَسُولٌ مِن اَنفسِکُم عَزِیزٌ عَلیہِ مَاعنتُم حَرِیصٌ عَلَیکُم بِالمؤمنینَ رَءُوفٌ رحیمٌ (التوبہ. ۱۲۸) (اے لوگو) تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس (بشر) سے ہیں جن کو تمہاری

مضرت کی بات نہایت گراں گذرتی ہے جو تمہارے منفعت کے بڑے خواہشمند رہتے ہیں (ایمانداروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق (اور) مہربان ہیں۔

اس پر عمل کرنا آپ کے ایک امتی پر بھی لازم ہے، وہ دوسرے انسان کو حکمت عملی اور محبت اور پیار سے دعوت دے کر، سلیقہ سے سمجھا کر عقائد کی اصلاح کے لئے مائل وراغب کرے، آنحضرت ﷺ کی فکر تبلیغ اور دل سوزی کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے :فَلَعَلَّكَ باخِعٌ نفسكَ عَلىٰ اٰثارِهِم اِنْ لَّم يُؤمِنُوا بِهٰذا الحديثِ اَسَفًا(الكهف. ٦)(اے پیغمبر) تمہاری حالت تو ایسی ہو رہی ہے کہ جب لوگ یہ (واضح) بات بھی نہ مانیں، تو عجب نہیں ان (کی ہدایت) کے پیچھے مارے افسوس کے اپنی جان ہلاکت میں ڈال دو (حالانکہ یہ ماننے والے نہیں) لَعلكَ بِاخِعٌ نفسَكَ اَلاَّ يَكُونُوا مُؤمنين (الشعراء.) کیا آپ اپنی ذات کو ان کے ایمان لانے کی خاطر ہلاکت میں ڈال دیں گے ؟

آنحضرت ﷺ کی محبّ، اور درد دل تھا کہ ایک ایک آدمی اپنے مالک مختار کے آستانہ پر سر جھکائے، اور کوئی اس در سے محروم نہ جائے، آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے فرمایا کہ :لان يهدى الله بك رجلا خير لك من حمر النعم سرخ اونٹوں سے بھی کہیں بہتر ہے کہ ایک آدمی کو تمہارے ذریعہ سے ہدایت ہو جائے

مبلغ کو بھی ایک درد مند اور دانشمند ڈاکٹر اور معالج کی طرح مریض کا خیر اندیش بن کر علاج کرنا ہے، حکیم یا ڈاکٹر کا مقصد مریض کو مارنا نہ ہو بلکہ صحت یاب کرنا ہونا چاہئے، عقیدۂ توحید کی بات تو بالکل صاف کہی جائے، اور شرک کی تردید بھی ہو، لیکن دوا کی مناسب خوراک ہو، اگر دوا زیادہ ہو گی تو مریض کا کام تمام

ہو جائے گا، چونکہ بات واقعات سے مربوط ہو کر زیادہ خوبی کے ساتھ سمجھ میں آتی ہے، اس لئے دو ایک واقعات سنئے :

دیکھئے اللہ کے بندے جن کے دلوں میں عشق الٰہی کی آگ لگی تھی، وہ بھی حکمت سے کس طرح کام کرتے رہے ہیں، شیخ جمال الدین ایرانی کہیں جا رہے تھے، تاتاریوں نے اسلامی سلطنتوں کو تاراج کیا تھا، اتفاق سے اسی روز ایک تاتاری شہزادہ تغلق تیمور شکار کھیلنے نکلا ہوا تھا، اور یہ تاتاری شہزادہ چغتائی شاخ کا ولی عہد تھا، جو ایران پر حکومت کر رہی تھی، شہزادہ کی شکارگاہ میں جب شیخ جمال الدین اتفاقاً داخل ہو گئے اور پہرہ داران کو پکڑ کر شہزادہ کے سامنے لائے تو شہزادہ نے ایک مسلمان فقیر صورت دیکھکر اور وہ بھی ایرانی کو دیکھ کر (جس کو تاتاری اس وقت بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے) بدشگونی لی، اور غصہ سے پوچھا، بتاؤ میرا یہ کتا اچھا ہے، یا تم ؟ شہزادہ نے غیظ و غضب سے بات کی تھی، شیخ جمال الدین نے سنجیدہ انداز میں جواب دیا، انھوں نے فرمایا : اس کا قطعی فیصلہ کرنے کا یہ موقعہ نہیں، شہزادہ بولا، پھر اس کا کونسا موقعہ ہوگا ؟ فرمایا وہ میرے خاتمہ یعنی وفات کے وقت ہی واضح ہوگا، اگر میں کائنات کے پیدا کرنے والے مالک وحدہ لاشریک کی صحیح معرفت اور اقرار پر فوت ہوا تو میں آپ کے کتے سے بہتر ثابت ہوں گا، بصورت دیگر یہ کتا ہی مجھ سے بہتر اور خوش قسمت ہوگا، ان کے اس جواب نے شہزادہ کے دل پر ایک چوٹ لگائی، شہزادہ نے شیخ سے کہا، جب تم سنو کہ میں تخت نشین ہوا ہوں تو اس وقت مجھ سے آکر ملنا، شیخ جمال الدین کا شہزادہ کی ولی عہدی ہی کے زمانہ میں دنیا سے کوچ کرنے کا وقت آگیا، آپ نے اپنے بیٹے کو بلا کر کہا کہ میں دنیا سے رخصت ہوتا ہوں، جو کام میرے ذمہ تھا، وہ ادھورا رہا شاید تم اس کو پورا کر سکو، اور

یہ تمام واقعہ بیان کیا۔

شیخ جمال الدین کی وفات کے بعد جب ولی عہد کی تاج پوشی ہوئی تو پھر شیخ کے فرزند اپنے والد بزرگوار کی وصیت پورا کرنے کی خاطر روانہ ہوئے، شاہی محل کے دروازہ پر سپاہیوں نے ٹوکا اور دروازہ سے ہٹایا، آپ نے ایک درخت کے نیچے مصلی بچھایا، اور علی الصباح اذان دی، جس سے بادشاہ کی آنکھ کھل گئی، تحقیقات پر معلوم ہوا کہ کوئی مسکین صورت آدمی باہر بیٹھا ہے، اس نے ہی یہ آواز لگائی ہے، جس سے بادشاہ کی نیند میں خلل پڑا، بادشاہ نے غصہ ہو کر اس کو گرفتار کر کے لانے کا حکم صادر کیا، چنانچہ ان کو پکڑ کر سپاہی بادشاہ کے پاس لائے، پوچھنے پر انھوں نے اپنے والد کا سلام پہونچا کر بتایا کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ ان کا خاتمہ ایمان پر ہوا، اور اس سوال کا جواب مل گیا، جو آپ نے کیا تھا، اور شکار کا واقعہ جو ولی عہدی کے زمانہ میں پیش آیا تھا یاد دلایا، بادشاہ کے دل پر اب دوسرا چرکا لگا، اور فوراً اپنے اسلام لانے کا اقرار کر کے اپنے وزیر سلطنت کو بلایا، اور اس سے یہ قصہ کہا وزیر نے جواب دیا کہ میں تو پہلے ہی مسلمان ہو چکا ہوں، مگر میں نے اس کو پوشیدہ رکھا تھا، اس طرح ایران کی یہ چغتائی تاتاری شاخ تمام اہل کاروں، فوج سمیت حلقہ بگوش اسلام ہوئی، اس طرح ایک اللہ والے نے ایرانی تاتاری سلطنت میں اسلام کو کیسے پھیلایا کہ ساری کی ساری تاتاری قوم مسلمان ہو گئی۔

ایسے ہی ایک دوسرا واقعہ ہے کہ مولانا یحیٰ علی صاحب جو حضرت مولانا ولایت علی صاحب صادقپوریؒ کے تربیت یافتہ تھے، اور اس کو مجاہدین سرحد کی مدد کرنے کے الزام میں (جنھوں نے حضرت سید صاحب کے بعد ان کا کام جاری رکھا تھا) ۱۸۶۴ء میں پھانسی کی سزا ہوئی تھی، وہ انبالہ جیل کی ایک تنگ و تاریک

کوٹھری میں محبوس تھے، جس میں ہوا اور روشنی کے لئے کوئی راستہ نہ تھا، سخت گرمی کے دن تھے، جیل آفیسر معائنہ کے لئے آیا تو اس کو خیال ہوا کہ ایسے حال میں تو یہ مر جائیں گے، مقدمہ ابھی باقی ہے، اس نے حکم دیا کہ دروازہ کھلا رہے، اور سنتری پہرہ پر کھڑے رہیں، یہ سنتری بالعموم سکھ یا گورکھا ہوتے تھے، وہ جہاں اپنی ڈیوٹی سنبھالتے، آپ ان کو مخاطب کر کے حضرت یوسفؑ کا وعظ توحید سنانے لگتے:

یٰصَاحِبَیِ السجنِ ءَ اَربابٌ متفرقُونَ خیرٌ اِمِ اللّٰہُ الوَاحدُ القَھّار مَا تَعبدونَ مِن دونہ اِلاَّ اسماء سَمَّیتُمُوھا اَنتمَ واباؤکمُ مَا اَنزلَ اللّٰہُ بھَا مِن سلطٰنٍ اِنِ الحُکمُ اِلا لِلّٰہ اَمرَ اَلاَ تَعبدُوا اِلاَّ اِیَّا ہ ذٰلکَ الدینُ القیمُ وَلٰکِنَّ اکثرَ الناسِ لَا یَعلَمونَ (یوسف. ۳۹. ۴۰) اے قید خانہ کے رفیقو! متفرق معبود اچھے یا ایک معبود برحق جو سب سے زبردست ہے وہ اچھا، تم لوگ تو خدا کو چھوڑ کر صرف چند بے حقیقت ناموں کی عبادت کرتے ہو، جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے (آپ ہی) ٹھہرا لیا ہے، خدا تعالیٰ نے تو ان (کے معبود ہونے) کی کوئی دلیل (عقلی یا نقلی) بھیجی نہیں، (اور حکم دینے کا اختیار (صرف) خدا ہی کا ہے (اور) اس نے حکم دیا ہے کہ بجز اس کے اور کسی کی عبادت نہ کرو یہی (توحید) کا سیدھا طریقہ ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

وہ ان آیات کی تلاوت اور تشریح فرماتے یہ سن کر پہرہ داروں کے آنسو نکل پڑتے اور اس پر سناٹا چھا جاتا، اور جب ان کا پہرہ بدلا جاتا تو وہ خوشامد کرتے کہ ان کو یہیں رہنے دیا جائے، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان میں کتنے بندگان خدا کے دل میں توحید کا بیج پڑ گیا اور ان کو ایمان نصیب ہوا۔

اسی طرح مولوی محمد جعفر صاحبؒ "کالاپانی" کی سزا ہوئی تو کوئی غم، فکر

ان کے چہرہ پر نمودار نہ تھا، انگریز تماشائیوں نے پوچھا کہ کیا بات ہے ؟ انھوں نے فرمایا، یہ موت نہیں شہادت ہے، جو ایک ایسی نعمت ہے، جس کے مقابلہ میں تمام دنیا کی سلطنت ہیچ ہے، وہاں بھی وہ تبلیغ دین حکمت سے انجام دیتے رہے، جیل اور پورٹ بلیر میں بھی وہ اور ان کے رفقائے کرام توحید کی دعوت اور تبلیغ کرتے رہے، اور بہت سے بندگانِ خدا نے ہدایت پائی، مولانا یحیٰ علی صاحبؒ کے پاس ایک رات ایک بد کردار، بدنام قیدی کا بستر آگیا، جب اِس نے مولانا کی عبادت گذاری، اور دعائیں، اور آہ وزاری دیکھی تو وہ بھی تائب ہوا، اور تہجد گذار بن گیا، اسی طرح جیل میں بیسیوں بندگانِ خدا کو ہدایت ہوئی اور ان کی زندگی بدل گئی۔

اس طرح اللہ کے بندوں میں جب دل کا سوز، اور دماغ کی روشنی ہو، اور دونوں مل کر کام کریں تو پھر نتیجہ واضح ہے، اگر ایک شکاری جانور شکار کرنے کے لئے حکمت استعمال کرتا ہے، تو ایک مبلغ اپنے مقدس کام میں حکمت سے کام کیوں نہ لے جو اس سے بہتر مقصد رکھتا ہے، شرک سب سے بڑا مہلک مرض ہے، اس کا علاج بھی حکمت سے کرنا لازم ہے، لہجہ نرم ہو مگر بات سچی ہو، تاکہ سننے والا مانوس ہو تو علاج کا اثر جلد ہوگا، شرک ہی کے متعلق اعلان ہے :إِنَّ اللّٰهَ لَا يغفرُ اَن يشرَكَ به و يغفِرُ مَادونَ ذٰلكَ لِمَن يَشَاءُ (النساء. ۱۱۶) بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں جس کے لئے منظور ہوگا وہ گناہ بخش دے گا۔

تو ہم پرستی اور مخلوق پرستی سے نکالنے کے لئے جتنی نرمی برتی جائے، مناسب ہے، ایک پورے شہر پورے ملک کو حکمت ہی سے خدا کے صحیح راستہ پر لایا جاسکتا ہے، آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کے دن جب سنا کہ سعد بن عبادہؓ نے ابو سفیان

کو دیکھ کر کہا :**الیوم یوم الملحمة الیوم تستحل الکعبة الیوم اذل الله قریشا**. آج دن کا دن ہے، آج کعبہ میں آزادی کے ساتھ عمل کیا جائے گا، آج اللہ نے قریش کی ذلیل کیا ہے۔

تو آنحضرت ﷺ نے اس کے بدلے "الیوم یوم المرحمة الیوم یعز الله قریشا ویعظم الله الکعبة" (آج رحمت عام کا دن ہے، آج اللہ قریش کو عزت دیگا، آج کعبہ کی عزت بڑھائی جائیگی) کا اعلان فرمایا، اور سعد بن عبادہؓ سے جھنڈا لے کر ان کے بیٹے کو دیا، جھنڈا پکڑنے میں باپ کی جگہ بیٹے کا ہاتھ آیا، تو اس حکمت عملی نے ابو سفیان کے دل میں تلاطم پیدا کر دیا، آپ نے ان کے گھر کو جب دار الامان کا درجہ دیا، تو ابو سفیان کی دشمنی محبت اور دوستی سے بدل گئی، اب حکمت کا اندازہ کر لیجئے، ابو سفیان کو جو یہ اعزاز بخشا گیا، تو ان کی نفرت کی آگ ٹھنڈی ہوئی، اور دل کے دروازے کھلے، تاریخ و تذکرہ کی کتابیں بتاتی ہیں کہ ہمارے بزرگ جس راستہ سے گذرے توحید کی تبلیغ اور بدعات و شرکیات سے پرہیز کا وعظ کہتے ہوئے جو بھی قافلہ ہمارا جہاں سے گزرا وہاں توحید کی ہوا چلی، حضرت سید علی ہمدانی، سید عبد الرحمٰن بلبل شاہ وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ کشمیر کی گل پوش و گل پاش وادی یا چشموں کی سیر ابی کا نظارہ کرنے نہیں آئے بلکہ کوہستانوں، لق و دق بیابانوں، خار زار وادیوں کو قطع کر کے کلمۂ حق کی اشاعت و تبلیغ کی خاطر آئے، جس کے نتیجہ میں آپ کشمیر میں لاکھوں کی تعداد میں لوگوں کو توحید کا حلقہ بگوش پاتے ہیں، میں نے یہی بات ذرا تفصیل سے جامع مسجد کی تقریر میں کہی تھی، اخباروں میں شایع ہوا کہ میں نے سارے کشمیریوں کو مشرک بتایا، بھلا مجھے بلا تحقیق اس کا کیا حق تھا، اور میں مسلمانوں کو بیک زبان کیسے کافر کہہ سکتا ہوں،

توحید کی دعوت میں انس پیدا کیا جائے، اختلافی مسائل کو درمیان میں نہ لایا جائے، اختلافی مسائل میں ترجیح الگ بات ہے، علمی اختلاف کی گنجائش بہر حال ہے، وہ بعد میں ہوگا، پہلے توحید کا مضمون لانا ہے، آستانۂ الٰہی پر سر جھکانا ہے، علمی اختلاف کا موقعہ اس کے بعد ہے، بزرگوں کا کام توحید پھیلانا اور شرک وبدعت کو دور کرنا ہے، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اپنے زمانہ کے ایک بڑے شیخ طریقت تھے جو مسلک حنفی پر عمل کرتے تھے، ایک اہل حدیث عالم ان کے مرید ہوئے اور رفع یدین چھوڑدی، مولانا کو خبر ہوئی تو فرمایا، اگر آپ کی تحقیق رفع یدین سے متعلق بدل گئی ہے تو الگ بات ہے، لیکن اگر میری وجہ سے چھوڑدی ہے، تو میں سنت چھوڑنے کے لئے نہیں کہہ سکتا ہوں۔

آپ کو دیکھنا ہے کہ اللہ کی مخلوق کہاں جارہی ہے؟ اور سب سے بڑی بات قرآن وحدیث کی تبلیغ ہے، یہی چیز دعوت وتبلیغ کی اصل واساس ہونی چاہئے، مسلکی خصوصیات اس کے بعد آتے ہیں، مسلمان تعداد میں بہت بڑھ گئے ہیں لیکن جذبۂ دین وہ نہ رہا جو پہلے تھا، عامۃ المسلمین کے لئے کوئی خطرہ ہو تو اس کے لئے سب سینہ سپر ہوجائیں، اس بات کا خیال رہے کہ کسی کی دل آزاری نہ کی جائے، ہمیشہ وسعت قلبی کا ثبوت دیا جائے، نفرت نہ پھیلائی جائے۔

صادقپوری اور غزنوی خاندان کے حضرات اہل حدیث علماء تھے، ان میں مولانا ولایت علی، مولانا احمد اللہ، مولانا یحیٰی علی، مولانا عبد الرحیم، مولانا سید عبد اللہ غزنوی، مولانا عبد الجبار غزنوی جیسی دیندار اور خدادوست ہستیاں تھیں، کہ ان کے چہروں سے نور ٹپکتا تھا، اور ان کو دیکھ کر خدا یاد آتا تھا، انھوں نے ہندوستان بھر میں کس طرح موعظت وحکمت یا بضرورت استدلال واثبات سے لوگوں کے عقائد کی تصحیح کی۔

امر تسر میں ندوہ کا جلسہ تھا، جس میں ہندوستان کے چوٹی کے علماء شریک تھے، علامہ شبلیؒ کا زمانہ تھا، صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی صاحب کی زبانی میں نے سنا ہے کہ صبح مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی کا درس قرآن ہوتا تھا، غالبا فارسی میں درس دیتے تھے، مولانا شبلی ایک مرتبہ شریک ہوئے تو مولانا شیروانی سے کہا جس وقت مولانا عبدالجبار صاحب اللہ کا نام لیتے تھے تو روح و جسم میں ایک بجلی سی دوڑ جاتی تھی، اور دل چاہتا تھا، کہ سر ان کے قدموں پر رکھ دیا جائے۔

ہندوستان پر خدا کی ایک بڑی رحمت شاہ ولی اللہؒ کا خاندان تھا، جس نے قرآن وسنت کو رواج دیا، اور شرک وبدعت کا قلع قمع کیا، ترجمۂ قرآن کرنے پر ان کی سخت مخالفت کی گئی، مگر وہ اللہ کے بندے کب دعوت دین سے ہچکچانے والے تھے؟ اس خاندان میں شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین، شاہ اسماعیل، شاہ اسحٰق جیسے علمائے ربانیین اور مجاہدین پیدا ہوئے۔

مولانا اسماعیل شہیدؒ کے صرف ایک وعظ سے ایک جلسہ میں بیسیوں طوائف اور پیشہ ور عورتیں نیکوکار اور پارسا بن گئیں، تفصیل میری کتاب "**کاروان ایمان وعزیمت**" میں دیکھئے۔

تقریر کے اختتام پر جمعیۃ کے ناظم تبلیغ صوفی محمد مسلم صاحب نے اقبال کا یہ شعر پڑھا اسی پر یہ تقریر ختم کی جاتی ہے کہ اس میں تقریر کی روح آگئی ہے۔

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پر سوز
یہی ہے رختِ سفر، میر کارواں کے لئے

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین.

عربی زبان کی تحصیل و مہارت کا سب سے طاقتور محرک

اور

اس کے محیر العقول نتائج

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علیؒ ندوی یہ اہم تقریر سنٹرل انسیٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لنگویجیز حیدرآباد-(CENTYRA) LINSTITUTE OF ENGLISH AND FOREIGN LANGUAGES) کے آل انڈیا عربک سیمنار منعقدہ ۱۱ر اکتوبر ۱۹۸۲ء میں اس سیمنار کا افتتاح کرتے ہوئے کی تھی۔ جس کی صدارت نواب میر اکبر علی خاں سابق گورنر اتر پردیش نے کی تھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عربی زبان کی تحصیل و مہارت کا سب سے طاقتور محرک

اور

اس کے محیر العقول نتائج

بعد حمدہ صلوٰۃ!

صدر محترم، ڈائریکٹر صاحب، فضلائے کرام!

میں سب سے پہلے اس کی اجازت چاہتا ہوں کہ مجھے اردو میں خطاب کرنے کا موقع دیا جائے اگرچہ میرے لئے بڑی عزت بلکہ لذت کی بات تھی کہ میں عربی جیسی شیریں وسیع اور بلیغ زبان میں خطاب کروں، خاص طور پر اس سیمنار کے موقع پر جس کی زبان عربی قرار دی گئی ہے، لیکن حیدرآباد میں اور جامعہ عثمانیہ کے سایۂ دیوار کے نیچے اردو کے سوا کسی اور زبان میں خطاب کرتے ہوئے لحاظ آتا ہے کہ اردو کی ترقی میں اور اس کو ذریعۂ تعلیم بنانے میں حیدرآباد کو جو اولیت اور جامعہ عثمانیہ کو جو فخر حاصل ہے، اس کا تقاضہ ہے کہ میں اسی زبان میں اپنے خیالات و تاثرات کا اظہار کروں۔

اس مؤقر مجلس مذاکرہ (سیمینار) کا افتتاح (INAUGURATE)

کرنے کے لئے میرا انتخاب کر کے آپ نے مجھے جو عزت بخشی اس اعزاز اور میرے اس کو قبول کرنے کا اگر کوئی جواز ہو سکتا ہے تو وہ وہی ہے جس کو علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک شعر میں ادا کیا ہے، وہ فرماتے ہیں ؎

مرا ساز گرچہ ستم رسیدہ زخمہ ہائے عجم رہا
وہ شہیدِ ذوقِ وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

جیسا کہ ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر اعجاز نے اپنے تعارفی مقالہ میں بیان کیا ہے، میں نے عربی زبان کو اظہار خیال کا اصل ذریعہ بنایا ہے، میری زیادہ تر کتابیں جن کو موضوع کے لحاظ سے اہم سمجھتا ہوں اصلاً عربی میں لکھی گئیں پھر ان کا اردو انگریزی میں ترجمہ ہوا، اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ اگرچہ میں عجمی نژاد اور ہندی المولد ہوں مری نوا عربی رہی۔

حضرات! کسی ملک میں کسی دوسرے ملک کی زبان پر توجہ مرکوز کرنا اس پر اپنی ذہانت اپنی صلاحیت اور اپنے وقت کا سب سے بڑا حصہ صرف کرنا حقیقتاً ایک غیر طبعی (UNNATURAL) بات ہے، جس کے لئے معقول اور طاقتور محرکات واسباب کی ضرورت ہے، فطرت انسانی ہے کہ انسان کو اپنی مادری زبان سے محبت ہوتی ہے، اور اس کے فطری جوہر اسی میں کھلتے ہیں ادبیاتِ عالم اور لغات والسنہ کی تاریخ کی ناقابل انکار شہادت ہے کہ انسان کی ذہانت اور اس کے حقیقی جذبات وخیالات کا سب سے بڑا مظہر اس کی زبان ہوتی ہے، اس کی محبت ودرد اور اس کے جوش اندروں کا چشمہ اس میں اپنی طبعی رفتار اور اپنے طبعی جوش کے ساتھ فوارہ کی طرح ابلتا ہے، کسی ملک کے باشندے دوسرے ملک کی زبان کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیں، اس پر اپنی بہترین ذہانتیں صرف کریں، اس میں وہ دنیا کے لئے ادب

وشاعری کے لافانی نقوش چھوڑ جائیں، اس کے میرے محدود مطالعہ میں چار ہی محرکات واسباب ہو سکتے ہیں، سیاسی، معاشی، علمی، مذہبی وروحانی، دنیا نے ان چاروں محرکات کا تجربہ بھی کیا ہے، سیاسی محرک ہمارے اور آپ کے سامنے ہے، جب ہندوستان برطانوی حکومت کے زیر اقتدار آیا، اور ہندوستان کا برطانیہ سے ایک سیاسی اور معاشی رشتہ قائم ہو گیا، اور ہندوستان کے حوصلہ مند نوجوانوں کے لئے جو کوئی امتیاز پیدا کرنا اور اپنی صلاحیت کا اظہار کرنا چاہتے تھے، ضروری ہو گیا کہ وہ انگریزی زبان میں کمال پیدا کریں، جہاں تک اس دور کا تعلق ہے، یہ دونوں محرکات آکر مل گئے اور ان کا سنگم ہوا، (زبان میں شدبد پیدا کر لینا، یہاں ہمارے موضوع سے خارج ہے) اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ ہندوستان کے ذہین وباصلاحیت افراد عصری تعلیم گاہوں، انگریزی اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخل ہوئے، اس تاریخی عمل کا تسلسل پوری ایک صدی تک جاری رہا، ہمیں دیکھنا ہے کہ اس سیاسی اور معاشی محرک کے علمی وادبی میدان میں کیا نتائج برآمد ہوئے؟

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہاں ہندو اور مسلمانوں میں انگریزی کے ایسے اہل قلم ومقرر پیدا ہوئے جن کی تحریروں کو اہل زبان (انگریزوں) نے بھی دلچسپی سے پڑھا اور تقریروں کو دلچسپی سے سنا اور اعتراف کیا کہ یہ انگریزی پر قدرت رکھتے ہیں، لیکن یہ دونوں طاقتور محرک مل کر کے بھی ہمارے ہندوستان کے انگریزی دانوں کو اس سطح پر نہیں پہنچا سکے کہ اہل زبان انگریز ان کا لوہا مان لیں اور تسلیم کریں کہ ہم ان کی تحریروں و تقریروں سے استفادہ کر سکتے ہیں، وہ ادب وزبان میں ہمیں مشورہ دے سکتے ہیں، تنقید وشعر وشاعری کی اداؤں اور تیوروں کو پہچانتے ہیں، وہ ہماری زبان میں ہمارے ہم پایہ وہم پلہ بلکہ ہم سے کچھ آگے ہیں، یہ بات نہیں ہو سکی، چند

حضرات کی جن کے نام انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں، اور انہوں نے انگریزی کو تسلیم کیا، اور مانا کہ وہ صحیح انگریزی لکھتے اور اچھی انگریزی بولتے ہیں، مسلمانوں میں دیکھئے (ہمارے صدر محترم اس نام سے خوش ہوں گے) تو انگریزوں نے مولانا محمد علی جوہر کی انگریزی کو تسلیم کیا، ان کے کامریڈ (COMRADE) کو انگریز آفیسر اور باذوق انگریز منگواتے تھے، اس کی زبان و طنزیات کو چٹخارا لیتے تھے، اس کے علاوہ علامہ عبداللہ یوسف علی، احمد شاہ پطرس بخاری (جو آل انڈیا ریڈیو کے بانی اور اس کا سانچہ بنانے والے تھے) کی انگریزی کو تسلیم کیا، خواجہ کمال الدین، آپ کے یہاں کے ڈاکٹر سید عبداللطیف، علامہ اقبال انگریزی میں بے تکلف لکھتے اور اظہار خیال کرتے تھے، حیدرآباد میں سر امین جنگ نے بھی انگریزی میں لکھا ہے، لیکن یہ بات کہ انگریز ان کے سامنے سر تسلیم خم کرتے، اور ان کی تحریریں پڑھ کر ان کے منہ میں پانی بھر آئے، اور وہ اس کا لطف لیں، ان کا ادبی ذوق اور حاسہ اس سے غذا پائے، ایسا نہیں ہوسکا، ان میں چند ہی مستثنیات ہیں، جن میں "**اسپرٹ آف اسلام**" (SPIRIT OF ISLAM) کے مصنف رائٹ آنریبل سید امیر علی کا پایہ سب سے بلند رہا، کسی ملک کی نوجوان نسل کو دوسرے ملک کی زبان کی مہارت اس بام عروج تک نہیں پہنچا سکی، جس بام عروج پر ان کو اپنی ذہانت، جانکاہی و جگر سوزی کے لحاظ سے پہنچنا چاہئے تھا، ان میں سے بہت سے لوگ تو ایسے تھے، جنھوں نے اپنی زبان کو بھلانے کی کوشش کی اور انھوں نے انگریزی زبان کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا لیکن اس کے بعد انگریز ادیبوں اور اہل قلم نے دل پر پتھر اور آنکھوں پر ٹھیکری رکھ کر اتنا کہا کہ ہاں صاحب کچھ ہندوستانی اچھی اور صحیح انگریزی لکھ لیتے ہیں۔

تیسرا محرک علمی (ACADEMIC)اور مطالعہ و تحقیق (RE-SEARCH WORK)کا کام اور ذوق ہے، اس کا بہترین نمونہ مستشرقین (ORIENTALISTS) ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جیسا میں نے اپنی تازہ کتاب ''**اسلامیات**'' میں تفصیل سے لکھا ہے، بیسیوں مستشرقین نے خالص علمی و تحقیقی جذبہ سے کام کیا اور اپنے موضوع پر محنت و تحقیق کا ثبوت دیا، اور کبھی کبھی ایسی دیدہ ریزی سے کام لیا ہے کہ مشرق اور عالم اسلام کے علماء بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور ان میں سے بعض نے مہینوں نہیں بلکہ تیس تیس چالیس چالیس برس ایک موضوع کے مطالعہ پر صرف کر دیئے، اس کے بعد انھوں نے اپنے مطالعہ و تحقیق کا نتیجہ دنیا کے سامنے رکھا، لیکن ان کا مطالعہ بھی (چند کو مستثنیٰ کر کے) نہ بہت وسیع ہوتا ہے، نہ بہت عمیق، وہ جس موضوع کو اپنا مرکزِ توجہ بناتے ہیں، ان کا مطالعہ بھی اسی میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے، عربی علوم اور اسلامیات پر ان کی نظر ہمہ گیر اور عمیق و دقیق نہیں ہوتی، نہ عربی زبان پر (جو اسلامی کتب خانہ کی کلید ہے) ان کو کامل و مستقل عبور ہوتا ہے، نہ ان کی تحریروں میں وہ تاثیر ہوتی ہے، جو علماء کا خاصہ ہے، میں نے برطانیہ کے بعض چوٹی کے مستشرقین سے مل کر اندازہ کیا کہ ان کو نہ عربی پر قدرت ہے، نہ اس کے مختلف مکاتب فکر اور صاحبِ طرز اسلوب، قدیم ادیبوں اور شاعروں سے پوری واقفیت ہے۔

اب میں عربی زبان کی تحصیل و مہارت کے آخری محرک کو لیتا ہوں جو حقیقت میں اولین محرک ہے، وہ ہے دینی و روحانی، اخلاقی اور اصولی، اس کی تفصیل یہ ہے کہ کسی زبان کا مطالعہ اس لئے کیا جائے کہ اس کے بغیر وہ دین سمجھ میں نہیں آسکتا، جس نے اس زبان کو اپنی دعوت و تفہیم کا ذریعہ بنایا اور اس کے بغیر اس کے

مضمرات، صحیح مقاصد اور صحیح روح سمجھ میں نہیں آسکتی، اس مقصد سے اس زبان وادب میں ڈوب جانا پڑتا ہے، اس کے ذوق اور اس کی روح کو اپنے اوپر طاری کر لینا ناگزیر ہو جاتا ہے، اس سلسلہ میں سب سے پہلے ایران کی مثال دیتا ہوں، ایران کو اپنی زبان پر ناز تھا، اور بجا طور پر ناز تھا، وہ ہم سب کے لئے ادب و تصوف، درد و محبت، نازک خیالی اور مضمون آفرینی کا خزانہ ہے، ہم آج بھی سعدیؔ، حافظ، مولانا رومؔ، جامیؔ و قدسیؔ، عرفیؔ و نظیریؔ کے کلام پر سر دھنتے ہیں، جب ایران نے عربی زبان میں درک پیدا کرنے اور اس میں کمال حاصل کرنے کی طرف (دینی اسلامی محرک سے) توجہ کی تو اس نے سیبویہؔ کو پیدا کیا، جس کی کتاب "**الکتاب**" اب بھی سند کا درجہ رکھتی ہے، اور نحو کی بنیادی کتابوں میں ہے، یا نحو کی بنیاد ہے، "**دلائل الاعجاز**" اور "**اسرار البلاغۃ**" کے مصنف عبدالقاہر جرجانی کو پیدا کیا، جس کی عربی ادب و شاعری کی نبض شناسی و مزاج دانی کے سامنے عربوں نے بھی سر تسلیم خم کر دیا، زمخشریؔ، سکاکیؔ، ابو علی فارسی کس کس کا نام لیا جائے، یہ سب عربی ادب اور زبان کے قواعد کے ایوان کے ستون ہیں، عربی علم لغت کو دیکھئے (جو بڑا نازک فن ہے) تو اس میں علامہ مجد الدین فیروزآبادی کی شخصیت نظر آتی ہے، جن کی کتاب "**قاموس**" آج تک ہمارے علمی و درسی حلقوں میں سب سے زیادہ مقبول و مستعمل ہے، ایران کے لئے عربی زبان میں کمال پیدا کرنے کا صرف مذہبی اخلاقی اور روحانی محرک تھا، عہد قدیم کے ذہین نوجوانوں اور باصلاحیت مسلمانوں نے اس نکتہ کو پالیا تھا کہ ہم قرآن مجید کے اسرار، حدیث کے رموز اور اصول فقہ کی نازک بحثوں سے اس وقت تک عہدہ برآ نہیں ہو سکتے جب تک کہ عربی زبان پر ہم کو استادانہ و محرمانہ عبور نہ ہو، اس

کا نتیجہ یہ ہے کہ ایران نے اس پایہ کے ائمہ نحو، اساطین عربیت، مجتہدینِ فن بلاغت، محققینِ لغت اور مفسر پیدا کئے جن کی نظیر خود عربوں میں ملنی مشکل ہے، حتیٰ کہ ابن خلدون جیسے نقاد کو لکھنا پڑا کہ "ان اکثر حملة العلم من العجم"

اب ہندوستان کی طرف آیئے، یہاں در اصل اسی محرک نے کام کیا، ہندوستان کے بلاد عربیہ سے سیاسی اور معاشی تعلقاب کی عمر آپ میں سے بہت سے لوگوں کی عمر سے کم ہے، ہندوستان میں اتنا عظیم الشان تحقیقی و مجتہدانہ کام علوم دینیہ و عربیہ پر انجام پایا، جس کی مثال خود بلاد عربیہ میں نہیں ملتی۔

میں نے ابھی آپ کے سامنے قاموس کا نام لیا ہے، میں جن زبانوں سے واقف ہوں ان میں میری معلومات میں کسی لغت کی اتنی مفصل شرح نہیں ملتی، جیسے قاموس کی شرح "**تاج العروس**" ہے، جس کے مصنف ہمارے جوار (اودھ) کے ایک فرزند فخرِ ہندوستان علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی ہیں، جو زبیدی کی نسبت سے مشہور ہیں، یہاں تک کہ بہت سے اچھے پڑھے لکھے لوگ ان کو یمنی سمجھتے ہیں، اس کتاب کو مصنف ہی کی زندگی میں (مجازاً، نہیں حقیقتاً) سونے میں تولا گیا، اس وقت کے عظیم ملوک و سلاطین نے ان کو اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی اور ان سے سندلی، مورخین نے لکھا ہے کہ قاہرہ میں ان کا دربار اس طرح لگتا تھا، جس طرح بادشاہوں کا دربار لگتا ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں سید مرتضیٰ کے لئے کیا محرک تھا؟ کیا سیاسی و معاشی محرک تھا؟ سیاسی محرک کا حال یہ ہے کہ تمام بلاد عربیہ اس وقت ترکی کے ماتحت تھے، اور ترکی کے سیاسی تعلقات کبھی بھی ہندستان سے باقاعدہ قائم نہیں ہوئے، سفارت خانوں کا دور ابھی نہیں آیا تھا، نہ ملازمتوں کا، سید مرتضیٰ کے لئے عربی زبان میں اس حد تک کمال پیدا کرنے کے

لئے کیا کشش (CHARM) تھا کہ وہ عربی زبان کی طرف ایسی توجہ کریں، اور قاموس کی ایسی شرح لکھیں کہ اگر علامہ مجد الدین فیروزآبادی زندہ ہوتے تو ان کا ہاتھ چومتے، دوسری طرف وہ حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کی زندہ جاوید کتاب ''**احیاء علوم الدین**'' کی شرح ''**اتحاف السادۃ المتقین شرح احیاء علوم الدین**'' کے نام سے تصنیف فرماتے ہیں، جو ایک دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کی حیثیت رکھتی ہے۔

علمی اصطلاحات کا فن سب سے نازک فن ہے، اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کسی جہاز پر گھڑی لگی ہوتی ہے، جس سے سمت متعین ہوتی ہے، اس میں اگر بال برابر بھی فرق آجائے تو جہاز کہیں سے کہیں پہونچ جائے، اسی طرح اگر آپ ——— نے کسی اصطلاح کو غلط سمجھا تو نہ آپ کتاب سمجھ سکیں گے نہ کسی علمی مسئلہ کی صحیح ترجمانی کر سکیں گے، عربی زبان کی علمی تاریخ میں اس موضوع پر سب سے بہتر دو کتابیں لکھی گئیں، ایک ''**دستور العلماء**'' دوسری ''**کشاف اصطلاحات الفنون**''''**دستور العلماء**'' مولانا عبد النبی احمد نگری کی تصنیف ہے، اور ''**کشاف اصطلاحات الفنون**'' کے مصنف بارہویں صدی ہجری کے عالم شیخ محمد اعلیٰ تھانوی ہیں، ان دونوں کتابوں کا جواب پورے عالم عربی میں نہیں ہے، اس موضوع پر صرف ایک چھوٹی سی قدیم کتاب خوارزمی کی مفاتیح العلوم ملتی ہے، میں نے یہ بات علماء عرب کے سامنے بھی کہی اور انھوں نے تسلیم کیا، غریب الحدیث (لغات حدیث) کے موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں، اس موضوع پر سب سے بڑی اور مستند کتاب ابن اثیر کی ''**نہایہ**'' ہے، لیکن اس موضوع پر سب سے جامع اور قابل اعتماد

کتاب جو دوسری کتابوں سے مستغنی کر دیتی ہے، علامہ محمد طاہر پٹنی کی کتاب "**مجمع بحار الانوار**" ہے، ۱۹۵۱ء میں قاہرہ میں اہل علم کے ایک جلسہ میں وہاں کے ایک بڑے ازہری عالم ڈاکٹر احمد شرباصی نے میرے تعارف میں کہا کہ یہ اس ملک کے باشندے ہیں، جس کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہاں "**مجمع بحار الانوار**" لکھی گئی، جس سے علماء ازہر بھی مستغنی نہیں ہو سکتے۔

دوسری طرف علوم دینیہ میں وہ کتابیں تصنیف ہوئیں جن میں سے بعض کی نظیر پورا کتب خانہ پیش نہیں کر سکتا، اس سلسلہ میں "**حجۃ اللہ البالغہ**" کا نام لے لینا کافی ہے، وہ حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتاب ہے، اور اسرار دین ومقاصدِ شریعت کے موضوع پر ہے، اس کے علاوہ یہاں اصول فقہ پر "**مسلم الثبوت**" جیسی کتاب لکھی گئی، جو عرصہ تک علماء ازہر کی بھی توجہ کا مرکز رہی، اور جس کی کثیر التعداد شرحیں ہیں۔

حضرات! میری اس گذارش کا مدعا یہ ہے کہ کسی زبان کی تحصیل اور اس میں حصولِ کمال کے محرکات میں سب سے طاقتور محرک دینی اور روحانی ہے، یہ محرک وہ جرِ ثقیل ہے، جو بڑی سے بڑی وزنی چیز کو چشم زدن میں سطح زمین سے اٹھا کر بڑے سے بڑے ایوان بلند پر پہنچا دیتا ہے، اور اس کے کچھ نمونے اور مثالیں میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہیں، جب صحیح جذبہ پیدا ہو جاتا ہے تو انسان اس زبان کے بولنے اور لکھنے والوں سے بھی بہت آگے بڑھ جاتا ہے، اس لئے کہ جب بات ٹھہری دینی اور اندرونی جذبہ کی، تو یہ جذبہ جتنا زیادہ قوی ہوگا اسی قدر زبان وقلم میں طاقت وتاثیر پیدا ہوگی، اگر عربی زبان کا کوئی طالب علم قرآن مجید کو اس کی اصل روح کے ساتھ سمجھنا چاہے گا، اور اس پر محنت کریگا تو میں آپ کو یقین دلاتا

چاہتا ہوں کہ وہ بڑے سے بڑے عرب سے بڑھ جائے گا، ذہانت اور اندرونی صلاحیتوں کو حرکت میں لانے والی سب سے بڑی طاقت، عشق اور جذبہ ہے، یہی چیز تھی، جس نے اقبالؔ کی زبان سے فارسی کا وہ کلام نکلوایا جس کی جدید ایران مثال نہیں پیش کر سکتا، لاہور میں بیٹھ کر (جب کہ وہ پنجابی بولتے تھے) ان سے اردو زبان میں وہ اشعار نکلوائے جس کو پڑھ کر خون کی گردش میں تیزی پیدا ہو جاتی ہے، اور لکھنؤ و دہلی والوں کو بھی ماننا پڑا کہ کلام اقبال میں جو سوز دروں اور تجلی کا اثر ہے، اس میں جو بلند مضامین ہیں، وہ ہمارے ان بڑے بڑے شعراء کے کلام میں نہیں جو اس سوز دروں سے محروم ہیں، آپ ایک نعت ہی کو دیکھ لیجئے، فارسی، اردو کے نعتیہ کلام میں جو تاثیر جو زندگی اور جو جوش و اثر ہے وہ عربی کے نعتیہ کلام میں (باستثناء چند) نہیں ملتا، ۱۹۵۶ء میں دمشق میں ایک مجلس میں جس میں یونیورسٹی کے شعبۂ زبان وادب کے بعض بڑے اساتذہ اور شہر کے ادباء موجود تھے، ایک صاحب نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ بتایئے کہ عربی کے نعتیہ کلام میں وہ اثر کیوں نہیں ہے جو فارسی، اردو کے نعتیہ کلام میں ہے (جیسا کہ آپ کے ترجموں اور آپ کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے) میں نے کہا اس کے دو اسباب ہیں، ایک تو احساسِ فراق اور بعد، جن لوگوں نے یہ کلام کہا جامیؔ ہوں یا قدسیؔ، اقبالؔ ہوں یا ظفرؔ علی خاں، ماہرؔ القادری ہوں یا امجد حیدر آبادی، ان کے اندر اشتیاق اور بعد و محرومی کا احساس تھا، دوسرے سوزِ دروں اور تڑپ جس کی وجہ سے انکے اندر سے مضامین ابلے، اور کلام میں تاثیر پیدا ہوئی، یہی حال اس دور کے ان دعوتی مضامین کا ہے، جو بعض ہندوستانی داعیوں کے قلم سے عربی میں نکلے اور اسی جذبہ اور پس منظر نے عربی انشاء وادب کا ایک نیا اسلوب پیدا کر دیا جس میں وہ طاقت و دل آویزی ہے، جس سے بڑے بڑے عرب

ادباء اہل قلم بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے اور بارہا ان کی آنکھیں اشکبار ہوئیں۔

حضرات! میں عربی زبان کی سیاسی و معاشی اہمیت وافادیت کا انکار نہیں کرتا، لیکن آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ آپ اس کے ساتھ اس بنیادی حقیقت کا اضافہ کریں کہ اس کا اصل فائدہ دین کو صحیح طور پر سمجھنا، قرآن وحدیث کے مضمرات کو قرآن وحدیث کی ہی زبان میں ان کے لانے والے کے منشاء کے مطابق معلوم کرنے کی کوشش کرنا اور کچھ ''سوزِ دروں'' پیدا کرنا ہے، پھر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ عربی زبان آپ کے لئے اپنے خزانے اگل دے گی، میں آپ سے عرض کروں گا عربی زبان خالص سیاسی و معاشی زبان نہیں ہے، انسانوں، قوموں اور ملکوں کی طرح زبانوں کا بھی مزاج و منفرد شخصیت ہوتی ہے، عربی زبان کا مزاج نبوی، ایمانی اور دعوتی ہے، عرب شاعر نے کہا تھا۔

ومکلف الأشیاء ضد طباعها

متطلب فی الماء جذوة نار

(جو کسی چیز سے اس کی طبیعت کے خلاف کام لینا چاہتا ہے وہ ایسا ہے جیسے پانی سے کوئی آگ کا شعلہ لینا چاہے)

آپ کے اندر عربی زبان کی بنیادوں کے ساتھ ہمدردی اور دلچسپی کا جذبہ ہونا چاہئے، عربی زبان جن بنیادوں پر پیدا ہوئی، اور پروان چڑھی اور اس کا یہ حق ہوا کہ ہم ہندوستان میں بیٹھ کر اس کا مطالعہ کریں، اور اس میں کمال پیدا کریں، ہم کو ان بنیادوں کو اپنے اندر مستحکم کرنا چاہئے، اس وقت آپ دیکھیں گے کہ آپ عربی زبان میں اس سے کم وقت میں کمال پیدا کرلیں گے، جتنے وقت میں آپ دوسرے محرکات کے ماتحت پیدا کرسکتے ہیں، یہ سیمینار بڑے وقت پر اور بڑے اہم وضروری

مقاصد کے ماتحت ہو رہا ہے، نصاب و طریقۂ تعلیم پر غور و فکر ہونا چاہئے، اور اس کو زیادہ مفید و مؤثر بنانے کی تدبیروں پر غور و خوض ہونا چاہئے، وہ مضامین آپ کے سامنے آئیں گے جو نصاب اور طریقۂ تعلیم سے بحث کرتے ہیں، ہم عربی مدارس کے اساتذہ اور ذمہ داروں کو بھی اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے، میں اپنے عزیز دوست ڈاکٹر عبد الحلیم ندوی سے درخواست کروں گا کہ وہ اس ادارہ کی طرف سے ان مضامین کے مجموعے شائع کریں، وہ اس سیمنار کی ایک اچھی یادگار اور ایک مفید کام ہوگا۔

قصہ سات جواں مردوں کا

یہ تقریر ۱۶ر اکتوبر ۱۹۸۲ء کو دس بجے دن کو اورنگ آباد آزاد کالج میں اساتذہ، طلبہ اور معززین شہر کے ایک بڑے اجتماع میں کی گئی، جس کی صدارت مشہور شاعر جناب سکندر علی وجد (سابق ممبر راجیہ سبھا) نے کی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قصہ سات جواں مردوں کا

اِنَّھُم فِتْیَۃٌ اٰمَنُوا بِرَبِّھِمْ وَزِدْنٰھُم ھُدًی وَّرَبَطْنَا عَلٰی قُلُوبِھِم اِذْقَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالارضِ لَنْ نَدعُوَا مِنْ دُونِہٖ اِلٰھًا لَقَد قُلْنَا اِذًا شَطَطًا (سورۂ کھف. ۱۳. ۱۴)

حضرات! میرے لئے یہ دوسرا موقعہ ہے کہ آپ کے ادارہ میں حاضر ہوا ہوں، اس ادارہ کی نسبت جس شخصیت سے ہے، اس سے میرے ادارہ (ندوۃ العلماء) اس کے سرپرستوں اور بزرگوں، فضلاء اور کارکنوں کے بڑے قریبی تعلقات رہ چکے ہیں، مجھے بھی ان سے ذاتی طور پر نیاز حاصل تھا، اور وہ شفقت فرماتے تھے، یہ عزیز نسبت پھر اس ادارہ کا جائے وقوع شہر اورنگ آباد دونوں میری نظر میں اہمیت رکھتے ہیں، آپ کے اس شہر اورنگ آباد کے ساتھ ایک تاریخ وابستہ ہے، محض عسکریت کی تاریخ نہیں، فتوحات کی تاریخ نہیں، حوصلہ مندی اور عزیمت کی تاریخ اور فقر و درویشی کی تاریخ بھی وابستہ ہے، میں اس کو ہندوستان کا غرناطہ کہتا ہوں، مجھے غرناطہ جانے کا بھی شرف حاصل ہوا ہے، مجھے اورنگ آباد اور غرناطہ کی تاریخ میں بڑی مماثلت نظر آتی ہے، لیکن یہ ایک مستقل تقریر، یا ایک

مفصل مقالہ کا موضوع ہے۔

حضرات! میں نے آپ کے سامنے سورۂ کہف کی ایک آیت پڑھی ہے، اس کا عنوان اگر اس زمانہ کے اسلوب اور اسٹائل میں مقرر کروں تو کہوں گا "قصہ سات جواں مردوں کا" اس قصہ میں نسل انسانی کے نوجوان عنصر کے لئے خصوصی پیغام اور ایک اعلیٰ نمونہ ہے، جو ہر زمانہ میں کام دے سکتا ہے، اور جو صرف دماغ ودل پر نہیں، بلکہ صلاحیتوں، حوصلوں اور عزائم پر بھی ایک تازیانہ کا کام دے سکتا ہے، وہ کبھی شبنم ٹپکاتا ہے، کبھی پھول کی چھڑیاں لگاتا ہے، مجھے بھی آج نوجوانوں کے سامنے نوجوانوں کا قصہ سنانا ہے، اور میں کیا سناؤں گا، قرآن مجید سناتا ہے، یہ وہ نوجوان ہیں جن کو قرآن نے ان کا تذکرہ کر کے لافانی بنادیا ہے، اور ہر دور کے نوجوانوں کے لئے قابل تقلید نمونہ اور آئیڈیل بنادیا ہے، بات بڑی مختصر، بڑی سادہ، لیکن بڑی عمیق اور سبق آموز ہے۔

قصہ یہ ہے کہ رومن امپائر کے ایک حصہ میں جو شام وفلسطین کہلاتا ہے، ایک دعوت پیدا ہوئی، جس کے لانے والے سیدنا مسیحؑ تھے، جو ہم مسلمانوں کے نزدیک بھی خدا کے پیغمبر برحق ہیں، انھوں نے توحید کی دعوت دی، اس وقت ساری دنیا میں شرک پھیلا ہوا، اور ہر طرف گھٹاٹوپ تاریکی چھائی ہوئی تھی، اس اندھیرے میں ایک روشنی چمکی، حضرت عیسیٰؑ نے شرک، نسل پرستی، رسم پرستی، توہم پرستی، ظاہر پرستی، اور انسانیت کے استحصال کے خلاف ایک آواز بلند کی، جس کی اصل اساس توحید، اور سچی خدا پرستی تھی، اس دعوت کو کچھ لوگوں نے تسلیم کیا اور وہ اس کے حامل وداعی بن گئے، انھوں نے اپنے اس قلمرو سے باہر قدم نکالا، اور رومی شہنشاہیت کے مرکز کے قریب جاکر دعوت پیش کی، اکثر دیکھا گیا ہے، کہ

سن رسیدہ اور پختہ کار لوگوں کے مقابلہ میں (جن کے پاؤں میں تجربات، مفادات، رسم ورواج، اور خوف وامید کی بھاری بیڑیاں پڑی ہوتی ہیں، اور ان کو کسی نئے تجربے اور انقلابی اقدام سے باز رکھتی ہیں) نوخیز اور جواں سال (جن کے پاؤں میں یہ بیڑیاں نہیں ہوتیں) اور ان کی وابستگیاں، اور ان کا (ATTACH-MENT) ان چیزوں کے ساتھ نہیں ہوتا، جن کے ساتھ عموماً بڑی عمر والوں کا ہوا کرتا ہے، نئی اور صالح دعوت کو جلد قبول کر لیتے ہیں، قرآن مجید ان نوجوانوں کی عمر کا تعین نہیں کرتا، اور یہی قرآن مجید کا طریقہ ہے، اگر وہ کہتا کہ ۱۸۔۲۰ سال کے نوجوان تھے، تو اس سے اوپر اور اس سے نیچے کی عمر والوں کو بہانہ مل جاتا کہ ہمارا قصہ نہیں ہے، قرآن کہتا ہے "انھم فتیة" وہ چند نوجوان تھے، جو حضرات عربی کا ذوق رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ "فتیة" کے لفظ میں عمر کی جوانی کے ساتھ دل ودماغ، اور حوصلوں اور عزم وارادہ کی جوانی کی طرف بھی اشارہ آگیا ہے، اس لئے اس کے ترجمہ میں میں نے "**جواں مرد**" کا لفظ اختیار کیا، "فتیة" "فتی" کی جمع ہے "فتی" کی جمع "فتیان" بھی آتی ہے، لیکن "فتیة" جمع قلت کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس طرح قرآن اشارہ دیتا ہے کہ وہ گنتی کے چند نوجوان تھے، اور یہی ہمیشہ ہوا ہے کہ جب خدا پرستی اور اصلاح حال کی صحیح دعوت آئی ہے تو اس کے ماننے والے ابتدا میں تھوڑے ہوئے ہیں، جن کو خدا نے اس کی توفیق دی اور ان کو یہ ہمت ہوئی۔

اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے اپنے اسمائے حسنیٰ اور صفات میں سے "رب" کا لفظ استعمال فرمایا ہے "انھم فتیة آمنوا بربھم" یہ بات بہت معنی خیز ہے، اس لئے کہ حکومتوں کو اپنے یہاں کے باشندوں کا رازق ہونے کا بھی (کبھی زبان قال سے اور کبھی زبان حال سے) دعویٰ ہوتا ہے، اور ان کے ساتھ اس طرح کے خیالات اور

عقیدے وابستہ ہو جاتے ہیں کہ اگر اپنی پرورش کا سامان کرنا ہے، اور عزت وراحت کی زندگی گذارنی ہے، تو ان حکومتوں سے اپنے کو متعلق کرنا پڑے گا، ان کا حاشیہ بردار ہو کر رہنا، اور ان کی رکاب میں چلنا پڑے گا، ان کی ہاں میں ہاں ملانا ہوگا، اس کے بغیر رزق اور خوش حال وفارغ البال زندگی کے دروازے یکسر بند ہیں، قرآن جو لفظ کہتا ہے، وہ اپنی جگہ پر انگوٹھی میں نگینہ کا کام دیتا ہے، پوری پوری کتابوں کا مضمون ایک لفظ میں آجاتا ہے، یہ جواں مرد انسانوں کے اس جنگل میں کھڑے ہو گئے، جہاں اس رومن امپائر کا جھنڈا لہرا رہا تھا، جو اس وقت دنیا کی سب سے منظم، سب سے متمدن، دنیا کو اس وقت کا سب سے ترقی یافتہ قانون دینے والی، دنیا کے سب سے وسیع خطہ پر حکومت کرنے والی شہنشاہی تھے، انگریزی محاورہ کے مطابق اس حکومت کی ناک کے نیچے، اور بالکل آنکھوں کے سامنے چند نوجوان کھڑے ہو جاتے ہیں، اور اس دعوت کو قبول کر کے اس کا اعلان کرتے ہیں، جو اس وقت کا صحیح مذہب، اور اس عہد کا اسلام تھا، اس وقت تک مسیحیت میں تحریف نہیں ہوئی تھی، اس کے وہ داعی وہاں پہونچے تھے، جو حضرت عیسیٰؑ کے پیغام کے صحیح علمبردار تھے، انھوں نے کہا کہ ہمارا رازق، اور ہماری پرورش کا ذمہ دار حکومت نہیں ہے، ہمارا رازق اور پروردگار خدا ہے، اور وہی ہماری پرورش کا ذمہ دار ہے، "ربنا رب السموت والارض" ہماری پرورش کرنے والا وہ ہے، جو آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے، یہ بات اس منظم سلطنت میں کہی گئی تھی، جس نے وسائل معیشت پر قبضہ کر رکھا تھا، گویا وہاں کے باشندوں کی قسمت وروزی کی مالک بن گئی تھی اور بظاہر نفع وضرر کی ساری طاقتیں اس کے ہاتھ میں آگئی تھیں، اس وقت دانشمندی اور حقیقت پسندی کا ایک ہی ثبوت تھا کہ حکومت کے دامن سے وابستہ

ہو کر حکومت کے عقیدہ کو اختیار کر کے کم سے کم اس عقیدہ پر سکوت اختیار کر کے اس قلمرو میں اچھی زندگی گذاری جائے، انھوں نے پوری یونانی دیومالا (GREEK MYTHOLOGY) اور رومی دیومالا۔ (ROMANMY-THOLOGY) کا انکار کیا، جو اس وقت کی رومی تہذیب، تمدن و معاشرت، اور عقائد و اعمال میں سرایت کر چکی تھی، اور پورا معاشرہ مشرک، اور توہم پرست بن گیا تھا، یونان اور رومہ (اور قدیم ہندوستان میں بھی) صفات الٰہی کا تصور دیوتاؤں کی شکل میں کیا جاتا تھا، اور ان کے نام پر بڑے بڑے معبد اور ہیکل بنے ہوئے تھے، یہ محبت کا دیوتا ہے، یہ شفقت کا، یہ روزی دینے کا، یہ جنگ کا، یہ ہیبت و جلال کا، یہ بارش کا، ان نوجوانوں نے بیک زبان ان سب کا انکار کیا اور کہا:۔

رَبُّنَا ربُ السمٰوٰتِ والاَرضِ لَن نَّدعوَا مِنْ دونہٖ اِلٰھاً لَقَد قُلنَا اذاً شَطَطاً ھٰؤلاءِ قومُنَا اتخذُوا مِن دُونہٖ الھۃ لَو لا یاتُونَ عَلیھِم بِسُلطٰنٍ بینٍ فَمَنْ اَظلَمُ مِمَّنِ افترٰی عَلی اللّٰہِ کَذِباً (الکھف ۱۴، ۱۵) ہمارا پروردگار آسمانوں اور زمین کا مالک ہے، ہم اس کے سوا کسی کو معبود سمجھ کر نہ پکاریں گے (اگر ایسا کیا) تو اس وقت ہم نے بعید از عقل بات کہی، ہماری قوم کے ان لوگوں نے اس کے سوا اور معبود بنا رکھے ہیں، یہ (ان کے خدا ہونے پر) کوئی کھلی دلیل کیوں نہیں لائے۔

یہاں قرآن مجید نے ایک اور حقیقت بیان کر دی وہ یہ کہ پہلا قدم آدمی کی طرف سے اٹھتا ہے، پہلے ہمت اس کی طرف سے ہونی چاہئے، اس کے بعد اللہ کی طرف سے مدد آتی ہے "امنُوا بِربھم وَزِدنٰھم ھُدًی" (وہ اپنے رب پر ایمان لائے، اور ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا) اگر آدمی اس کا منتظر رہے کہ کوئی چیز خود بخود دل میں نفوذ کر جائے، یا اس کے گلے منڈھ دی جائے، تو یہ صحیح نہیں، پہلے خود

فیصلہ اور ہمت کرنی ہوگی، اس کے بعد خدا کی مدد آتی ہے، فرماتا ہے "وربطنا علیٰ قلوبھم" (ہم نے ان کے دلوں کو سہارا دیا) اس لئے کہ ان کا واسطہ اس زمانہ کی سب سے عظیم اور قہرمان سلطنت سے تھا، وہ "سرکاری" مذہب کو چھوڑ کر نیا دین اختیار کر رہے تھے۔

یہ اصحابِ کہف کا واقعہ ہے، مجھے شرق اردن کے سفر ۱۹۷۳ء میں اس غار کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، جہاں وہ محو خواب ہیں، اردن کے آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر محقق فاضل رفیق وفاالدجانی صاحب نے اس کی زیارت کرائی، اور علمی وفنی دلائل سے ثابت کیا کہ یہی اصحابِ کہف کی جگہ ہے، تاریخ بتاتی ہے، کہ اس واقعہ کو صدیوں تک نظم کیا جاتا رہا ہے، اور وہ وہاں کی ادبیات کا ایک جزء بنا رہا ہے، میں نے بہت تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب "معرکۂ ایمان ومادیت" میں تقابلی مطالعہ کی روشنی میں اس پر نظر ڈالی ہے، تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ ان نوجوانوں میں سے اکثر اہل دربار کی اولاد تھے، یعنی یہ سلطنت کے خاندانی نمک خوار تھے، کسی کے باپ، کسی کے چچا، کسی کے بڑے بھائی، اس وقت رومن امپائر کے کسی بڑے عہدے پر فائز تھے، اس لئے یہ مسئلہ اور زیادہ پیچیدہ اور نازک بن گیا کہ بات صرف اتنی نہ تھی کہ چند بے تعلق اور سر پھرے نوجوان کھڑے ہو گئے، انھوں نے بغاوت کا نعرہ لگایا، اور کہدیا کہ ہم سرکاری مذہب کو نہیں مانتے، ہم نے ایک نیا دین قبول کیا ہے، یہ وہ لوگ تھے، جن کے ساتھ پورے خاندان اور ان خاندانوں کی قسمت اور عزت وابستہ تھی ان کے اس اقدام سے ان کے والدین، ان کے خاندان کے بزرگ اور ذمہ دار نازک پوزیشن میں مبتلا ہو گئے، ان سے براہ راست سوال کیا جا سکتا تھا کہ تم نے اپنے فرزندوں اور خوردوں کو اس باغیانہ اقدام سے کیوں نہیں روکا؟ دوسری

طرف خود ان بزرگان خاندان کے لئے ایک بڑی آزمائش تھی، کہ وہ ان نوجوانوں کے متکفل تھے، وہ ان سے بڑی امیدیں رکھتے تھے، اور ان کو ان کا مستقبل شاندار نظر آتا تھا، ایک جگہ قرآن مجید نے اس نفسیاتی کیفیت کو جو خاندان کے بزرگوں اور ذمہ داروں کو نوجوانوں کے اس طرح کے اقدام سے پیش آتی ہے، بڑے بلیغ انداز میں بیان فرمایا ہے، جب حضرت صالحؑ نے قوم ثمود میں توحید اور دینِ حق کی دعوت پیش کی، تو قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے بڑے درد اور دل کی چوٹ کے ساتھ کہا کہ صالح! تم سے تو آئندہ کے لئے بڑی امیدیں اور توقعات وابستہ تھیں، خیال تھا کہ تم سیدھے سیدھے اس لائن پر چل کر (جس پر قوم چل رہی ہے) اور اس میں کچھ امتیاز پیدا کر کے اپنے خاندان کا نام روشن کرو گے، اور اپنی قوم کے لئے عزت وافتخار کا باعث ہو گے "قالوا یٰصلح قد کنت فینا موجوا قبل ھذا" (صالح تم تو ہماری امیدوں کا مرکز تھے) تم نے ہماری امیدوں پر پانی پھیر دیا، تم یہ نئی دعوت لے کر کھڑے ہو گئے، اور پوری قوم کو مخالف بنالیا "**مرجو**" کا تقریباً وہی مفہوم ہے، جو انگریزی میں لفظ (PROMISING) کا ہے، جو کسی ایسے ہونہار طالب علم، یا نوجوان کے لئے بولا جاتا ہے، جس کا مستقبل درخشاں نظر آتا ہے۔

یہ نوجوان گنتی میں بہت تھوڑے تھے، اور بعض قرائن وقیاسات کی بناء پر سات سے زیادہ ان کی تعداد نہیں تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ کئی سو آدمیوں کی قسمت وابستہ تھی، ہر ایک کے ساتھ پورا پورا خاندان اور برادری کا سلسلہ تھا، اور وہ سب ان کے اس اقدام کی وجہ سے خطرہ میں پڑ گئے تھے، اور شک کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے تھے، وہ کتنے خاندانوں کی امیدوں کا مرکز تھے، اور کتنے گھروں کی ترقیاں وخوش حالیاں ان سے وابستہ تھیں؟ اس کی طرف لوگوں کی کم

نظر جاتی ہے، بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ سات آٹھ کا معاملہ کیا؟ پکڑے گئے تو پکڑے گئے، اور مارے گئے تو مارے گئے! اگر زندگی کی آسائشوں سے محروم ہوئے تو سات ہی آدمی تو محروم ہوئے، یہ نہیں سوچتے کہ معاملہ کبھی ایک اکیلے آدمی کا نہیں ہوتا، متمدن زندگی میں فرد واحد (اکائی) کا تصور مشکل ہے، شعراء تو اس کا تصور کر سکتے ہیں، لیکن واقعات کی دنیا میں اکثر فرد واحد کا وجود نہیں ہوتا، اس کے تعلقات وروابط کتنے لوگوں سے ہوتے ہیں، اس لئے فرد واحد، فرواحد نہیں ہوتا، اگر یہ سات بغاوت کرتے ہیں، تو سمجھئے کہ ستر خاندان زد میں آجاتے ہیں، اس لئے مسئلہ بہت اہم تھا، اور اسی لئے قرآن مجید نے اس کو بطور مثال پیش کیا ہے، اس وقت تاریخ کی کتابوں میں یہ تفصیل نہیں مل سکتی کہ کس کس طرح سے ان کو ڈرایا دھمکایا گیا، اور کس کس طرح کی ان کو لالچیں دی گئیں، اور سبز باغ دکھائے گئے، ایسے اقدامات سے روکنے لئے (خاص طور پر جبکہ مقابلہ میں نوخیز اور نوجوان ہوں) ترہیبات (ڈرانے والی چیزوں) کے ساتھ ترغیبات (راغب کرنے والی چیزیں) بھی ہوتی ہیں، اور اکثر ترہیبات کے مقابلہ میں ترغیبات زیادہ مؤثر اور کامیاب ثابت ہوتی ہیں، ایک بزرگ نے جن کا دونوں چیزوں سے واسطہ پڑا تھا، فرمایا کہ توڑے، کوڑوں سے زیادہ نازک ہوتے ہیں، طاقتیں اور حکومتیں کبھی کوڑے سامنے لاتی ہیں، اور کبھی توڑے بھی، انھوں نے کوڑوں کو بھی سہہ لیا، اور توڑوں کا بھی توڑ کر لیا، اور یہ اس لئے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو قوت وسکون، اور صبر وتحمل، اور قربانی وایثار کی دولت عطا فرمائی "وربطنا علیٰ قلوبھم"

ہمیشہ ملک ومعاشرہ اس وقت بچا ہے، جب کچھ لوگوں نے اپنے مستقبل کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں، وہ ناسمجھ اور غیر متوازن (ABNORMAL) بھی

نہیں تھے، ان کی گفتگو بتاتی ہے، یہ وہ صحیح الحواس، صحیح الدماغ، دانا اور فرزانہ نوجوان تھے، لیکن بات یہ تھی کہ ان کی روح صرف اس بات سے تسکین نہیں پاسکتی تھی کہ ان کو روٹی کپڑا ملتا رہے، ان کے ذہن میں یہ تھا کہ یہ تو کسی امیر گھر کے کتے کا راتب ہے، اس کو بعض اوقات ایسا اچھا دودھ ملتا ہے، جو بہت سے غریب گھرانوں کے بچوں کو نصیب نہیں ہوتا، اور وہ ایسے ناز و نعم سے رکھے جاتے ہیں، جس کا بہت سے انسان (جو اشرف المخلوقات ہیں) خواب بھی نہیں دیکھ سکتے، لیکن ہزار ناز پروردہ کتے ایک ایسے فاقہ کش انسان پر قربان جس کو معرفت الٰہی اور ایمان کی دولت حاصل ہے، اور اللہ نے اس کو اپنے ہم جنس انسانوں کی فکر اور درد نصیب کیا ہے، وہ طے کر لیتے ہیں کہ ہمیں اپنی جگہ بنانی نہیں ہے، اور جانوروں کی طرح کھاپی کر دنیا سے رخصت نہیں ہو جانا ہے، ہمیں اپنے کو بھی اس خطرے اور ہلاکت سے بچانا ہے، جو غلط عقائد کو غلط مقاصد، غلط اعمال، اور خراب اخلاق کی صورت میں ہمیں پیش آنے والا ہے، اور اپنی قوم، ملک اور معاشرہ کو بھی ان مصیبتوں اور خطروں سے بچانا ہے، جو ان کے سر پر منڈلا رہے ہیں، انسانی تاریخ اس کی شہادتیں فراہم کرتی ہے کہ ایسے باہمت افراد کامیاب ہو جاتے ہیں، اور پوری پوری قوم اور ملک کو اپنی آسائش اور ملک کی قربانی دے کر بچالے جاتے ہیں، انسانیت کی آبرو انھیں کے دم سے ہے، اور امن وامان، صلاح و فلاح، حق و صداقت اور دعوتِ حق کا تسلسل انھیں سے قائم ہے۔

عزیز ان گرامی! اس وقت ہمارا ملک دینی و ایمانی، انسانی و اخلاقی بحران (CRISIS) سے دوچار ہے، دینی و ایمانی خطرے کو میں اس وقت بیان نہیں کروں گا، اس کے لئے مستقل وقت اور موقعہ چاہئے، اخلاقی بحران کی طرف اشارہ کرتا ہوں (ہمارا ملک اخلاقی طور پر اس وقت احتضار کی کیفیت "**سکرات**" سے

دوچار ہے، وہ کوہ آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہے، پورے ملک میں کرپشن وبا کی طرح پھیلا ہوا ہے، کارکردگی، فرض شناسی، محنت کوشی، جفاکشی، اپنے ملک سے سچی محبت، اور اپنے ہم وطنوں کے ساتھ ہمدردی عنقا ہے، انتظامیہ میں دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص اس لئے بیٹھا ہوا ہے کہ اپنی جیب بھرے، وہ قابلِ رشک انسان ہے، جو جیب کے بجائے کاغذ کا پیٹ بھرنے (اپنا وقت پورا کرنے) کی فکر میں ہے، اگر کوئی سامنے آتا ہے تو غور سے دیکھا جاتا ہے کہ اس سے کتنی بڑی رشوت لی جاسکتی ہے، غور سے اس لئے نہیں دیکھا جاتا ہے کہ چہرہ کیا بتاتا ہے، کہ وہ کس (STANDARD OF LIVING) سے تعلق رکھتا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ مدت کے بعد اپنے وطن آنے والے مسافر کو بجائے وطن پہونچنے کی خوشی کے سہم چڑھ جاتا ہے کہ معلوم نہیں اس کو کس ذلت اور کس مصیبت سے واسطہ پڑے، اور کس کو کیا رشوت دینی پڑے، یہ کیوں نہیں ہوتا کہ ہندوستانی اپنے ملک کی سرحد پر (خواہ وہ ہوائی یا زمینی) آکر عزت وسکون محسوس کرے اور خوش ہو کہ ہم اپنے گھر آئے، میں آپ کو یہ دعوت نہیں دیتا کہ آپ کالج چھوڑ کر قوم وملک کی خدمت میں لگ جائیں، آپ ٹھوس خدمت جبھی کر سکیں گے، جب آپ اچھی طرح پڑھیں گے، تعلیم میں امتیاز حاصل کریں گے، اور یہاں سے نیک نام ہو کر نکلیں گے، میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ اچھے کارگذار، فرض شناس، محبِ وطن، اور اگر مسلمان ہیں تو اچھے مسلمان بنیں، آپ کے اندر مدد کا جذبہ ہونا چاہئے، آپ کے اندر کام کرنے سے وہ خوشی ہونی چاہئے، جو آرام کرنے سے نہیں ہوتی، اس وقت پورے ملک کا نظام ڈھیلا ہو گیا ہے، اور عام زندگی مشکل ہو گئی ہے، کس کس محکمہ، کس کس شعبۂ زندگی کا رونا رویا جائے۔

میں اپنے مسلمان بچوں سے خاص طور پر کہتا ہوں، کہ کسی کا یہ اخلاقی یا شہری فرض ہو، تمہارا تو یہ مذہبی فرض ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَیلٌ لِلمُطَفِّفِینَ الذینَ اِذَااکتالُو ا عَلَی النَّاسِ یَستَوفُونَ وَاذَا کَالُوھُم اَووَزَنُوھُم یُخسِرُون (ناپ اور تول میں کمی کرنے والوں کے لئے خرابی ہے، جو لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیں، اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو کم دیں) کتنی بڑی حقیقت خدا نے بیان کی ہے، یہ صرف دودھ کی دکان، یا پرچون کی دکان کا معاملہ نہیں "**تطفیف**" (کم تولنا اور ڈنڈی مارنا) کا عمل پوری زندگی میں ہو سکتا ہے، آج ہمارا پورا انتظامی ڈھانچہ اور معاشرہ "**مطفف**" بن گیا ہے، سب کا مرض "**تطفیف**" ہے، اپنا حق پورا وصول کرنا، یا وصول کرنے کے لئے لڑنا، اور دوسروں کا فرض نہ ادا کرنا، یا ادھورا ادا کرنا، اگر آپ کو ہندوستان میں باعزت زندگی گذارنی، اور اپنا مقام پیدا کرنا یا اپنا مقام محفوظ رکھنا ہے، تو اس کا ذریعہ صحیح دین داری، بلند و بے داغ کردار اور عملی نمونہ پیش کرنا ہے، اگر آپ اس ملک کی قیادت بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو اس کا راستہ بھی یہی ہے کہ آپ اپنے دین کی تعلیمات، قرآن کی ہدایت، اپنے پیغمبر ﷺ، اور صحابہ کرامؓ کے اسوہ سیرت پر چلیں، اور ان جواں مردوں کی تقلید کر کے (جن کا قصہ قرآن کی سورۂ کہف میں بیان کیا گیا ہے) اپنے مستقبل اور ترقی کے امکانات کو خطرہ میں ڈال کر ملک کو (اور اگر اللہ ہمت بلند اور نظر وسیع کرے) تو انسانیت کو خطرے سے بچانے کی کوشش کریں، اکبر الہ آبادی نے صحیح کہا ہے۔

ناز کیا اس پہ جو بدلا ہے زمانہ نے تمہیں
مردوہ ہیں جو زمانہ کو بدل دیتے ہیں

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

نصرتِ الٰہی کے شرائط اور نصرتِ اسلام کا سیدھا راستہ

یہ تقریر انجمن نصرۃ الاسلام ہال میں ۴؍نومبر ۱۹۸۱ء بروز چہار شنبہ ۴ بجے سہ پہر کو کی گئی، جہاں مقرر کے اعزاز اور وداع کی تقریب میں ایک عظیم جلسہ ہوا، جس میں سری نگر اور اطراف کے علماء واہل علم وفکر خاصی تعداد میں شریک تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نصرتِ الٰہی کے شرائط اور نصرتِ اسلام کا سیدھا راستہ

حمدہ صلوٰۃ و خطبۂ مسنونہ کے بعد!

جناب صدر انجمن و صدر اجلاس، علمائے کرام، معززین شہر اور برادرانِ عزیز! آج ایک ہفتہ کے قیام سری نگر کا اختتام اس جلسہ پر ہو رہا ہے، میں سمجھتا ہوں یہ محض اتفاق نہیں، حسن اتفاق ہے، میں دنیا کے بیشتر مشہور ممالک میں جا چکا ہوں، لیکن ایسا بد قسمت مسافر ہوں، جس پر اقبالؔ کا یہ مصرع صادق آتا ہے۔

تسکین مسافر نہ سفر میں نہ حضر میں

میں اسلامی ممالک میں جہاں جہاں گیا، وہاں سے بجائے مسرتیں لے کر اور مطمئن ہو کر آنے کے، فکر لے کر آیا، میرے نصیب میں یہی ہے، معلوم نہیں یہ میری بڑھی ہوئی ذکاوت حس کی بناء پر ہے، اس لئے کہ جہاں جاتا ہوں، وہاں اپنا تاریخی مطالعہ فراموش نہیں کر پاتا، جو واقعات تاریخ اسلام میں پیش آئے، وہ میری آنکھوں کے سامنے رہتے ہیں، اور ان سے جو نتائج نکالے جا سکتے ہیں، میرا دماغ ان سے آزاد نہیں ہونے پاتا، خود قرآن مجید نے اس کی مذمت کی ہے، کہ آدمی آنکھوں سے سب کچھ دیکھے، لیکن کسی چیز سے سبق نہ لے: وکاین من اٰیۃ فی

السموت والارض یمرون علیها وهم عنها معرضون (یوسف. ۱۰۵) کتنی نشانیاں زمین وآسمان میں ایسی ہیں جن پر سے لوگ منہ پھیر کر چلے جاتے ہیں، اور کچھ سبق نہیں لیتے۔

میں اپنے کو بہت خوش نصیب سمجھتا، اگر آپ کو پیام تہنیت دے جاتا، اور آپ کے اطمینان وسکون میں کچھ اضافہ کرتا، خدا نے آپ کو جو حسین سرزمین عطا فرمائی ہے، جن نعمتوں کی بارش کی ہے، جو قدرتی منظر آپ کو یہاں عطا کئے ہیں، بڑی خوشی کی بات ہوتی اگر میں آپ سے کہتا کہ آپ کو یہ سب مبارک ہو آپ مطمئن رہیں، کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔

لیکن ایسا نہیں ہے، اور اس کا بڑا سبب میرا قرآن مجید کا ٹوٹا پھوٹا مطالعہ ہے میں نے قرآن مجید کو اس نظر سے پڑھا کہ وہ ایک زندہ کتاب اور ایک بولتا ہوا مرقع یا آئینہ ہے، جس میں افراد بھی اپنے اپنے چہرے دیکھ سکتے ہیں، قومیں بھی اپنی صورتیں دیکھ سکتی ہیں، اور قوموں، سلطنتوں، تمدنوں کی ترقیات وعروج کے انجام بھی اس کتاب میں دیکھے جاسکتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : لَقَدْ انزلنَا اِلیکُم کتبًا فِیهِ ذِکرُ کمُ اَفَلا تَعقِلونَ (الانبیاء ۱۰) ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب نازل کی جس میں تمہارا تذکرہ موجود ہے، تم اس پر غور نہیں کرتے۔

"ذکر کم " کے معنی اور بھی مفسرین نے کئے ہیں، شرفکم،، عزکم، لیکن اس کے متبادل معنی یہی ہیں کہ اس میں تمہارا تذکرہ ہے فیہ حدیثکم تو قرآن مجید میں عمل، اور جزائے عمل کا بیان، اور اللہ تعالیٰ کا قانون مکافات پورا پورا موجود ہے، اس نے صاف صاف کہدیا ہے :لَیسَ بِاَمَانیکمُ وَلَا اَمَانی اهلِ الکتٰبِ مَن یَّعمَل سُوءًا یُجزَبهٖ (النساء ۱۲۳)

مسلمانو! نہ تم پر کچھ منحصر ہے، اور نہ اہل کتاب پر (جن کو بڑے دعوے ہیں، ہمارا قانون بے لاگ ہے، قانون الٰہی یہ ہے کہ "من یعمل سوء ا یجزبہ" جو کوئی برائی کرے گا اس کا بدلہ ملے گا، کمزوری کا، کوتاہی کا، غفلت کا، غداری اور بے وفائی کا، انتشار کا، اختلاف کا، بے عملی کا، دولت پرستی کا، اقدار پرستی کا، سب کا خدا کے یہاں ایک نتیجہ، ایک جزا ہے، جس میں کوئی استثناء، رورعایت، حصداری نہیں، یہ مضمون قرآن مجید میں کہیں صراحتا اور کہیں کنایۃ بیان کیا گیا ہے، اس میں قوموں کے، سلطنتوں کے، بڑے بڑے جبروں کے تذکرے بھی ہیں، اور کمزوروں کا ذکر بھی ہے، اس میں یہ آیت بھی موجود ہے :وَاَورثنَاالقومَ الَّذینَ کَانُوا یُستضعفونَ مَشارقَ الاَرضِ وَمَغاربَھا الّتی بٰرکنَا فِیھَا وَتَمّتْ کَلِمَتُ رَبکَ الحُسنٰی عَلیٰ بَنِی اِسرائیل بِمَا صَبرُوا وَدَمّرنَا مَاکَانَ یَصنَعُ فِرعَونُ وَقَومُہٗ وَمَاکَانُوایعرِشُونَ(الاعراف ۱۳۷)اور جولوگ کمزور سمجھے جاتے تھے ان کو زمین (شام) کے مشرق ومغرب کا جس میں ہم نے برکت دی تھی وارث کر دیا، اور بنی اسرائیل کے بارے میں ان کے صبر کی وجہ سے تمہارے پروردگار کا وعدۂ نیک پورا ہوا اور فرعون اور قوم فرعون جو (محل) بناتے اور (انگور کے باغ) جو چھتریوں پر چڑھاتے تھے سب کو ہم نے تباہ کر دیا۔

اور اس طریقہ سے دوسری جگہ فرمایا گیا ہے :۔وَنُرِیدُ اَن نَمنَّ عَلَی الذینَ استُضعِفُوا فِی الاَرضِ وَنَجعلھُم ائمۃً وَنجعلھُمُ الوٰرثینَ وَنُمَکّنَ لَھُم فِی الاَرضِ وَنُرِیَ فِرعَونَ وَھَامٰنَ وَجُنُودَھُمَا مِنھُمُ مَاکَانُوا یَحذَرُونَ (القصص ۵ .۶) اور ہم چاہتے تھے کہ ان پر احسان کریں جو ملک میں کمزور کئے گئے تھے، اور انھیں سردار بنادیں، اور انھیں وارث کریں، اور انھیں ملک پر قابض

کریں، اور فرعون اور ہامان اور ان کے لشکروں کو وہ چیز دکھادیں جس کا ان کو خطرہ تھا۔

اس طرح قرآن مجید قوموں، تاریخی ادوار، مختلف مراحل حیات، اور مختلف زندگیوں کے انواع واقسام کا ایک بولتا ہوا مرقع اور چمکتا ہوا صاف وشفاف آئینہ ہے، جس کا جی چاہے فرد ہو یا قوم، جماعت ہو یا انجمن، خاندان ہو یا قبیلہ، اس میں اپنی صورت دیکھ لے اور اپنی جگہ تلاش کرلے، اور اپنے متعلق خود فیصلہ کرے کہ ہمارے ساتھ کیا معاملہ ہونیوالا ہے، اللہ تعالیٰ سے کسی کا رشتہ نہیں، اس نے صاف صاف کہدیا ہے: وَقَالَتِ الیھودُ والنَّصٰریٰ نَحْنُ ابنٰؤُ اللہِ وَاحِبَّاؤُہٗ قُلْ فَلِمَ یُعذبکُم بِذنُوبِکُم بَل انتُم بَشَرٌ مِمَّن خَلق (المائدہ ۱۸) اور یہود ونصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں، کہدو پھر تمہارے گناہوں کے باعث تمھیں کیوں عذاب دیتا ہے، بلکہ تم بھی اور مخلوقات کی طرح ایک آدمی ہو۔

للکار کے فرمایا کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے کہا کہ ہمارا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے، ہم تو بالاتر ہیں، ہم انسانیت کی سطح سے بالاتر ہیں، ہم خدا کی اولاد ہیں، خدا کے چہیتے ہیں، لاڈلے بیٹے ہیں، تو اللہ اس کے جواب میں فرماتا ہے، کہ پھر خدا کا قانون مجازات تم پر کس طرح جاری اور ساری ہے، تمہاری رعایت کیوں نہیں کی جاتی؟ تم بھی ایسے ہی ایک انسان ہو، جیسے اور مخلوق۔

میرے بھائیو، بزرگو، اور دوستو!

میں آپ حضرات کے خلوص ومحبت، آپ کے اکرام واعزاز سے بہت متاثر ہوں، میں ناشکر گذار انسان نہیں بننا چاہتا، لیکن اس کا تقاضا یہ سمجھتا کہ میں آپ کو مطمئن کروں، اور آپ کی تعریف کر کے چلا جاؤں، جب کسی کو کسی سے محبت ہوتی ہے تو وہ خطرے کی نشاندہی کرتا ہے، وہ اس کے چہرے کو دیکھتا ہے، اس کی

نبض دیکھتا ہے، ہر وقت اس کا منہ دیکھتا رہتا ہے کہ خدانخواستہ کوئی تکلیف تو نہیں، میں آپ سے عرض کرتا ہوں، کہ آپ بہت نازک دور سے گذر رہے ہیں، میں انجمن نصرۃ الاسلام کے پلیٹ فارم سے بہتر کوئی پلیٹ فارم نہیں سمجھتا کہ آپ کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کروں جو عین "نصرت اسلام" ہے، اس انجمن کے بانی ہماری دعاؤں کے مستحق ہیں، کہ انھوں نے ایک مرکز قائم کیا جہاں بیٹھ کر اور جس کے ذریعہ وہ اسلام کی نصرت، کر سکیں، لیکن نصرت اسلام کا کام بہت وسیع ہے، اور آپ میں سے کوئی فرد کوئی مقتدر ہستی، کوئی قابل احترام بزرگ اس سے سبک دوش اور فارغ البال نہیں ہو سکتے۔

میرے بزرگو اور دوستو! حضرت عمرو بن العاصؓ نے جب مصر فتح کیا جو اس وقت دنیا میں تمدن کی چوٹی پر تھا، اور سر سبزی و شادابی میں اس پورے علاقہ کا کشمیر تھا، حضرت عمرو بن العاصؓ نے وہ خوبصورت ترقی یافتہ معدنی، حیوانی، انسانی، زمینی دولتوں سے بھر پور سرزمین فتح کی، ایک فاتح کو جو خوشی، جو اطمینان ہونا چاہئے تھا، وہ ان کو نہیں ہوا، اس لئے کہ انھوں نے صحبت نبویؐ پائی تھی قرآن مجید کے تدبر، اور صحبت نبویؐ کی برکت نے ان کی آنکھیں، بلکہ ان کا دل و دماغ روشن کر دیا تھا، ان کو اللہ تعالیٰ نے فراست مومن عطا فرمائی تھی، اور فراستِ ایمانی سے آگے ایک قدم فراست صحابیت عطا کی تھی، انھوں نے عرب مسلمانوں سے جو اس ملک کے فاتح اور حکمراں تھے، ایک بات کہی جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہے "**انتم فی رباط دائم**" دیکھو یاد رکھو تمہیں یہاں کی زمین، فضا کی دل کشی و رعنائی، یہاں کی دولتیں اور تمدن اپنے میں مشغول نہ کرنے پائے، اور تم اس سرزمین میں کھو نہ جانا، تم اپنے کو پالو، اور حقیقت کو پالو، وہ کیا ہے "**انتم فی رباط دائم**" تم ہر وقت ایک

اہم ناکہ پر کھڑے ہو، تم یہ نہ سمجھنا کہ تم نے قبطیوں کو شکست دی، اور رومن ایمپائر کے بہترین علاقہ پر تمہارا قبضہ ہو گیا، جزیرۃ العرب بالکل قریب ہے، اور یہاں تم نے پورے انتظامات کر لئے ہیں، اس پر تم دھوکہ نہ کھانا "انتم فی رباط دائم" تم اسی جگہ کھڑے ہو کہ آنکھ جھپکی اور مارے گئے، تمہیں، یہاں ہر وقت بیدار رہنا چاہئے، ہر وقت چوکنا رہنا چاہئے، تم ایک پیام کے علمبردار ہو، تم ایک دعوت لے کر آئے ہو، تم ایک سیرت لے کر آئے ہو، اگر دعوت سے تم نے غفلت کی تو تم مارے گئے، اور اگر تم نے اپنی سیرت کھودی جو تم عرب سے لے کر آئے تھے، تو تمہیں کوئی برتری حاصل نہیں ہو گی، اگر تم نے کبھی یہ سمجھا کہ تم کھانے کمانے کے لئے یہاں آئے ہو، تم یہاں کی سرزمین سے، یہاں کے حسن وجمال سے متمتع ہونے کے لئے آئے ہو، تم یہاں کے عیش وعشرت میں پڑ گئے، اور تم نے ذرا سی بھی غفلت کی، تو پھر تم پر کوئی رحم نہیں کھائے گا، تم یہاں بچ نہیں سکتے۔

آج سے ساڑھے چودہ سو برس پہلے جو بات عرب کے ایک سپاہی نے جو کسی دانشگاہ کا تعلیم یافتہ نہیں تھا، کہی تھی، آج وہی بات صادق ہے، آج بڑے بڑے اسلامی ملکوں میں یہ بات صادق ہے کہ "انتم فی رباط دائم" آپ کی ذمہ داری ہے، اور ہر فرد کی ذمہ داری ہے، جس وقت جزیرۃ العرب میں ارتداد کی آگ پھیل گئی تو یہ سب کی ذمہ داری تھی، لیکن ذمہ داری کے احساس میں فرق ہوتا ہے یہی فرق آدمی کو بڑا اور زندہ جاوید بناتا ہے، ابوبکر صدیقؓ اس وقت خلیفۂ وقت تھے، انھوں نے کہا "اینقص الدین وانا حی" کی میرے جیتے جی دین میں کوئی کتر بیونت ہو سکتی ہے، کوئی قطع وبرید ہو سکتی ہے، ؟ حیف ہے میری زندگی پر، اگر میرے سامنے شریعت اسلامی میں ترمیم ہونے لگے، اور اس کے فرائض واحکام میں

انتخاب کیا جانے لگے کہ نماز تو ٹھیک، حج بھی ٹھیک، روزہ بھی ٹھیک، لیکن زکوۃ نہیں، یا زکوۃ بھی ٹھیک روزہ نہیں، میں زندہ ہوں، اور میرے سامنے یہ تحریف ہو؟ یہ ہو نہیں سکتا!

بس یہ حمیت تھی جو اُبل کر ان کی زبان پر آئی، اور یہ لفظ ان کی زبان سے نکلے، اور اس نے زمانہ کی کلائی موڑدی، اور تاریخ کا دھارا بدل دیا، ایک انسان کی حمیت اسلامی، ایک انسان کے احساس ذمہ داری نے تہہ بہ تہہ مشکلات کو کائی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا، تاریخ لمبی ہے، اور واقعۂ ارتداد اور اس کی تفصیلات تاریخ میں محفوظ ہیں، لیکن حقیقت میں جو فیصلہ کن بات تھی، وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی یہ بات تھی "یہ نہیں ہو سکتا میں زندہ ہوں اور دین پر حرف آئے" میں نے جو دین رسول اللہ سے پایا تھا، وہ دین بے کم وکاست سو فیصدی رہے گا، ایک نقطہ کو بھی میں اپنی جگہ سے مٹنے نہیں دوں گا، اور انھوں نے کر کے دکھادیا۔

حضرات! آپ علمائے کرام ہیں، آپ زعمائے قوم ہیں، آپ میں بڑے بڑے خطیب ومقرر ہیں، آپ انجمنوں کے بانی اور اس کے ستون ہیں، آپ کشمیر کا قلب ودماغ ہیں، آپ کا فیصلہ اصل میں فیصلہ کن ہوگا، پہلی بات یہ ہے کہ اس سر زمین کی اسلامیت باقی رہے، یہ آپ کے ذمہ واجب ہے، کل حشر کا میدان ہوگا، اور رسول اللہ ﷺ تشریف رکھتے ہوں گے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ عدالت کی کرسی پر ہوگا، اور رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ ہوگا، اور آپ کا گریبان یا دامن ہوگا، آپ سے سوال ہوگا کہ اللہ نے اس سر زمین کو دولت اسلام سے مشرف کیا، اولیاء کرام کو وہاں کے باشندوں کو پہونچایا، پھر ہم نے اسلام کے پودہ کو تن آور، بار آور، اور پر ثمر درخت بنایا، وہ درخت سیکڑوں برس تک سر سبز شاداب، اور پر ثمر سایہ دار رہا، ہزاروں

مسجدیں بنیں، سیکڑوں مدرسے اور خانقاہیں قائم ہوئیں، جلیل القدر علماء و محدثین وفقہاء پیدا ہوئے، لیکن تمہاری ذرا سی غفلت و سستی، یا اختلاف وانتشار، یا کوتاہ نظری و کم نگاہی سے اسلام کا یہ باغ خزاں کی نذر ہو گیا۔

میں اسپین گیا، وہاں سے دل پر یہ چوٹ لے کر آیا کہ خدا جانے وہ کیا غلطی تھی، جس کی وجہ سے وہ مردم خیز سرزمین، اولیاء وائمہ کا مرکز اسلام سے محروم ہو گیا، بقول اقبال آج اس کا حال یہ ہے ؎

آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ غلطی اور غلطی کی سزا میں تناسب ہونا ضروری نہیں ہے، بعض مرتبہ چھوٹی غلطی ہوتی ہے، لیکن سزا بہت بڑی ہوتی ہے، جس کے کچھ اور اسباب ہوتے ہیں، بعض مرتبہ ایک چھوٹے سے فیصلہ میں غلطی ہوئی اس کا نتیجہ صدیوں پر پھیلا ہوا ہے، دنیا کی بہت سی قوموں نے اور جماعتوں نے غلطی کی اور کسی خاص موقعہ پر کمزوری دکھائی، صدیوں تک اس کی سزا ملتی رہی، آپ اسپین میں اسلام کے زوال کی تاریخ اور اس کے اسباب کا سراغ لگائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عرب قبائل کی رقابت واختلاف یعنی ربیعہ و مضر، عدنانی اور قحطانی، حجازی اور یمنیوں کا اختلاف اس کا بڑا سبب تھا، جن لوگوں نے اسپین کے اسلام، اور مسلمانوں کے زوال کے اسباب کا تجزیہ کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ اس میں بڑا ہاتھ اس کا تھا کہ عدنانی اور حجازی چاہتے تھے کہ اقتدار ان کے ہاتھ میں ہو، اور قحطانی، یمنی چاہتے تھے کہ اقتدار ان کے ہاتھ میں ہو، انھوں نے کبھی تبلیغ واشاعت اسلام کی طرف توجہ نہیں کی، وہ جنوب کی طرف سمٹتے چلے گئے (جہاں سے مسلمان ملک مغرب اقصیٰ مراکش قریب تھا) شمال کی طرف بڑھنے کی انھوں نے کوشش نہیں

کی، انھوں نے تعمیرات میں اور تمدن میں اپنی صلاحیت اور ذہانت صرف کی، لیکن اسلام کے استحکام اور اسلام کو وہاں کی آبادی کے دلوں میں اتارنے کی کوشش نہیں کی، انھوں نے مدینۃ الزہراء آباد کیا، انھوں نے الحمراء کا قلعہ بنایا، انھوں نے مسجد قرطبہ تعمیر کی جو فن معماری (ARCITECTURE) کا دنیا میں منفرد نمونہ ہے، لیکن ان کو چاہئے تھا کہ اس کے بجائے وہ اپنی گرد و پیش کی آبادی کو اسلام سے مانوس کرتے، اسلام سے متعارف کراتے، بجائے پیچھے ہٹنے کے (یعنی جبل الطارق کی طرف آنے کے) ان کو آگے بڑھنا اور یورپ میں پیش قدمی کرنی چاہئے تھی، لیکن وہ تہذیب و تمدن کی ترقی، اور فنون لطیفہ کی سرپرستی اور تعمیرات میں لگ گئے، شعر و شاعری میں منہمک ہو گئے، کسی وقت غلطی بہت بڑے اور دور رس نتائج پیدا کرتی ہے، کبھی کسی قوم نے بہت بڑا ظلم کیا، اور ایک بیوہ کی آہ، ایک یتیم کی کراہ انقلاب سلطنت کا باعث بن گئی۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں کی اسلامیت ہر قیمت پر باقی رہے، یہ آپ کا فریضہ ہے، اور یہ آپ کے حق میں بھی بہتر ہے، عالم اسلام کے حق میں بھی بہتر ہے، ہندوستان کے حق میں بھی بہتر ہے، ہندوستان کے حالات کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ آپ اپنی خصوصیات اور اکثریت کے ساتھ باقی رہیں، ہندوستان میں جب ہی صحیح توازن قائم ہوگا، ملک اسی وقت عزت پائیگا، اس کو استحکام حاصل ہوگا، جب یہاں پر آپ اپنی خصوصیات، اپنے پیام، اپنی امن پسندی، انسان دوستی، تعمیری ذہنیت اور دماغی صلاحیتوں کے ساتھ باقی رہیں، جب کوئی مسئلہ سامنے آئے تو فیصلہ کن بات یہ ہونا چاہئے کہ اس کا اس خطہ کی اسلامیت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ یہی نہیں بلکہ یہاں کی اسلامی تہذیب و معاشرت اور یہاں کے اسلامی ادارے بھی باقی رہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم بات جو مجھے نظر آتی ہے وہ ہے، عقیدہ کی صحت، یعنی اللہ تبارک تعالیٰ کے ساتھ موحدانہ تعلق، اور اس کے سوا کسی کے سامنے سر نہ جھکانے کا عزم، اس میں اگر کمی ہوتی ہے، تو اللہ تعالیٰ کی نصرت مین کمی ہوتی ہے، اور قرآن مجید میں صاف صاف اشارے ہیں، کہ جس امت کی توحید میں فرق آیا، اس کی طاقت میں فرق آگیا، طاقت کا سب سے بڑا سر چشمہ اور منبع عقیدۂ توحید ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: سَنُلقِی فِی قلوبِ الذینَ کَفَرُوا الرُّعبَ بِمَا اَشرکُوا بِاللّٰہ مَالَم یُنزِلْ بِہٖ سُلطٰنًا وَمَا ھُمُ النَّارُ وَبِئسَ مَثوی الظّٰلِمین (آل عمران، ۱۵۱) اب ہم کافروں کے دلوں میں ہیبت ڈال دیں گے، اس لئے کہ انھون نے اللہ کا شریک ٹھہرایا، جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری، اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور ظالموں کا بہت برا ٹھکانا ہے۔

اور: إن الّذینَ اتّخَذُوا العِجْل سَینَالُھم غَضَبٌ مِن رَّبھم وَذِلّۃٌ فِی الحیٰوۃِ الدنیَا وَکذٰلِکَ نَجزِی المُفتَرِینَ (الاعراف. ۱۵۲) بیشک جنھوں نے بچھڑے کو معبود بنایا انھیں ان کے رب کی طرف سے غضب اور دنیا کی زندگی میں ذلت پہونچے گی اور ہم بہتان باندھنے والوں کو یہی سزا دیتے ہیں۔

شرک ضعف کا سبب ہے، ہمیشہ رہا ہے، اور ہمیشہ رہے گا "سُنۃ اللہِ فِی الّذِینَ خَلَوا مِنْ قَبلُ" اللہ تعالیٰ نے اشیاء میں خاصیتیں پیدا کی ہیں، زہر میں ایک خاصیت ہے، تریاق میں ایک خاصیت ہے، پانی میں ایک خاصیت ہے، آگ میں ایک خاصیت ہے، اسی طرح شرک میں کمزوری کی خاصیت ہے، اور توحید میں طاقت اور بے خوفی، اور بے رعبی کی خاصیت ہے، اس لئے سب سے بڑی ضرورت اس کی

ہے، کہ عقائد کی تصحیح ہو، خدا کے ساتھ ابراہیمی، محمدی قرآنی تعلیم کے مطابق توحید کا رشتہ استوار ہو، اس رشتہ کو پھر استحکام کی ضرورت ہے، اس لئے کہ شیطان ہمیشہ تاک میں رہتا ہے، اور وہ ہمیشہ چھاپا مارتا رہتا ہے، اور چور وہیں جاتا ہے، جہاں دولت ہوتی ہے، آپ کے پاس توحید کی، ایمان کی دولت ہے، اس لئے آپ کے لئے خطرہ ہے، ان کے لئے خطرہ میں نہیں بتاتا جن کے پاس سرے سے یہ نعمت نہیں، آپ کے پاس خدا کے فضل سے یہ نعمت ہے، آپ کو باہر سے ملی اندر سے ملی، وہ نعمت یہاں اب زمین کا جز بن گئی ہے، اس ملک کا حصہ بن گئی ہے، یہاں کی تاریخ کا حصہ بن گئی ہے، یہاں کی زندگی کا حصہ بن گئی ہے، لیکن اس سے مطمئن نہیں ہونا چاہئے۔

دوسری بات جس سے میں ڈرتا ہوں، وہ انتشار اور افتراق ہے، اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے خاصیت ضعف کی رکھی ہے: وَاَطِيعُوا اللهَ وَرَسُولَهُ وَلَاتَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُم وَاصْبِرُوا اِنَّ اللهَ مَعَ الصّٰبِرِين (الانفال ۔ ٤٦) اور اللہ اور اس کے رسول کا کہا مانو اور آپس میں نہ جھگڑو ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائیگی، اور صبر کرو، بیشک اللہ صبر والوں کے ساتھ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، دیکھو آپس میں لڑائی جھگڑا نہ کرو، منازعت و مخاصمت سے کام نہ لو، ورنہ کمزور پڑ جاؤ گے، تمہاری ہندھی ہوئی ہوا اکھڑ جائیگی، اداروں کی کثرت بے شک زندگی کی علامت ہے، اور بقدر ضرورت اس کو ہونا چاہئے، لیکن یہ کہ ہر محلّہ پر ایک ایک جھنڈا، ہر گھر پر ایک جھنڈا ہو، ہر جگہ ایک انجمن ہو، یہ صحیح نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ اکثر کمزوریوں میں، اور اکثر غلطیوں کی جڑ میں جو

بات ملتی ہے، وہ دنیا کی حد سے بڑھی ہوئی محبت، دولت کی حد سے بڑھی ہوئی محبت ہے میں کوئی حکم نہیں لگاتا، کوئی شہادت نہیں دیتا، لیکن یہ کہتا ہوں کہ دنیا کی محبت سے پیسے کی محبت بھی بہت بڑی کمزوری کا سبب ہے، جہاں سے بھی دولت آئے جس طرح سے بھی دولت ہاتھ لگے، جس طرح سے عزت واقتدار میسر ہو، جس طرح سے ترقی منصب اور عہدہ ملے، بہر حال وہ مطلوب ہے، اس کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہئے، اس سے مطلب نہیں کہ یہ اجتماعی مفاد کے خلاف ہے یا موافق، یہ بیماری کی ایک بڑی علامت ہے، اس سے بھی زیادہ ڈرنے کی ضرورت ہے۔

چوتھی چیز تمدن کی خرابیاں، اسراف، فضول خرچی اور روایات پرستی، اور اس میں غلو واسراف تکبر وتفاخر ہے، جس کو قرآن نے "**ترف**" اور "**بطر**" کے لفظ سے یاد فرمایا ہے: **وما ارسلنا فی قریة من نذیر الا قال مترفوها إنا بما ارسلتم به کٰفرون** (سبا. ۳٤) اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر وہاں کے خوشحال لوگوں نے کہا کہ جو چیز دے کر تم بھیجے گئے ہو ہم اس کے قائل نہیں۔ دوسری جگہ فرمایا کہ: **وکم اهلکنا من قریة بطرت معیشتها فتلك مسٰکنهم لم تسکن من بعد هم الا قلیلا وکنا نحن الوٰرثین** (القصص. ۵۸) اور ہم نے بہت سی بستیوں کو ہلاک کر ڈالا جو اپنی (فراخی) معیشت پر اترا رہی تھیں سو یہ ان کے مکانات ہیں جن کو ان کے بعد آباد ہونے کی بہت کم نوبت آئی، اور ان کے پیچھے ہمیں ان کے (شہر ودیار) کے مالک رہے۔

تمدن کی فضولیات کو کم کیجئے، یہ نہیں کہ جس طریقہ سے شادیوں میں ہوتا آیا ہے، جس طریقہ سے شاہانہ تجمل اور رئیسانہ دولت کا اظہار ہوتا آیا ہے،

ویسا ہی ہو، اب اس کا وقت نہیں، ذرا آنکھیں کھولئے، اور وقت کو پہچانئے، اور غریب طبقہ کا خیال کیجئے جن کو یہ وسائل حاصل نہیں۔

ایک چیز یہ ہے کہ کیرکٹر میں صلابت ہونی چاہئے، یہ نہیں کہ آدمی بالکل پارے کی طرح ہو جائے کہ اس کو کسی وقت قرار نہیں، کبھی ادھر کبھی ادھر، کسی چیز میں ثبات نہیں، یہ بھی قوموں کے لئے بڑی مہلک بیماری ہے، اپنی سیرت میں صلابت اور استقامت پیدا کیجئے۔ یہ بات میں عام طور پر ہندوستانی مسلمانوں سے کہتا ہوں، اور صرف اہل عجم سے نہیں، عربوں سے بھی کہتا ہوں، الحمد للہ میرے مضامین اس پر شاہد ہیں، جن تقریروں میں میں نے عربوں کو مخاطب کیا ہے، ان کا مجموعہ "**العرب والاسلام**" کے نام سے الگ چھپ گیا ہے، اس کو دیکھا جا سکتا ہے، یہ مشترک بیماریاں ہیں مشرق کی، ایشیا کی، اور ہم مسلمانوں کی خاص طور پر۔

تو ایک چیز تو یہ کہ عقائد کی تصحیح ہونی چاہئے، اور دوسرے یہ کہ افتراق وانتشار کو دور کرنا چاہئے، اتحاد ہونا چاہئے، اور تیسری بات یہ کہ حبِ دنیا، دولت کی محبت پر کچھ پابندی عائد کرنی چاہئے، حدیث شریف میں آتا ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ معجزہ ہے، ان معجزات میں سے جو حدیث کی شکل میں اور ارشادات نبویؐ کی شکل میں محفوظ ہیں "حب الدنیا رأس کل خطیئة" (دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے، ہر غلطی کی جڑ ہے،) آپ دیکھیں گے کہ فلاں افسوسناک واقعہ کیوں ہوا؟ اس نے کیوں بے وفائی کی؟ یہ اس سے کیوں ٹوٹا؟ وہ اس سے کیوں ملا؟ اس نے ملت فروشی کیوں کی؟ اس نے ملک فروشی کیوں کی؟ اس نے ضمیر فروشی کیوں کی؟ سب کی جڑ میں ملے گی، دنیا کی محبت اور کچھ نہیں۔

ایک اور کمزوری کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں، جو مسلمانوں کی عام کمزوری ہے، اور کسی کسی علاقہ میں (بعض خاص اسباب کی بناء پر) زیادہ پائی جاتی ہے، وہ ضرورت سے زائد "جذباتیت" ہے، یہ کمزوری جہاں اور جب، اجتماعی طور پر پائی جاتی ہے، اور جماعتی یا علاقائی مزاج بن جاتی ہے، بڑے خطرات اور نقصانات کا موجب ہوتی ہے، اور اس سے بعض غلط اندیش عناصر ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں، بعض نادان دوست بھی سخت نقصان پہونچادیتے ہیں، تاریخ میں بعض بڑے ملی حوادث ومصائب کا سبب یہی جذباتیت، اشتعال پذیری، اور سرعت انفعال تھی، کسی شاعر نے صحیح کہا ہے۔

چواز قومے یکے بے دانشی کرد
نہ کہ را عزتے ماند نہ مہ را

پھر اگر یہ "**بے دانشی**" ایک دو افراد کی طرف سے نہ ہو، بلکہ ایک بڑی جماعت یا عوام کی طرف سے ہو، تو وہ اور مہیب، رسواکن اور دور رس نتائج کا سبب بن جاتی ہے، اسی حقیقت کو مشہور حکیم شاعر متنبّی نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

وجرم جره سفهاء قوم
فحل بغير جارمه العقاب

(وہ غلطی جس کا ارتکاب کسی قوم کے خفیف العقل لوگوں نے کیا، اس کے نتیجہ میں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گئے، اور ناکردہ گناہ لوگوں کو بھی اس کی سزا بھگتنی پڑی)

جن قوموں یا جماعتوں نے دنیا میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، یا تاریخ میں سلطنتوں اور تہذیبوں کی بانی قرار پائی ہیں، یا انھوں نے دین حق کا دنیا میں جھنڈا بلند کیا ہے، وہ طبعی طور پر حلیم وبردبار، متحمل وعالی ظرف، اور اسی کے ساتھ بہادر وغیور واقع ہوئی تھیں، اور صدر اول کے مسلمان تو اس کا بہترین نمونہ ہیں، میں نے ایک مرتبہ ایک مجلس میں کہا کہ "میں ابھی اس شہر میں داخل ہو رہا تھا، تو میں نے دیکھا کہ میری کار کے سامنے ایک ٹینکر چل رہا ہے، اس کے پیچھے کی جانب جلی حروف سے لکھا ہوا ہے (HIGHLY IMPLAMEABLE) (جلد اور بہت زیادہ آگ پکڑ لینے والی چیز) میں نے کہا یہ پٹرول کی تعریف ہو سکتی ہے، بارود کی تعریف ہو سکتی ہے، کسی آتش گیر مادہ کی تعریف ہو سکتی ہے، مسلمان کی تعریف تو نہیں ہو سکتی کہ ذرا سی بات پر بھڑک اٹھیں، اور عواقب ونتائج سے بے پروا ہو کر جو چاہیں کر گزریں عمل ورد عمل میں کوئی تناسب نہ ہو، رائی کا پربت بنادیں، اور دوست دشمن خطاوار وغیر خطاوار، کمزور وطاقتور، بچوں بوڑھوں کسی کی تمیز نہ ہو، یہ جذباتیت اور سریع الانفعالی ایک خطرناک بیماری ہے، جس کے علاج کی فوری ضرورت ہے، اور ہمارے قائدین، داعیان دین، اور تعلیم وتربیت واصلاح وتبلیغ کا کام کرنے والوں کو اس کی طرف فوراً توجہ کرنا چاہئے۔

حضرات! میں خوش ہوں کہ میرے قیام کشمیر اور میری حقیر تقریروں کا خاتمہ ایک ایسی جگہ اور ایک ایسے مرکز سے ہو رہا ہے، جہاں نصرت اسلام کے لئے ایک منظم، مخلصانہ وانشمندانہ کوشش شروع ہوئی، خاص طور سے خدا کے ایک مخلص بندہ مولانا رسول شاہ صاحب نے نصرۃ الاسلام کی بنیاد ڈالی، اللہ تعالیٰ نے اس درخت کو قبول فرمایا، بارآور کیا، اور سایہ دار بنایا: كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ

وفرعُها فِي السَّماء تُؤتِيُ اُكلُها كُلَّ حِينٍ باذنِ رَبهَا (ابراهيم. ۲۵.۳٤) گویا وہ ایک پاک درخت ہے، جس کی جڑ مضبوط (زمین کو پکڑے ہوئے ہے) اور شاخیں آسمان میں ہیں اپنے پرور دگار کے حکم سے ہمیشہ پھل لاتا (اور میوے دیتا) ہے۔

اس درخت نے پہلے بھی پھل دیا، اور اب بھی پھل دے رہا ہے، اور اگر خدا کو منظور ہے تو اللہ سے امید ہے کہ آئندہ بھی یہ پھل دیتا رہے گا، اس کو مضبوط کیجئے۔

ان الفاظ کے ساتھ میں اپنی گذارش ختم کرتا ہوں، امید کرتا ہوں کہ میری یہ باتیں آپ کے دل ودماغ میں ضرور محفوظ رہیں گی، اور ان لوگوں کے ذہن میں ضرور رہیں گی، جو اس سلسلہ میں کچھ کر سکتے ہیں، وہ کمزوری کے اسباب کو رفع کر کے نصرت الٰہی کو کھینچنے اور بلانے والے اسباب اور شرائط کو پورا کرنے، اور ان اسباب کو مہیا کرنے کی کوشش کریں، تاکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی مدد ہو :إن يَنصُرُكُمُ اللّٰهُ فَلَاغَالِبَ لَكُم وَإن يَخذُلكُم فَمَنُ ذَالَّذِيُ يَنصُركُم مِن بَعدِهِ و عَلَى اللّٰه فَليَتوَكل المُؤمنُونَ (آل عمران. ۱٦۰) اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا، اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے تو پھر کون ہے کہ تمہاری مدد کرے اور مومنوں کو چاہئے کہ خدا ہی پر بھروسہ رکھیں۔

ان الفاظ کے ساتھ میں آپ کے اس اعزاز کا، اور مولانا محمد فاروق صاحب کا خاص طور پر، ان کے رفقائے کار اور حاضرین کا عام طور پر دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتا ہوں، اور آپ بھی دعا کریں کہ میری اس حاضری کا کوئی لفظ قبول ہو جائے، خدا کے یہاں کوئی قدم قبول ہو جائے، میرے

یہاں جو ساتھ آٹھ دن گذرے ہیں، ان کی حرکات وسکنات سے اور ان کے اوقات میں سے کوئی چیز اللہ کے یہاں قبول ہو جائے، اور میرا یہاں آنا کسی درجہ میں بھی مفید ہو، اور میں اپنی اس حاضری پر خدا کے یہاں شرمندہ نہ ہوں کہ میں کس مقصد کے لئے گیا تھا، اور کیا کر کے آیا۔

واخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين.







علمائے دین کا منصب

استقامت اور حقیقت پسندی کا جامع

یہ تقریر مجلس علمی (حیدرآباد) کی اس نشست میں کی گئی جو ۱۴/ اکتوبر ۱۹۸۲ء کو جمیل الدین صاحب ایڈوکیٹ کے دولت خانہ پر شب میں ہوئی، اور جس میں بڑی تعداد میں حیدرآباد کے علمائے کرام، فضلائے مدارس اور دینی اداروں اور تنظیموں کے سربراہ تشریف رکھتے تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علمائے دین کا منصب

استقامت اور حقیقت پسندی کا جامع

یٰا اَیھَا الَّذِیْنَ اٰمنُوا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَاءَ بِالقِسْطِ(المائدہ.۸)اے ایمان والو! کھڑے ہو جایا کرو، اللہ کے واسطے گواہی دینے کو انصاف کی۔

حضرات! علمائے کرام کی اس موقر مجلس میں کچھ عرض کرنا بڑی ذمہ داری کی بات ہے، پرانا حکیمانہ مقولہ ہے: ''**لِکل مقامٍ مقال**''میں کوشش کروں گا کہ اس اہم اور باوقار مجلس اور موقعہ و محل کے مطابق اپنے معروضات وخیالات پیش کروں۔

لوگوں نے چھوٹے چھوٹے واقعات، اور روز مرہ کے مشاہدات سے بڑے بڑے نتائج نکالے ہیں، اس میں شیخ سعدیؒ خاص طور پر بڑے ممتاز ہیں، اسی طریقہ سے مولانا رومؒ مثالوں کے بادشاہ ہیں، دونوں روز مرہ کے واقعات سے بڑی حکیمانہ باتیں اور بڑے عمیق نتائج نکالتے ہیں، میں اپنا بھی اسی قسم کا ایک تاثر اور عبرت کا سبق پیش کرتا ہوں، آپ کو معلوم ہے کہ میں ایک طویل سفر کر کے آرہا

ہوں، دہلی سے چلا اور حیدرآباد پہونچا، خدا جانے گاڑی نے کیا کیا رخ بدلے، کن کن علاقوں سے گذری، لیکن قبلہ نما نے ہمیشہ صحیح قبلہ بتایا، اس نے نہ گاڑی کے پھرنے کی پراوہ کی، نہ سمت کے تبدیل ہونے کی، مجھے بڑا رشک آیا کہ ایک ادنیٰ سی جماداتی چیز، جو انسان کی صنعت ہے، وہ اتنی امین، ایسی ثابت قدم، ایسی خوددار، اور ایسی پابند اصول ہے، کہ اس نے نہ یہ دیکھا کہ گاڑی کس طرح رخ بدل رہی ہے، نہ یہ کہ انسان (جو اشرف المخلوقات ہے) برابر اپنا رخ بدلتا رہا ہے، ہر جگہ اس نے صحیح طور پر قبلہ بتایا، اور ہم نے اس پر اعتماد کیا اور نماز پڑھی، اس سے مجھے غیرت بھی آئی، اور عبرت بھی ہوئی کہ قبلہ نما تو کسی کی پروانہ کرے، اور ہمیشہ سمت قبلہ بتائے، اس نے اپنا مقصد وجود تبدیل نہیں کیا، اور نہ اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں فرق آنے دیا، اس سے مجھے خیال ہوا کہ علمائے دین کو حقیقت میں "قبلہ نما" ہونا چاہئے، ان کے اندر قبلہ نما کی سی استقامت ہونی چاہئے، کسی طرف کی ہوا چلے اور کہنے والے کتنا ہی کہیں کہ ؎

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

اور سمجھانے والے کتنا ہی سمجھائیں ؎

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بہ ساز

لیکن ان کا عقیدہ اقبالؔ کی (جو خود اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ اور مفکر و فلسفی اور پھر شاعر تھے) اس تعلیم پر ہو ؎

حدیث کم نظراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

بلکہ وہ یہاں تک کہتے ہیں ؎

گفند جہانِ ما آیا ہمی سازد

گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ بر ہم زن

حضرات !علماء کی شان یہی ہونی چاہئے، امت مسلمہ امتوں میں ،اور جماعت علماء حاملین علم میں الگ شان رکھتے ہیں، امت مسلمہ کو ایک قبلہ دیا گیا ہے ،وہ جہاں کہیں ہو اسی قبلہ کی طرف اپنا رخ کرے، جس امت کو ایک معین قبلہ دیا گیا ہے ،اس کو یہ اشارہ دیا گیا ہے کہ تمہارے دلوں کا قبلہ، تمہارا قبلۂ حاجات، تمہاری فکر اور سعی وجہد کا محور ایک ہی ہونا چاہئے، نمازوں میں خانۂ کعبہ ،اور اعمال ومساعی ومقاصد میں اللہ تعالیٰ کی (جو معبود ومقصود حقیقی ہے) رضا،آپ حضرات خدا کے فضل سے نہ صرف اہل علم ہیں ،بلکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے دینی قیادت کا مقام عطا فرمایا ہے، خاص طور سے یہ موقر مجلس علمی جہاں اس وقت ہم جمع ہیں، میں اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر دو اہم حقیقتوں کے بارے مین اجمالی طور پر کچھ عرض کروں گا۔

ایک تو عقائد اور حدود شرعیہ کا مسئلہ ہے، اس میں جماعت علماء کو بالکل قطب نما کی طرح ہونا چاہئے، کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی اس کو سامنے رکھے گا تو وہ اس کی رعایت نہیں کریگا، وہ صحیح سمت بتائے گا، جہاں تک عقائد اور حدود شرعیہ کا تعلق ہے، دین میں کسی قسم کی رعایت کی گنجائش نہیں، حکمت اور چیز ہے، مداہنت اور چیز، حکمت اور مداہنت میں بڑا فرق ہے، ہاں آدمی سچی اور صاف بات حکمت کے ساتھ کہہ سکتا ہے، اس کا اسلوب حکیمانہ ہو "اُدعُ اِلیٰ سبیلِ ربكَ بالحِکمةِ وَالموعِظةِ الحَسَنةِ" لیکن مداہنت نہ ہو، قرآن شریف میں آتا ہے :"ودوالوتدھن فیدھنون" اللہ کے رسول کو صاف حکم ہے "فاصدع بماتؤمرواعرض عن المشرکین "یہ "اعرض عن المشرکین "کا تکملہ،

"صدع بالامر" کا محل متعین کر دیتا ہے جہاں پر توحید اور شرک کی سرحدیں آتی ہوں، وہاں "فاصدع بماتؤمر" پر عمل کا حکم ہے نرمی اور وسعت کسی اور چیز میں ہو تو ہو، لیکن توحید وسنت کے بارے میں، منصوصات شرعیہ، اور قطعیات دینیہ کے بارے میں "فاصدع بماتؤمر" کا حکم ہے، اگر "فاصدع بماتؤمر" مطلق آتا تو اس میں کچھ گنجائش تھی، لیکن "واعرض عن المشرکین" نے بالکل تفسیر کر دی کہ اس کا موقعہ و محل کیا ہے، علمائے حقانی کا فرض ہے کہ توحید کے بارے میں بالکل بے لوچ اور صاف بات کہیں، لیکن حکمت کے ساتھ کہیں، بقول غالب ایسا نہ ہو۔

کہتے ہیں وہ بھلے کی ولیکن بری طرح

بھلی بات بھلے طریقہ پر کہی جائے، کوئی فتنہ شروع ہو تو علماء شروع میں اچھی سے اچھی، نرم سے نرم زبان استعمال کریں، تدریج وحکمت سے کام لیں، لیکن اس طرح کہ تاویل اور غلط فہمی کی گنجائش نہ ہو، اسی طرز عمل کا نتیجہ ہے کہ آج تک یہ دین قائم ہے، اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہے، جس کو ہلاکت کا شوق ہے، وہ شوق سے ہلاکت میں پڑے، لیکن وہ شریعت، اور شریعت کے حاملین کو الزام نہیں دے سکتا، تاریخ کا اگر عمیق ووسیع نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس امت کی تاریخ میں ایک سال بھی ایسا نہیں گذرا کہ یہ امت عمومی طور پر کسی ضلالت کا شکار ہوگئی ہو، مقامی طور پر تو ضلالتیں رہی ہیں، لیکن پوری امت مسلمہ کسی سازش، کسی عالمگیر ضلالت میں گرفتار نہیں ہوئی، اور خود حدیث میں آیا ہے "لا تجتمع امتی علی ضلالۃ" اس کے برعکس یہودیت بالکل شروع میں تحریف کا شکار ہوگئی، اور عیسائیت بالکل عہد طفلی اور آغاز کار میں ایک بالکل نئی پٹری پر پڑ گئی،

جس پر وہ صدیوں سے چلتی چلی آرہی ہے ،اسی لئے قرآن مجید نصاریٰ کو "**ضالین**" کے لفظ سے یاد کرتا ہے ، کہ وہ جیسے ہی چلے دوسرے راستہ پر پڑ گئے ،لیکن الحمد للہ اسلام اس سے بالکل محفوظ ہے ،اس وقت تک توحید وشرک کا فرق ، سنت وبدعت کا فرق ، اسلام اور جاہلیت کا فرق ، غیر مسلمین کی معاشرت وتمدن اور اسلامی معاشرت وتمدن کا فرق بالکل واضح ہے ، کوئی ملک کسی وجہ سے کسی خاص زمانہ میں کسی خارجی یا داخلی سبب کی بناء پر کسی سازش کا شکار ہو جائے ،یا کسی فتنہ میں مبتلا ہو جائے یہ الگ بات ہے ، علمائے حق اس صورت حال سے بھی نبرد آزما اور اس کے مقابلہ میں صف آرا رہتے ہیں ، اور اصلاح حال کی کوشش جاری رہتی ہے

پوری امت مسلمہ کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے "یٰاَیُّھاالذینَ اٰمنُوا کُونُوا قوّٰمینَ لِلّٰہِ شُھَدَاء بِالقِسطِ" (یعنی تم اللہ کے لئے حق کے علم بردار بن جاؤ) ہماری زبان اور محاورہ میں "**خدائی فوجدار**" ایک طنز کا لفظ ہے کہ آپ خدائی فوجدار ہیں ؟ لیکن "**قوامین للہ**" کا مفہوم تقریبا "**خدائی فوجدار**" ہی کا ہے ، مبالغہ کے اس صیغہ (قوامین) سے خدائی فوجدار ہی کی شان ظاہر ہوتی ہے ، اگر قائمین للہ ہوتا تو شاید یہ بات نہ پیدا ہوتی ، کوئی پوچھے نہ پوچھے ، کوئی بلائے نہ بلائے ، کوئی کہے نہ کہے ، آپ اپنا فرض ادا کر رہے ہیں ، آپ ہر جگہ پہونچ رہے ہیں ، اس آیت میں خطاب اگرچہ پوری امت کو ہے ، لیکن علماء کی اس بارے میں امتیازی شان ہونی چاہئے ، ان کو "شھداء بالقسط" حق وصداقت کا گواہ وعلم بردار ہونا چاہئے ، اگر امتِ مسلمہ کا فرض اقوام عالم کا احتساب ہے ، تو علمائے اسلام کا فرض مسلم معاشرہ کا احتساب کرتے رہنا ، کہ کہاں سے یہ معاشرہ صراط مستقیم سے ہٹ رہا ہے ، کہاں سے اس نے خط مستقیم کو چھوڑا ہے ، اس بارے میں

ان کا کام بالکل بیرومیٹر کا سا ہے، وہ ہر جگہ، ہر موسم میں ہوا کا دباؤ بتاتا ہے، وہ صحیح شہادت ادا کرتا ہے۔

حضرات! اسی طرح علماء کا دوسرا فرض یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو زندگی کے حقائق، ملک کے حالات، ماحول کے تغیرات اور تقاضوں سے باخبر اور روشناس رکھیں، ان کی کوشش رہنی چاہئے کہ مسلم معاشرہ کا رابطہ زندگی اور ماحول سے کٹنے نہ پائے، اس لئے کہ اگر دین اور مسلمانوں کا رابطہ زندگی سے کٹ گیا، اور وہ خیالی دنیا میں زندگی گذارنے لگے تو پھر دین کی آواز بے اثر ہوگی، اور وہ دعوت واصلاح کا فرض انجام نہیں دے سکیں گے، اور اتنا ہی نہیں ہوگا، بلکہ اس دین کے حاملین کو اس ملک میں رہنا مشکل ہو جائے گا تاریخ ہمیں بتاتی ہے، کہ جہاں علماء نے سب کچھ کیا، لیکن زندگی کے حقائق سے امت کو روشناس نہیں کیا، اس ماحول میں اپنے فرائض کے انجام دینے کی انھوں نے تلقین نہیں کی، ایک اچھا شہری، ایک مفید عنصر بننے، اور اس ملک کی قیادت حاصل کرنے کی اہلیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، وہاں اس ملک نے ان کو اس طرح اگل دیا جیسے لقمہ اگلا جاتا ہے، اور ان کو اگل کر کے باہر پھینک دیا، اس لئے کہ انھوں نے اپنی جگہ نہیں بنائی تھی، آج ہندوستان کے مسلمان ایک دانش مندانہ، اور حقیقت پسندانہ دینی قیادت کے محتاج ہیں، آپ اگر مسلمانوں کو سو فیصدی تہجد گزار بنادیں، سب کو متقی و پرہیزگار بنادیں، لیکن ان کا ماحول سے کوئی تعلق نہ ہو، وہ یہ نہ جانتے ہوں کہ ملک کدھر جارہا ہے، ملک ڈوب رہا ہے، ملک میں بداخلاقی، طوفان اور وبا کی طرح پھیل رہی ہے، ملک میں مسلمانوں سے نفرت پیدا ہو رہی ہے، تو تاریخ کی شہادت ہے کہ پھر تہجد تو تہجد پانچ وقتوں کی نمازوں کا پڑھنا بھی مشکل ہو جائے گا، اگر آپ نے دین داروں کے لئے اس ماحول

میں جگہ نہیں بنائی، اور ان کو ملک کا بے لوث مخلص اور شائستہ شہری ثابت نہیں کیا، جو ملک کو بے راہ روی سے بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے، اور ایک بلند کردار پیش کرتا ہے، تو آپ یاد رکھئے کہ عبادات و نوافل اور دین کی علامتیں اور شعائر تو الگ رہے، وہ وقت بھی آسکتا ہے کہ مسجدوں کا باقی رہنا بھی مشکل ہو جائے، اگر آپ نے مسلمانوں کو اجنبی بنا کر اور ماحول سے کاٹ کر رکھا، زندگی کے حقائق سے ان کی آنکھیں بند رہیں، اور ملک میں ہونے والے انقلابات، نئے بننے والے قوانین، عوام کے دل و دماغ پر حکومت کرنے والے رجحانات سے وہ بے خبر رہے تو پھر قیادت تو الگ رہی (جو خیر امت کا فرض منصبی ہے) اپنے وجود کی حفاظت بھی مشکل ہو جائے گی، فاتح مصر، صحابیؓ رسولؐ حضرت عمرو بن العاصؓ نے جس وقت مصر فتح کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی بصیرت پر ضرور منکشف کیا ہوگا کہ انشاء اللہ مصر سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں برس تک اسلام کا حلقہ بگوش رہے گا، مرکز اسلام سرزمین مقدس حجاز اس کے بالکل قریب ہے، رومی شہنشاہی وہاں سے بے دخل ہو چکی، قبطی مسیحی سلطنت دم توڑ چکی، لیکن انھوں نے عربوں اور مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا، "انتم فی رباط دائم" یاد رکھو! تم ہمیشہ محاذ جنگ پر ہو، تم ہمیشہ سرحد پر پہرا دے رہے ہو، آنکھ جھپکی اور مارے گئے، ناکے پر کھڑے رہنے والے کو ہر وقت چوکنا اور بیدار رہنا چاہئے، اس کے لئے نہ غفلت کی گنجائش ہے، نہ تغافل کی، نہ جہل کی، نہ تجاہل عارفانہ کی۔

حضرات! جس ملک میں اس وقت ہم زندگی گذار رہے ہیں، اس ملک کے حالات تیزی سے بدل رہے ہیں، یہ ملک گرد و پیش کے ممالک اور دنیا کی بڑی طاقتوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، اس ملک میں بہت سے فلسفے، بہت سی سلبی

طاقتیں، بہت سی تخریبی تحریکیں، کام کر رہی ہیں، اور بہت سرگرم اور فعال ہیں نظام تعلیم برابر بدلتا رہتا ہے، اور کبھی شدت سے عقائد و حقائقِ دینی پر اثر انداز ہوتا ہے، جبری تعلیم نے اور قومی زبان نے بھی نئے نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں، اس حالت میں ہم کو حالات کا برابر جائزہ لیتے رہنا چاہئے، اور اپنے تحفظ کا سامان کرتے رہنا چاہئے۔

اسی کے ساتھ مسلمانوں کو بتانا چاہئے کہ دیکھو اس ملک کو تباہی سے بچانا تمہاری ذمہ داری ہے، تم باایمان، بااصول، اور باکردار بن کر یہاں رہو، اگر تم یہاں پر حضرت یوسفؑ کا نمونہ پیش کرو گے، تو پھر وہ وقت آئے گا کہ اہم سے اہم، نازک سے نازک تر، اور دشوار سے دشوار تر ذمہ داری تمہارے سپرد کی جا سکے گی، حضرت یوسفؑ نے جن کو اللہ تعالیٰ نے حفیظ و علیم کی صفت عطا فرمائی تھی، دیکھا کہ اس ملک میں اس وقت تک دین کی اشاعت نہ ہو سکے گی، اور دین کے لئے مقام پیدا کیا نہ جا سکے گا، جب تک وہ وہاں اپنی اہلیت، اپنی خیر خواہی، انسان دوستی اور عدل کا ثبوت نہ دے دیں گے، اور اللہ کے بندوں کو اپنا گرویدہ نہ بنالیں گے، اس وقت تک اس ملک میں خدائے واحد کا نام لینا بھی مشکل ہوگا، ہم ہندوستانی مسلمانوں کو بھی یہ ثابت کرنا چاہئے کہ ہمارے بغیر یہ ملک چل نہیں سکتا، ہم نہ رہے تو یہ ملک تباہ ہو جائیگا۔

یاد رکھئے! اگر ہم ملک کے حالات سے اپنے کو کاٹ لیں گے، اور جو گرم و سرد ہوائیں چل رہی ہیں ان سے بے خبر ہو جائیں گے، اور ہم کسی مکیف (AIR-CONDITIONED) مکان میں رہنا شروع کر دیں گے، جہاں نہ گرم جھونکا پہونچ سکے نہ سرد، تو ہم اپنے ساتھ بھی بد خواہی کریں گے، اپنے دین کے ساتھ

بھی، کوئی فرقہ، ملک کی آبادی کا کوئی عنصر باقی عناصر سے کٹ کر نہیں رہ سکتا، ہاں اس کے شرائط اور حدود ہیں، آپ ہرگز تحلیل نہ ہوں، آپ اپنے پیغام اور دعوت کے ساتھ رہیں، آپ اپنی تہذیبی و معاشرتی خصوصیات کے ساتھ رہیں، آپ اپنے ملی تشخص کو پورے طور پر برقرار رکھیں، اور اس کے کسی حصہ سے بھی آپ دست بردار ہونے کے لئے تیار نہ ہوں، لیکن زندگی کے دھارے سے الگ نہ ہوں، میں قومی دھارے کو نہیں کہتا (خدا نہ کرے کہ اس زندگی میں کبھی میری زبان سے یہ لفظ نکلے کہ قومی دھارے میں جذب ہو جایئے) نہیں، زندگی کے دھارے سے آپ الگ نہ ہوں، اس لئے کہ زندگی کے دھارے سے جو الگ ہوا وہ الگ ہی ہو گیا، اس کی جگہ زندہ انسانوں میں نہیں رہتی، میں اسلام کو ایسا محدود اور ناقص نہیں سمجھتا کہ اگر حالات اور زندگی کے مسائل کی طرف توجہ کی جائے تو فرائض چھوٹ جائیں گے، عقائد میں خلل آجائے گا، ہمارے اسلاف نے شہنشاہی کی اور امپائر بنائے ہیں، لیکن ان کی تہجد بھی نہیں چھوٹی، معمولی سنت بھی ترک نہیں ہوئی، حضرت سلمان فارسی کا واقعہ ہے کہ عراق کے گورنر تھے، اور مدائن کے دارالحکومت میں رہتے تھے، ایک مرتبہ کھانے کی کوئی چیز زمین پر گر گئی تو اٹھا کر صاف کر کے کھانے لگے، کسی نے کہا کہ ارے آپ والی ہو کر ایسا کام کرتے ہیں، انھوں نے جواب دیا کہ کیا میں اپنے حبیبؐ کی سنت تم جیسے بیوقوف کی خاطر چھوڑ دوں گا؟ یہ نہیں کہ آگ آئے تو پانی نہیں رہے گا، اور پانی آئے تو آگ بجھ جائیگی، یہ غلط تخیل ہے، آپ پوری عزیمت، شان تقویٰ، اور کثرت عبادت کے ساتھ اچھے اور کامیاب شہری بن سکتے ہیں، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ وہی اچھا شہری بن سکتا ہے، جو خدا کا صحیح پرستار اور اپنے اصولوں کا پابند ہو، آج ہندوستان ہی نہیں تقریباً تمام خالص مسلم ممالک اور عرب

ممالک کی بھی حالت یہ ہے کہ وہاں بھی یورپ، امریکہ کے گرم جھونکے آرہے ہیں، نئے نئے فتنے پیدا ہورہے ہیں، اسلام اور جاہلیت کی کشمکش برپا ہے، وقت کے نئے نئے تقاضے، اور زندگی کے نئے نئے مسائل درپیش ہیں، ان سے آنکھیں بند کرلینا، اور یہ کہنا کہ نہیں کچھ نہیں ہورہا ہے غلط ہے، اس حقیقت پسندی، وسیع النظری اور جامعیت کا ثبوت دینے کا حیدرآباد میں اور بھی اچھا موقعہ ہے، یہاں تعلیم بھی ہے، اور قوت عمل بھی، یہاں نئے نئے ادارے، نئی نئی تنظیمیں اور تحریکیں پیدا ہورہی ہیں، لیکن مسلمانوں کو ایک اجتماعی قیادت، اور صحیح مشورے کی ضرورت ہے، ایک طرف تو عقائد کے بارے میں، اصول کے بارے میں، شریعت کے منصوصات کے بارے میں پہاڑ کی سی استقامت اور فولاد کی سی صلابت ہو، دوسری طرف زندگی کے مسائل میں، پورا فہم، پوری دانش مندی، پوری باخبری، اور پوری ہمدردی، یہ دونوں چیزیں ہوں گی تو انشاء اللہ ہم موجودہ حالات سے نہ صرف یہ کہ عہدہ برآ جائیں گے، بلکہ مجھے پوری امید ہے، کہ قیادت آپ کے پاس خود آئیگی، مسلمانوں میں سیاسی شعور الوعی السیاسی (شہری شعور)الوعی المدنی (CIVIL SENCE) پیدا کرنا ضروری ہے، وہ جس محلّہ میں رہیں، ممتاز نظر آئیں، اور معلوم ہو کہ یہ مسلمانوں کا محلّہ ہے، مسلمانوں کے گھر ہیں، دین کو اس کی حقیقی روح اور مظاہر کے ساتھ ایک خوش اسلوب شہری زندگی، انسانیت دوستی، حقیقت پسندی، ہوش مندی، ملک کے لئے فکر مندی، اس کو بچانے کے لئے خطر پسندی اور مہم جوئی کی ضرورت ہے، اس کے لئے آپ خود نمونہ بنیں، اور ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ نمونہ پیش کریں۔

وصلّی اللہ تبارك وتعالیٰ علی سیدنا ومولانا محمد وآله وصحبه وسلم

غیر اسلامی شعائر ورسوم کی نقل و تقلید سے احتراز کی ضرورت

درج ذیل تقریر ۱۴ر اکتوبر ۱۹۸۲ء کو وقت دس بجے دن جامعہ عربیہ دارالعلوم، میر عالم تالاب حیدرآباد میں علماء، اساتذۂ مدارس، طلبائے عربی اور شہر کے معززین کے ایک جلسہ میں کی گئی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غیر اسلامی شعائر ورسوم کی نقل و تقلید سے احتراز کی ضرورت

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا لَاتَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوا وَلِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ...

حضرات! ابھی آپ کے سامنے قاری صاحب نے یہ آیت پڑھی ہے، جس کی ابھی میں نے تلاوت کی، جس کا سیدھا ترجمہ یہ ہے کہ "اے ایمان والو "راعِنَا" نہ کہو "اُنْظُرْنَا" کہو اور (دھیان کے ساتھ) سنو، اور کافروں کے لئے دکھ دینے والا عذاب ہے" ہمیں معلوم ہونا چاہئے، اور جس کو معلوم ہو اس کو حافظہ میں تازہ کر لینا چاہئے کہ یہ آیت کس موقعہ پر نازل ہوئی اور ہم سے کیا مطالبہ کرتی ہے، اس میں ہمارے لئے کیا پیغام ہے؟

"راعِنَا" عربی کا صحیح اور فصیح لفظ ہے، جس کے معنی ہیں، "ذرا ہمارا خیال کیجئے" "ذرا سی (سننے والوں کی) رعایت کیجئے، اور "انظرنا" بھی عربی کا صحیح اور فصیح لفظ ہے، جس کا مفہوم ہے کہ ذرا سا ہمارا انتظار کیجئے، ذرا دیکھ لیجئے کہ ہم نے سنا یا نہیں، دونوں عربی کے لفظ ہیں، دونوں فصیح ہیں، لیکن قصہ کیا ہے کہ ایک سے اللہ تعالیٰ منع فرماتا ہے، اور اس کتاب میں جو قیامت تک پڑھی جانے والی ہے، اس ممانعت کو جگہ دی جاتی ہے، وہ دور بھی ختم ہوا، قرآن شریف بہت سے ایسے ملکوں

میں پڑھا پڑھایا جاتا ہے، جہاں عربی زبان نہ بولی جاتی نہ سمجھی جاتی ہے، پھر اس کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی، اور اس کو قیامت تک اور ہر ملک میں پڑھی جانے والی، اور ہر زبان میں ترجمہ کی جانے والی کتاب میں کیوں شامل کیا گیا؟ یہ سوچنے کی بات ہے، اس لفظ کا قصور کیا ہے کہ اس سے منع کیا جاتا ہے، اور اسی کے ہم معنی لفظ کی تعلیم دی جاتی ہے کہ بجائے اس لفظ کے یہ لفظ کہو۔

قصہ یہ ہے کہ جن جماعتوں کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ ہمارے ساتھ ظلم اور ناانصافی کی جاتی رہی ہے، اور وہ احساس کمتری مین مبتلا ہوتی ہیں، وہ اپنے دل کا غبار باتوں باتوں میں چٹکی لینے میں، طنز یہ اور ذو معنی الفاظ بولنے میں نکال لیتی اور اپنا دل خوش کر لیتی ہیں، (ہماری اردو میں بھی ایسے الفاظ ہیں جو معصوم اور دیکھنے میں باوقار ہیں، مگر مذموم معنی میں استعمال ہوتے ہیں، مثلاً آپ بڑے استاد ہیں"" فلاں ذات شریف ہیں") میں چونکہ لکھنؤ میں رہتا ہوں، وہاں اس سے سابقہ پڑتا رہتا ہے، یہودیوں کا طریقہ تھا کہ جب دربار نبویؐ میں آتے تھے، اور گفتگو کا سلسلہ جاری ہوتا، تو کہتے تھے، "**راعنا**" (ذرا ہماری رعایت کیجئے) وہ اس لفظ کو ذرا دبا کر کہتے تو "**راعینا**" بن جاتا جس کے معنی ہوتے ہیں، ہمارا چرواہا، جو صاف ذہن و دل کے لوگ ہیں، ان کا ذہن بھی ادھر منتقل نہیں ہوتا کہ اس میں چٹکی لی گئی، یہودیوں کی نظر میں اسرائیل (حضرت یعقوبؑ) کی اولاد کے علاوہ سب دوسرے درجہ کے انسان اور جمادات و حیوانات کی سطح کے لوگ ہیں، غیر یہودی کے لئے ان کے یہاں (GENTILE) کا لفظ ابھی تک موجود ہے، جس کے معنی ہیں "**غیر یہود یا صابی**" وہ سمجھتے تھے کہ امین کے ساتھ جس طرح کا معاملہ کیا جائے جائز ہے، جھوٹ بولا جائے تو جھوٹ نہیں، ان کی کوئی چیز دبالی جائے تو

چوری نہیں، ان کو دکھ دیا جائے تو گناہ نہیں "لیس علینا فی الامین سبیل "(ہم سے امیین کے بارے میں کوئی مواخذہ نہیں ہوگا) صحابہ کرامؓ کا ذہن تو اس طرف نہیں گیا، مگر اللہ تبارک وتعالیٰ علیم وخبیر ہے، وہ **لحن القول** کو بھی سمجھتا ہے، یعنی جو باتیں چبا کر اور ذرا اخفاء واشباع کے ساتھ کہی جاتی ہیں، ان کو بھی جانتا ہے، اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کو ہدایت کی کہ عربی زبان بہت وسیع ہے، بجائے **راعنا** کے **انظرنا** کہا کرو، کہ اس میں کوئی اشتباہ نہیں۔

خیال فرمائیے کہ جب ایک لفظ کے بارے میں اللہ تعالیٰ احتیاط کی تعلیم دیتا ہے، تاکہ یہودیوں سے مشابہت نہ ہو، اور ایسا لفظ نہ نکلے جو مقام نبوت کے شایان شان نہیں، تو غیر مسلموں کے رسوم وشعائر اختیار کرنے کا (جن میں ان کے عقائد، دیومالا، اور فلسفے کا عکس ہے) کیا جواز ہو سکتا ہے، یہی اس آیت کے مستقل طور پر جزء قرآن ہونے کی حکمت ہے، آپ نے اس رمضان میں جو تراویح پڑھی اس میں بھی یہ آیت پڑھی گئی ہوگی، اور اگر چھوٹ جاتی تو قرآن نامکمل رہ جاتا، اور اس کو آخر مین پڑھنے کی تاکید کی جاتی، سوال کیا جاسکتا ہے کہ اب نہ یہود رہے اور نہ وہ حضرات انصار ومہاجرین، جن کے سامنے کا یہ واقعہ ہے، اور جو اس کے مخاطب تھے، تو اس آیت کے باقی رہنے کی کیا حکمت اور افادیت ہے۔

میں اس کا جواب دوں گا کہ یہ اس لئے کیا گیا تاکہ ہمیشہ کے لئے یہ حقیقت ہمارے پیش نظر رہے کہ جب ایک لفظ کا استعمال (جو دوسری قوم کا حربہ تھا) درست نہیں تو دوسری قوموں کے مخصوص عادات، اور ان کے شعائر ورسوم کو اختیار کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے، اب یہ منطق کیسے درست کہی جاسکتی ہے کہ بھائی بعض قوموں اور فرقوں کا جلوس نکلتا ہے، جس سے ان کے قومی شان وشوکت

کا اظہار ہوتا ہے، ہم بھی جلوس نکالیں، ان کے یہاں جھنڈا اٹھتا ہے، ہم بھی اس کے مقابلہ میں مزارات پر پنکھے لے جائیں، آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ کی تعریف فرمائی کہ عمرؓ جس راستہ چلتے ہیں، شیطان اس راستہ کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے، ہمیں سبق لینا چاہئے کہ ایسی چیزوں سے ہم احتراز کریں جو ہمیں کسی گمراہی یا غلط فہمی میں مبتلا کر دے، توحید اور اتباع سنت کے راستہ سے ہمارے قدم ڈگمگا جائیں، اور ہم دوسری سرحد میں جا پڑیں، جب ایک لفظ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی غیرت کو حرکت ہوئی، اور اس نے یہ پسند نہیں کیا کہ مسلمان رَاعِنَا کا لفظ استعمال کریں جو ہزاروں برس سے بولا جارہا تھا، اور ابھی تک عربی زبان ولغت میں موجود ہے تو غیر مسلموں اور جاہلی اقوام کے شعائر ورسوم کے اختیار کرنے، اور ریس کرنے میں اللہ تعالیٰ کی غیرت کیوں جوش میں نہ آئے گی، ہندوستان کے غیر مسلم باشندوں نے جب مذہب کی گرفت ڈھیلی ہوگئی یا چھوٹ گئی، اپنے معاشرہ (سماج) کا اپنے مذہب سے (جس کو وہ دھرم کہتے ہیں) رابطہ قائم رکھنے کے لئے اس طرح کے جشن، رونق کی چیزیں، اور اجتماع کے مواقع ایجاد کئے، اس لئے کہ اس کے بغیر ان کے دھرم سے ان کے سماج کا ربط قائم نہیں رہ سکتا تھا، وہاں مسئلہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اظہار عبودیت یا بندگی کا نہیں تھا، اب کیسے معلوم ہو کہ یہ ہندو ہیں، اور ان کا بھی ایک دھرم ہے، اس کے لئے انھوں نے تہوار جلوس، جلسے نکالے، رام لیلا، دسہرا، ہولی، دیوالی، بنگال میں درگا پوجا کا تہوار، دکن میں گن پتی کا جلوس سب اسی قبیل کی چیزیں ہیں۔

اس کے مقابلہ میں اسلام کی روح، اس کا طریق فکر، اور اس کا شعار کیا ہے؟ اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجئے کہ ایک دن ایک یہودی عالم حضرت عمرؓ کے

پاس آتا ہے، اور کہتا ہے "یا امیر المؤمنین آیة تقرؤنها فی کتابکم لو علینا معشر الیهود نزلت لا تخذ نا ذلك الیوم عیدا "امیر المومنین !ایک آیت ہے، جو آپ اپنی کتاب میں (بے تکلف) پڑھتے ہیں، کہیں اگر ہم یہودی جماعت کے بارے میں نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس کا ایک جشن اور تہوار مناتے، حضرت عمرؓ نے فرمایا : کون سی آیت ؟ یہودی عالم نے کہا "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی "یہودی عالم کو معلوم تھا کہ یہودی شریعت اور مذہب کی تاریخ میں اس قسم کا کوئی اعلان نہیں کہ نبوت فلاں اسرائیلی نبی پر ختم ہو گئی، یہ واقعہ ہے کہ اسلام کے علاوہ کسی آسمانی دین میں یہ اعلان موجود نہیں کہ اب دین مکمل ہو گیا، اس خلا کو وہ مذاہب اور ملتیں خود محسوس کرتی تھیں، اس لئے کہ روز کوئی نبوت کا دعویدار کھڑا ہو جاتا تھا، اور کہتا تھا کہ میں نبی ہوں، یہودی اور عیسائی مورخین و فضلاء اپنے مضامین میں سر پکڑ کر روتے اور فریاد کرتے نظر آتے ہیں کہ یہ کیا مصیبت ہے کہ روز ایک مدعی نبوت کھڑا ہوتا ہے، اور یہودی اور عیسائی معاشرہ میں ایک انتشار اور افتراق پیدا ہو جاتا، اور ایک مسئلہ بن کر کھڑا ہو جاتا ہے، اس لئے اتنی بڑی نعمت اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کی ہے، جس سے انتشار اور روز روز کا جھگڑا ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا، لیکن تعجب ہے کہ جس آیت کے ذریعہ آپ کو یہ انعام ملا، اور اس کا اعلان ہوا، آپ اس کا جشن نہیں مناتے ؟

حضرت عمرؓ نے اس کا سیدھا سا جواب دیا، جو دین کا رمز شناس، اور درسگاہ نبوت کا اعلیٰ تربیت یافتہ ہی دے سکتا ہے، فرمایا کہ ہمیں معلوم ہے کہ یہ آیت کب اور کہاں نازل ہوئی، یہ عرفات میں نویں ذی الحجہ کو نازل ہوئی، حضرت عمرؓ نے اتنا ہی کہا، اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ وہ پہلے سے ایک تاریخی اور یادگار دن ہے، جس

میں مسلمان جمع ہوتے اور عبادت کرتے ہیں، دوسرے یہ بھی مفہوم نکلتا ہے کہ وہ کس دن نازل ہوئی، لیکن ہم اس دن کو اس کا تہوار نہیں بنائیں گے، اس لئے کہ آنحضرت ﷺ نے دو ہی عیدیں مانی ہیں، اور امت کو عطا کی ہیں، ایک عید الفطر ایک عید الاضحیٰ، آپ نے فرمایا کہ اللہ نے ہمیں غیر مسلموں کے تہواروں کے مقابلہ میں دو تہوار دیئے ہیں، ایک عید الفطر کا، ایک عید الاضحیٰ کا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں ان دونوں کے علاوہ کوئی مستند اور مشروع تہوار نہیں، یہ بھی خیال رہے کہ غیر مسلموں کے تہوار کھیل کھیلنے، دھوم مچانے، اور رنگ رلیاں منانے کے لئے ہیں، جن میں آدمی خدا کو بھی بھول جاتا ہے اور اپنے کو بھی، اور بعض اوقات تہذیب واخلاق کو بھی، اس کے برخلاف اسلامی تہواروں (عیدین) کی شان یہ ہے کہ چاشت کی نماز، فرض وواجب تو کیا، سنت مؤکدہ بھی نہیں تھی، لیکن ان دونوں دنوں میں اسی چاشت کے وقت میں ایک نئی نماز (دوگانۂ عید) کا اضافہ کیا گیا، اور اس کو سنت مؤکدہ قرار دیا گیا، ہر نماز میں دو تکبیریں، ایک تکبیر تحریمہ اور ایک تکبیر رکوع ہوتی ہے، دوگانۂ عید میں ان دو تکبیروں کے علاوہ تین تکبیریں اور بڑھادی گئیں، یہ اچھا تہوار ہوا، نماز بھی بڑھادی، اور نماز میں تکبیروں کی تعداد بھی بڑھادی، اور ایک خطبہ کا بھی اضافہ ہوا، یہ ہے اسلامی تہواروں کی خصوصیت۔

حضرات! آپ ایک دینی درسگاہ، اور ایک جامعہ کے استاد و طالب علم ہیں، آپ کا فرض ہے کہ اس بات کی چوکسی اور چوکیداری کریں کہ مسلمان **راعنا** تو نہیں کررہے ہیں، **راعنا** کہنے سے **راعنا** کرنا اور بھی بُرا ہے، مسلمانوں کی یہ ذہنیت تو نہیں ہوگئی کہ صاحب فلاں قوم، فلاں فرقہ فلاں چیز کا جلوس نکالتا ہے، ہم اس کے مقابلہ میں فلاں چیز کا جلوس نکالیں، یہ طرز عمل **راعنا** کہنے سے

بھی بدتر ہے، اس لئے کہ راعنا تو ایک لفظ تھا، جو ہوا میں اڑ کر رہ جاتا تھا، لیکن جو چیز غیر مسلموں کی نقل میں کی جائیگی وہ عملی راعنا ہے، اور اس کا اثر عقائد واعمال، اور تمدن ومعاشرت پر پڑے گا، علماء کا فرض ہے کہ جس وقت بھی کوئی ایسی بدعت، کوئی منکر، اور غیر مسلموں کی تقلید کی دعوت سامنے آئے تو صاف کہہ دیں کہ اسلام کا اس سے کوئی واسطہ نہیں، یہ اسلام کی روح اور تعلیمات کے منافی ہے، آج درگاہوں اور مزاروں پر جو کچھ ہو رہا ہے، وہ زیادہ تر غیر مسلموں کی نقل ہے، ان اعمال ورسوم وبدعات کی تاریخ موجود ہے، جن سے پتہ چل سکتا ہے کہ وہ کب اور کہاں سے شروع ہوئیں اور ان کے محرکات کیا تھے، دین کی روح عبادت ہے، دین کی روح انابت الی اللہ ہے، دین کی روح توحید ہے، دین کی روح سادگی ہے، دین کی روح وہ ہے، جس سے کرنے والے کو بھی فائدہ پہونچے دوسروں کو بھی، عید الاضحیٰ میں نماز تو نماز قربانی بھی رکھ دی کہ محلہ اور گاؤں میں بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جو گوشت کو بھی ترستے ہیں، مہینوں گذر جاتے ہیں، ان کو گوشت کھانا نصیب نہ ہوتا، آج پیٹ بھر کر گوشت کھالیں گے، اور حضرت ابراہیمؑ واسماعیلؑ اور آنحضرت ﷺ کی سنت بھی ادا ہو جائیگی۔

خاص طور پر علماء کا فرض ہے کہ اس پر کڑی نظر رکھیں کہ اسلامی معاشرہ میں کوئی راعنا دبے پاؤں تو نہیں چلا آرہا ہے؟ جہاں آئے وہیں اس کو روک دیں، آپ نے امت کو وصیت کرتے ہوئے صاف طور پر فرمایا "علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشین المهدیین تمسکوابها وعضوا علیها بالنواجذ" (میری سنت اور خلافائے راشدین کی سنت کی پیروی کرو جو ہدایت یافتہ تھے، اس کو مضبوط ہاتھوں سے تھامو اور دانتوں سے دباؤ) ہمارے مدارس کا فائدہ اور اصلی غرض

وغایت یہی ہے کہ وہ دین کے چوکیدار، راتوں کو پہرہ دینے والے پیدا کریں، اگر وہ بھی "**ہر کہ درکان نمک رفت نمک شد**" کا مصداق بن جائیں، اور ہر شرعی اور غیر شرعی کام میں عوام کا ساتھ دینے لگیں، بلکہ قیادت کرنے لگیں تو پھر بقول شاعر ؎

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

اگر عربی زبان پڑھی اور اس سے نوکری مل گئی تو پھر عربی انگریزی میں کیا فرق ہوا، علماء کو ورثۃ الانبیاء کہا گیا ہے، اور انبیاء دین کے پاسبان، اور اس کے بارے میں سخت غیور اور ذکی الحس ہوتے ہیں، جب حضرت موسیٰؑ سے یہودیوں نے فرمائش کی کہ "اِجْعَلْ لَنَا اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ" ہمارے لئے بھی کوئی ایسا (رونق اور جشن والا) (محسوس ومرئی) معبود تجویز کر دیجئے جیسے ان قبطیوں اور مصریوں کا ہے، تو انھوں نے جلال میں آکر کہ "**انکم قوم تجھلون ان ھؤلاء متبر ما ھم فیه وبٰطل ما کانوا یعملون**" تم بڑے ہی جاہل لوگ ہو، یہ لوگ جس (شغل) میں (پھنسے) ہوئے ہیں، وہ برباد ہونے والا ہے، اور جو کام یہ کرتے ہیں سب بیہودہ ہیں) بعینہ اسی طرح کا واقعہ، اور اسی جاہلی و تقلیدی ذہنیت کا ظہور ایک سفر میں عہد رسالت میں بھی ہوا، عرب کے بعض قبائل کو ایک بڑے اور سرسبز درخت سے جس کا نام ذات انواط تھا، خاص عقیدت تھی وہ اس میں اپنے ہتھیار لٹکاتے تھے، اور اس کے نیچے قربانیاں کرتے تھے، ایک دن وہاں قیام کرتے تھے، غزوہ حنین کے موقعہ پر بعض ایسے مسلمانوں کے (جن کو اسلام لائے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے) اس کو دیکھ کر منہ میں پانی بھر آیا، اور بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا، "یا رسول اللہ ﷺ ہمارے لئے بھی ایک ایسا ہی مرکز عقیدت تجویز

فرمادیجئے، جیسا ان قبائل کے پاس ہے، آنحضرت ﷺ کو یہ سن کر بڑا جلال آیا اور فرمایا کہ یہ تو حضرت موسیٰؑ کی قوم کا سا قصہ ہوا، بے شک تم اپنی پیش رو قوموں کی ایک ایک بات اور طریقہ کی پیروی کروگے"

علماء میں بھی ایسا دینی جلال، اور توحید وسنت کے بارے میں غیرت اور حمیت ہونی چاہئے، اور ہمارے مدارسِ عربیہ ودینیہ یہی عنصر اور جنس پیدا کرنے کے لئے قائم ہوئے تھے، اور ان کو اپنی یہ خصوصیت ہمیشہ برقرار رکھنی چاہئے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین .

صلی اللہ علیہ وسلم

انسانی معاشرہ میں
عدل واحسان (انصاف اور نیکی) کی اہمیت

یہ تقریر اجین کے اس جلسہ عام میں کی گئی، جس کا انتظام ۲۵ر نومبر ۱۹۸۳ بروز جمعرات شہر کی ایک عام شاہراہ (سڑک) پر کیا گیا تھا جس میں بڑی تعداد میں شہر کے تعلیم یافتہ اور غیر مسلم بھی شریک تھے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسانی معاشرہ میں

عدل واحسان (انصاف اور نیکی) کی اہمیت

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (سورۂ نحل). ۹۰) بے شک اللہ تعالیٰ اعتدال اور احسان کا اور اہل قرابت کو دینے کا حکم فرماتے ہیں، اور کھلی برائی اور مطلق برائی اور ظلم کرنے سے منع فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ تم کو اس لئے نصیحت فرماتے ہیں کہ تم نصیحت قبول کرو۔

بھرے بازار اور شاہراہ عام پر کی جانے والی بات کی اہمیت وتاثیر

میرے بھائیو اور دوستو! ہم لوگ اس کے عادی ہیں کہ کسی ہال یا بہت پر سکون جگہ پر تقریر ہو، جہاں اگر کوئی سوئی بھی گر جائے تو آواز آئے، اور سب لوگ کان لگا کر سن رہے ہوں، لیکن میں بہت خوش ہوں کہ آج عین بازار میں جلسہ ہو رہا ہے، میرا خیال یہ ہے کہ جب تک کوئی بات بازار میں نہ آئے، بازار میں اس کا چرچا نہ ہو، اور بازار والے اس کو قبول نہ کرلیں، اس کا اعتبار نہیں، اس وقت بہت

بڑی کمزوری یہ ہے کہ ہم مدرسوں میں، مسجدوں میں، اور ہمارے بہت سے بھائی مندروں میں، پاٹ شالاؤں میں بات کرتے ہیں، لیکن ان کی حیثیت ایسی ہے، جیسے سمندر میں کوئی جزیرہ ہو، وہاں آپ جو چاہئے کر لیجئے، سمندر کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہوتا، یا ہوائی جہاز پر آپ اُڑ رہے ہوں، وہاں باتیں کر رہے ہوں، اور آپ کے آس پاس کے حضرات دو چار، چھ آدمی وہاں سن رہے ہوں، اور آپ خوش ہو رہے ہوں کہ ہم نے اتنی اونچائی سے یہ بات کہی ہے کہ اب یہ بات ضرور دنیا میں چل جائے گی تو جہاز تو چلے گا، مگر آپ کی بات نہیں چلے گی، اس لئے کہ آپ کی بات اس جہاز کے اندر گونج کر رہ جائیگی، اب بھی دنیا سے سچائی ختم نہیں ہوئی، اچھی بات کہنے کا چلن ختم نہیں ہوا، مگر وہ ہوائی جہازوں میں کہی جانے لگی، یا کسی گنبد اور اونچے محل میں کہی جا رہی ہے، اور دنیا میں ہو کچھ رہا ہے، باتیں بڑی اونچی اونچی کہی جاتی ہیں، لیکن اونچی جگہ سے کہی جاتی ہیں، اونچے ہی لوگ کہتے ہیں، اونچے ہی لوگ سنتے ہیں، اونچی جگہ پر کہتے ہیں، مگر ہم آپ جو زمین پر چلنے والے ہیں وہ اس سے متاثر نہیں ہوتے ہیں، اس لئے کہ وہ بات ابھی عام زندگی کی سطح پر نہیں آئی، میں پڑھنے لکھنے والا آدمی ہوں، ایسی جگہ بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہوں، جہاں چڑیا پر نہ مار سکے، مجھے یہاں بازار میں کھلی سڑک پر گھبرانا چاہئے تھا، ڈسٹرب (DIS-TURB) ہونا چاہئے تھا، مگر زندگی نے مجھے کچھ سبق دیا ہے، اس کی بنا پر میں خوش ہوں، اور میں چاہتا ہوں کہ یہ سلسلہ جاری ہو کہ جو باتیں مدرسوں اور مسجدوں کے اندر کہی جاتی تھیں، کبھی ریڈیو پر کہی جاتی ہیں، وہ باتیں بازار میں کہی جائیں،

ہندوستان کی آزادی کی تحریک جب تک کہ ہال میں رہی، لائبریریز میں رہی، اور اسکالرس کے درمیان رہی، دانشوروں، فلاسفر اور تھنکرز THINKERS

کے درمیان رہی، ہندوستان ٹس سے مس نہیں ہوا، نہ انگریزی حکومت ٹس سے مس ہوئی، لیکن جب پبلک جلسے ہونے لگے، جب پارکوں میں وہ بات کہی جانے لگی، جب بر سر بازار، بر سر راہ وہ بات کہی جانے لگی، تو ہندوستان کیا برطانوی حکومت ہل گئی، جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس کی قلمرو میں سورج ڈوبتا نہیں ہے، اگر یہاں ڈوبا تو کہیں نکلا ہوا ہوتا ہے، تو سڑکوں اور بازاروں میں جلسے، عوامی جگہوں پر اجتماعات، یہ بہت اچھا سلسلہ ہے۔

معتدل وپرسکون NORMAL حالات وفضا کی ضرورت

اس وقت دنیا کو وہ آتش فشاں کے دہانے پر کھڑی ہے، جہاں پھٹ جانے والا مادہ ہوتا ہے، میں سیدھی سیدھی بات آپ سے کہتا ہوں، ذرا آپ سوچئے! اس وقت آپ لوگ بہت شانت ہو کر، بہت اطمینان سے میری بات سن رہے ہیں، اگر کبھی پانی برسنے لگے تو ایک کا بھی بیٹھنا مشکل ہے، اسی طریقہ سے اگر کوئی جانور آجائے، بات کیا ہے؟ اچھی بات ہو، انصاف کی بات ہو، سب نارمل حالت میں کہی جاتی ہے، سنی جاتی ہے، اگر نارمل حالت نہ ہو، اگر غیر معتدل Abnormal حالات ہوں، فضا بالکل بگڑی ہوئی ہو، بجلی چمک رہی ہو کہ اب گری تب گری، اور بادل گرج رہے ہوں، معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ ٹوٹ جائیگا، اور پانی موسلا دھار برس رہا ہو، تو اگر کوئی دنیا کا بڑے سے بڑا مقرر بھی اسٹیج پر آئے اور کہے کہ میں تمہیں بڑی حکمت کی باتیں سنانے والا ہوں، کوئی سننے کے لئے تیار نہیں ہوگا، یہ انسان کی فطرت ہے، انسان نارمل حالت میں جب اس کی طبیعت کو سکون ہوتا ہے، کوئی ڈر نہیں ہوتا، کوئی خطرہ نہیں ہوتا، وہ بہت زیادہ بیمار نہیں ہوتا، بہت زیادہ بھوکا نہیں ہوتا، بات غور سے سنتا ہے، اور مانتا بھی ہے، اور کوئی اندر کی پریشانی ہو، یا باہر

کی پریشانی ہو تو پھر چاہے سر کاٹ کر رکھ دیجئے، انسان سنتا نہیں، ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے اس ملک ہندوستان ہی میں نہیں، ساری دنیا میں نارمل حالات ہوں، تاکہ کام کرنے والوں کو کام کا موقعہ ملے، پڑھانے والوں کو پڑھانے کا موقعہ ملے، لٹریری لوگوں کو لٹریچر کی خدمت کا موقعہ ملے، جو شاعر ہیں، انھیں شاعری کا موقعہ ملے، جو آرٹسٹ ہیں، ان کو اپنے آرٹ میں اپنا کمال دکھانے کا موقعہ ملے، جو دانشور ہیں، اسکالر ہیں، ان کو تحقیق کرنے اور ریسرچ کرنے کا موقعہ ملے، ریسرچ کے، لٹریچر کے جو بڑے بڑے شاہکار دنیا میں تیار ہوئے، یہ سب نارمل حالات میں ہوئے، کسی شخص کے پیٹ میں درد ہو، اس سے کچھ لکھا جائیگا؟ کچھ بولا جائیگا؟ آپ ہزار منطق اس پر صرف کر دیجئے اس کو قائل کرنے کی کوشش کیجئے، پیٹ میں درد ہے تو کیا بات ہے، ہوتا ہی ہے۔ آپ اپنا کام کیجئے، آپ تو شعر سنئے، مگر کیا اس سے سنا جائیگا، اور وہ لطف لے سکے گا؟

اس عہد اور معاشرہ کی سب سے بڑی کمی

حضرات! اللہ نے اس ملک کو سب کچھ دیا ہے، مگر پھر کس چیز کی کمی ہے، وقت پر کام نہیں ہوتا، اور کسی کی مانگ پوری نہیں ہوتی، ذرا سا کام آپ کا ہو، آپ کو سفر کرنا ہو، بغیر رشوت دیئے ہوئے کوئی کام ہی اس زمانہ میں نہیں ہو رہا ہے، خدا نے زندگی میں کوئی کمی نہیں رکھی اس کو ہر طرح سے مکمل کر کے اس نے دیا، اس دنیا کو ایسا بنا دیا کہ اگر آدمی چاہے تو اس کو زندگی کا حقیقی مزا آنے لگے، جنت کا مزا چاہے آئے نہ آئے، جینے کا مزا ضرور آجائے، پریم ہو، محبت ہو، وقت پر کام ہو، پاؤں پھیلا کر، آنکھ بند کر کے خوب میٹھی نیند سوئیے، نہ چور کا کھٹکا نہ ڈاکو کا دھڑکا، نہ کسی لٹیرے کا غم، کسی چیز کی فکر نہ ہو، سونا اچھالتے ہوئے چلے جائیے کوئی پوچھنے والا نہ

ہو، کوئی دیکھنے والا نہ ہو، یہ سب کچھ ہے، پھر آپ سوچئے کہ کس چیز کی کمی ہے، سائنس نے کتنی ترقی کی، ٹکنالوجی نے کتنی ترقی کی کہ دنیا میں اب سردی، گرمی کو کنٹرول کر لیا گیا ہے، بیماریوں پر کنٹرول کر لیا گیا ہے، فاصلے ختم کر دیئے گئے ہیں، اور اب اسپیس SPACE کوئی چیز نہیں ہے، یہ سب کچھ ہوا، لیکن نتیجہ کچھ نہیں، مقصد حاصل نہیں ہو رہا ہے۔

بات کیا ہے؟ چیزیں بنیں، مشینیں بنیں، مگر آدمی نہیں بنا، ان مشینوں سے کام لینے والا آدمی تھا، وہ نہیں بنا، اور آپ جانتے ہیں کہ جب آدمی تھا اور مشینیں نہیں تھیں، تو دنیا کیسی سکھی تھی، راجہ بکرماجیت کا زمانہ یاد کیجئے، جس کو آج تک لوگ یاد کرتے ہیں، اور آپ کے شہر کا بہت بڑا نام ہے بکرمی جنتری، آپ کے شہر سے شروع ہوئی راجہ بکرماجیت کے زمانہ میں، میں آپ سے پوچھتا ہوں، یہ مشینیں تھیں؟ یہ مائک تھا؟ جس سے دور تک آواز پہونچائی جا سکے، یہ ریڈیو تھا، ٹی، وی تو خیر ابھی آیا ہے، لیکن ریڈیو بھی تھا؟ مگر کیا تھا؟ کان تھے دل تھا، اور کان تھے، تو مائک ہو نہ ہو، لاؤڈ اسپیکر ہو نہ ہو، ریڈیو ہو نہ ہو ELECTRICITY ہو نہ ہو، پھر بھی آدمی دور کی بات بھی سن لیتا تھا، اور مان لیتا تھا، اپنے فائدے کی بات، دوسروں کے فائدے کی بات، اب مصیبت یہ آئی ہے کہ مشینیں موجود، اچھی سے اچھی بات دور سے دور جگہ تک آپ پہونچا سکتے ہیں، مگر آدمی سننے کے موڈ میں نہیں، اس کا سننے کو جی ہی نہیں چاہتا، وہ تو بس پیسہ کے پیچھے، آرام کے پیچھے، عیش کے پیچھے، مالدار بن جانے کے پیچھے، عزت دار بن جانے کے پیچھے، اور کرسی کے پیچھے ایسا دیوانہ ہو کر پڑا ہے کہ اس کو کچھ ہوش نہیں ہے، اب کیا فائدہ ان چیزوں کا؟ بلکہ یہ چیزیں اور زیادہ نقصان پہونچاتی ہیں، آدمی جس کی نیت خراب ہے، ان سے بُرا کام لے سکتا ہے۔

بھائیو! ہم یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ اچھے کام ہیں، یہ کام جب ہو سکیں گے اور ان کا تحفظ PROTECTION ان کی گارنٹی اس وقت ہے، جب عام فضا AT-MOSPHERE درست ہو، جب کہ ہمارے آپ کے بازار کی زندگی اچھی ہو، بازار میں جو لوگ آتے ہیں، دکانوں پر بیٹھتے ہیں، سودا خریدنے آتے ہیں، گھر لے جاتے ہیں، یہ جب اچھے آدمی ہوں گے، بھلے آدمی ہوں گے، خدا سے ڈرنے والے اور انسان سے محبت کرنے والے ہوں گے تو پھر اس کے بعد ہر اچھا کام ہو سکے گا، ہندوستان میں سیکڑوں یونیورسٹیاں ہیں، لیکن روز جھگڑا ہے، لڑکے پڑھنا نہیں چاہتے، ٹیچر پڑھانا نہیں چاہتے، وہ ڈگری چاہتے ہیں، یہ تنخواہ چاہتے ہیں، ان یونیورسٹی والوں سے پوچھئے، وہ فریاد کرتے ہیں، صاحب! کہاں کا پڑھنا، کہاں کا پڑھانا؟ نہ ہمیں پڑھانے کا شوق ہے، نہ انھیں پڑھنے کا شوق، اور ہمیں پڑھانے کا شوق ہو بھی تو ان کو پڑھنے کا شوق نہیں، وہ تو ڈگری لینے کے لیے آتے ہیں، وہ تو کہتے ہیں کہ ہماری حاضری لکھ لیجئے بلکہ یہ مطالبہ ہونے لگا ہے کہ بغیر امتحان کے ڈگری دے دی جائے، بی اے ہو گیا، ایم اے ہو گیا، ایل ایل بی ہو گیا، کہتے ہیں کہ امتحان کو ختم ہی کرا دو۔

خود غرضوں اور دولت پرستوں کی سنگدلی اور انسانیت کی پامالی

بھائیو! سامان ہونے سے کچھ نہیں ہوتا، اصل میں من ہے، اصل میں آدمی کی روح ہے، وہ اگر صحیح ہو جائے، کانشنس (CONCIENCE) اس کا صحیح ہو جائے، اور وہ چیزوں کا صحیح طور پر استعمال کرنا سیکھ جائے تو تھوڑا سامان بھی بہت ہے، بلکہ سامان کچھ بھی نہ ہو تب بھی کام چلا لے گا، خدا کے پیغمبروں نے بہت

تھوڑے سامان کے ساتھ بہت بڑا کام کیا، آج اتنے بڑے سامان کے ساتھ کچھ کام نہیں ہو رہا ہے ،بات کیا ہے؟ ہمارے اوپر ان چیزوں کی حکمرانی ہے، وہ چیزیں DOMINATE کر رہی ہیں، ہم پر حکومت چلاتی ہیں، جو انسان کے لئے پیدا کی گئی ہیں، اور انسان کی ضرورت پوری کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہیں، انسان ان کا غلام بن گیا ہے، اب انسان ان کے پیچھے آنکھ بند کر کے ایسا پڑا ہے، کہ آدمی اپنے جیسے انسانوں کو روندتا ہوا، ان کی لاشوں پر چلتا ہوا وہاں پہونچنا چاہتا ہے، آج یہ حالت ہو گئی ہے کہ بہت سے آدمی ایسے ملیں گے کہ جنھیں معلوم ہو جائے کہ پیسہ اس کے بغیر نہیں ملے گا، ترقی اس کے بغیر نہیں ملے گی کہ آدمیوں پر پاؤں رکھتا ہوا چلا جائے، کسی کے پیٹ پر اور کسی کے سینہ پر اور کسی کے منھ پر، تو بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جو اس کی پرواہ نہیں کریں گے ،آدمیوں کو روندتے ہوئے نکلیں گے ، اور آدمیت تو روندی جا ہی رہی ہے ،آدمی کو روندیں نہ روندیں، لیکن آدمیت کو تو روز روندا جا رہا ہے ،پاؤں سے اس کو کچلا جا رہا ہے، اس کو ذلیل کیا جا رہا ہے، ہمارا پیام یہ ہے کہ آدمیت پیدا کیجئے ،اور فضا درست رکھئے، تاکہ سب اچھے کام ہو سکیں ،ورنہ بھائی! کسی کام کی خیریت نہیں ہے، اگر فضا اچھی نہ ہوئی، اور یہی بجلیاں چمکتی اور کوندتی رہیں، بادل گرجتے رہے ،پانی برستا رہا، فرض کیجئے کوئی کتا ہی بیچ میں آگیا، اور کسی نے پکار کر کے کہہ دیا کہ بھیڑیا، بھیڑیا، پھر کوئی نہیں سنے گا، نارمل فضا رکھو تاکہ ہر اچھا کام ہو سکے ، نہیں تو نہ علماء وعظ کہہ سکیں گے ،نہ کوئی بھلا آدمی پیغام دے سکے گا، کوئی کسی کا سنے گا ہی نہیں ، جب زلزلہ آتا ہے، اللہ بچائے، تو پھر کسی کو کسی کا ہوش نہیں رہتا، آگ لگتی ہے تو ماں باپ بچوں تک کو بھول جاتے ہیں، جنگ عظیم GREAT WAR میں یہ حالت تھی کہ کسی کو کسی

کا ہوش نہیں تھا تو بس ہم یہ کہتے ہیں کہ امن وامان رہے، آدمی آدمی کی قدر کرے، آدمی آدمی سے محبت کرنا سیکھے۔

آپ کے یہاں کالی داس ہوئے ہیں جو بہت بڑے شاعر تھے، آج تک ان کا کلام زندہ ہے، ان کا زمانہ امن کا زمانہ تھا، شانتی PEACE کا زمانہ تھا، نارمل حالات تھے، جب جاکر انھوں نے ایسی زندہ جاوید چیز تیار کی جو آج تک پڑھی جاتی ہے، ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں نارمل حالات رہیں، تاکہ اخلاق کے سکھانے والوں کو اخلاق سکھانے کا موقع ملے، علم سکھانے والوں کو علم سکھانے کا موقعہ ملے، انسانیت سکھانے والوں کو انسانیت سکھانے کا موقعہ ملے

عدل واحسان کی برکت

ابھی قرآن شریف کی آیت پڑھی گئی "إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالعَدلِ وَالاحْسَانِ وَايتَائِ ذِي القربىٰ" اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ انصاف JUSTICE کے اصول کو اپنایئے اور احسان کو اپنا شعار بنایئے، انصاف تو یہ ہے کہ جتنا دینا ہے دے دو، اور احسان یہ ہے کہ اس سے کچھ زیادہ دے دو، انصاف یہ کہ جتنا کرنا ہے کر لو، اور احسان یہ کہ اس سے بھی زیاد کر لو، اگر تمھارے ساتھ کسی نے ناانصافی کی اور تم انصاف کرو، یہ احسان ہوگا، یہ اعلیٰ اخلاق کی تعلیم ہے، سب مذہبوں نے تعلیم دی، اور اسلام نے تو ایسی دی کہ ایک نئی دنیا بنا کر رکھ دی، اس زمانہ کا جو سماج تھا، اس کے حالات آپ پڑھیں، کوئی حد ہے، ایک آدمی نے پاس والے گھر کو کوئی چیز جو اس کے یہاں پکی تھی، بھیجی تحفہ میں، تھوڑی دیر کے بعد اسی کے گھر میں واپس آگئی، کیسے واپس آئی؟ ہم نے تو اسے گھر سے نکال دیا تھا، اس نے گھر کو بھیجی تھی، اس گھر والے نے اس گھر کو بھیجی، اس گھر والے نے اس گھر کو بھیجی، اور چکر کھا کر کے

پھر اسی کے یہاں آگئی، اپنا ہی تحفہ واپس اپنے پاس آگیا، اور اس سے بڑھ کر کے یہ کہ ایک زخمی جان دے رہا ہے، بالکل جان کنی کی حالت ہے، اور پانی پیش کیا جاتا ہے، تو کہتا ہے نہیں میرے پاس ایک دوسرا زخمی پڑا ہوا ہے، میں نے اس کی کراہ ابھی سنی ہے، اس کو دیجئے، اس کو دیا تو اس نے کہا تیسرے کو دیجئے، تیسرے، چوتھے، اخیر میں وہ جب اس کے پاس آیا تو وہ مر چکا تھا، وہ بھی مر چکے تھے، وہ سب تو مر چکے تھے، لیکن اخلاق کو زندہ کر گئے، اور زندگی کی تعلیم دے گئے کہ اللہ کے بندے، شیر مرد اس طرح کرتے ہیں، کہ جان دے دیں، لیکن اپنے اوپر دوسرے کو ترجیح دیں۔

خود غرضی ساری خرابیوں کی جڑ ہے

آج دنیا کی ساری خرابی یہ ہے کہ آدمی اپنا کام نکال لینا چاہتا ہے (معاف کیجئے! ہماری یوپی کی زبان میں "**اپنا الوسیدھا کر لینا**" چاہتا ہے) چاہے ——— کسی کی جان جائے، چاہے کسی کے بچے مر جائیں، بس اپنا الوسیدھا ہو، سارا فساد اس وقت اسی وجہ سے ہے، ریلوں میں کیا ہو رہا ہے، ؟ ڈاکے پڑ رہے ہیں، محکموں میں کام نہیں ہو رہا ہے، آدمی کو اپنا حق نہیں مل رہا ہے، کوئی کام وقت پر نہیں ہو رہا ہے، ڈاک خانے چوپٹ، ٹیلی فون کو تو پوچھئے نہیں، وہ تو بالکل ستیاناس، اور ریلوں کی بُری گت ہے، نہ وقت کی پابندی نہ کسی کے اندر ڈیوٹی کا احساس، نہ ذمہ داری کا شعور، اب کیسے یہ کارخانہ چلے؟

کیا انسان ہی مارنے کے لئے رہ گیا ہے؟

آج انسان آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے، آدمیوں کو مارنے والوں سے پوچھتا ہوں، ذرا بتاؤ! تم نے اپنی زندگی میں کتنے مچھر مارے ہیں، ذرا لکھ کر مجھے

دو، ایک بچھو نہیں مارا ہوگا، ایک سانپ نہیں مارا ہوگا، ایک بھیڑیئے کا شکار نہیں کیا ہوگا تو کیا آدمی ہی رہ گیا مارنے کے لئے؟ خدا کے غضب سے نہیں ڈرتے ہو، کیا آدمی بچھو سے بھی گیا گذرا، سانپ سے بھی گیا گذرا ہے، کتنے چوہے مارے یہی بتادیجئے؟ چوہے بڑا نقصان کرتے ہیں، آپ نے کتنے چوہے مارے؟ یہ جو بڑے تیس مار خاں بنے ہوئے ہیں، رستم بنے ہوئے ہیں، اور جن کے ہاتھ انسانوں کے خون سے سرخ ہو رہے ہیں، انھوں نے کتنے موذی جانور مارے ہیں؟ ایک نہیں مارا ہوگا، آدمی مارنے کے لئے شیر ہیں، اور شیر مارنے کے لئے بلی، شرم آنی چاہئے۔ کسی کے باغ میں جاکر کے ایک پھول کو مسلو، معلوم ہو جائیگا کہ تمھارا کیا حشر ہوتا ہے؟ باغ کے مالک ایک پھول خراب کرنے اور ایک گلاب کا پودا نکالنے کے روادار نہیں، تو کیا اللہ میاں اپنے اس چمنستان میں یہ پسند کرے گا کہ وہ بنائے اور تم بگاڑو، کمہار ہی کے یہاں جاکر کبھی دیکھ لو دو چار گھڑے توڑو، دیکھو کیسے آتے ہو، سر بھی تمھارا سلامت رہتا ہے کہ نہیں، دو ٹکے کا کمہار تمہیں بغیر مارے نہیں چھوڑے گا، کمہار کے گھڑے نہیں توڑ سکتے ہو، اللہ میاں کے بنائے ہوئے یہ پھول، اللہ کے بنائے ہوئے یہ گلدستے، اللہ میاں کے بنائے ہوئے یہ شیش محل، اللہ میاں کے بنائے ہوئے یہ تاج محل، جس پر ہزار تاج محل قربان ہوں، تاج محل یہ کس کا بنایا ہوا ہے، انسان کا، انسان کس کا بنایا ہوا ہے، خدا کا، پھر اس تاج محل کی کیا حقیقت ہے؟ انسان کے سامنے، اللہ میاں تاج محل بنائیں، تم توڑو، ذرا آگرہ کے تاج محل پر تم ہاتھ اٹھا کر دیکھو، گردن تمھاری ناپی جاتی ہے کہ نہیں؟ اپنے یہاں کے جو آثار قدیمہ ہیں، جو خود گر رہے ہیں، ان پر کہیں ہاتھ اٹھا کے دیکھو، پس اللہ میاں کی بنائی ہوئی چیزیں ہی ایسی سستی ہیں کہ ان کی کوئی قیمت ہی نہیں، جب چاہو ان کو

توڑ کر کے رکھ دو، صاف سن لو، فسادات کر کے، آدمیوں کو مار کر کے، رشوت لے کر کام چوری کر کے، ملک رہے گا نہیں، چاہے اس کی پشت پر امریکہ ہو، چاہے روس ہو، سن لو! صاف بات، اپنا گھر اگر تم بگاڑو گے، کوئی دوسرا سنبھال نہیں سکتا، اپنا گھر اپنے ہی ہاتھ سے بنتا ہے، اپنے گھر کو سنبھال لو۔

راجہ بکرماجیت کا نام کیوں زندہ ہے؟

ہندوستان میں معلوم نہیں کتنے راجا آئے اور چلے گئے مگر بکرماجیت کا نام زندہ ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ان میں انصاف تھا، اس زمانہ کے مطابق ان کو رہنمائی ملی، اس کے مطابق انھوں نے انصاف کیا، ہم نے تاریخ میں پڑھا بھی ہے کہ وہ منصف تھے، اور بہت اچھے راجہ تھے جب ہی ان کا نام ابھی تک زندہ ہے، ان کے اسی شہر میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ یہاں کی فضا کو درست رکھئے، تاکہ اچھے لوگ اپنا کام کر سکیں، لکھ پڑھ سکیں، پیام دے سکیں، لکھا سکیں، پڑھا سکیں اور اس ملک کی خدمت کر سکیں، اور مالک کی عبادت کر سکیں جب کہیں فساد ہوتا ہے، تو مسجدوں میں اذان بھی نہیں ہو سکتی، نماز بھی نہیں ہو سکتی، لوگ جاتے ہوئے ڈرتے ہیں، گھر سے نکلتے نہیں۔

جل جلالہ

اخلاقیات سائنس کا موضوع نہیں

مفکر اسلامؒ نے یہ تقریر اندور شہر کے ٹیگور ہال میں ۵/دسمبر ۱۹۷۷ء کو ۸ بجے شب میں کی تھی، حاضرین میں تعلیم یافتہ غیر مسلموں کی کثیر تعداد تھی، جن میں وکلاء، ڈاکٹر، انجینیر، سیاسی لیڈر، سماجی کارکن، غرض ہر طبقہ اور ہر مکتب خیال کے لوگ شریک تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اخلاقیات سائنس کا موضوع نہیں

میں اپنی خوشی آپ سے چھپا نہیں سکتا

معزز حاضرین! دوستو اور بھائیو!

میں اس وقت اپنے سامنے ایسا تعلیم یافتہ اور چیدہ مجمع دیکھ کر بڑی مسرت اور خوشی محسوس کر رہا ہوں اور میرے اندر ایک نیا حوصلہ، ایک نئی طاقت اور امنگ پیدا ہو رہی ہے، کسی شخص کو جو کچھ سوچنے سمجھنے کی عادت رکھتا ہے، اور پھر اس کی طبیعت میں، اس کے ذہن میں، کچھ خیالات پیدا ہوتے ہیں، بعض چیزوں سے وہ خوش ہوتا ہے، بعض چیزوں سے وہ بے چینی اور خطرہ محسوس کرتا ہے، اس کو اپنے ملک سے، گھر سے سچی محبت ہوتی ہے، وہ ہر انسان کو محبت کی، پیار اور پریم کی نگاہ سے دیکھتا ہے، ایسے سننے والوں کو اپنے سامنے پاکر اور ان کو اس توجہ کے ساتھ اپنی طرف متوجہ پاکر، اس کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے، یہ ایک ایسا ٹانک، ایک ایسا انجکشن ہے جس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

انسان جب دنیا میں تنہائی محسوس کرتا ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے دل کی بات خلوص کے ساتھ کسی سے کہہ نہیں سکتا، لوگوں کو اس کی بات سننے کی

فرصت نہیں ہے یا اس پر کوئی بھروسہ، وشواس واعتماد نہیں ہے تو اس کا دل چکنا چور ہو جاتا ہے، اس لئے کہ انسان کے اندر جو کچھ طاقت ہے، اور دنیا میں جو اس کا دل لگتا ہے، جنگل میں کپڑے پھاڑ کر نکل جانے کو اس کا جی نہیں چاہتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ یہ اطمینان محسوس کرتا ہے ہے کہ اپنے دل کی بات اپنے بھائیوں سے، دوستوں سے کہہ سکتا ہے، اور سب بھائی اور سب دوست اس کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔

یہی خیال اگر اس کو ہو جائے کہ ہر آدمی اس کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے، اور اس کا استقبال وہ بدگمانی اور شک کے ساتھ اور کچھ تردد کے ساتھ کر رہا ہے تو اس کے دل پر، اس کے جوش پر، اس کے جذبات پر اوس پڑ جاتی ہے۔

میں اپنی خوشی آپ سے چھپا نہیں سکتا کہ میں اپنے سامنے ایسے پڑھے لکھے چہرے دیکھ رہا ہوں، پڑھا لکھا آدمی پہچان لیا جاتا ہے، اگرچہ میرا تعارف آپ سے کرایا گیا، جو غیر ضروری رسم ہے، آپ کا تعارف مجھ سے نہیں کرایا گیا یہ تو یک طرفہ کاروائی (ONE WAY TRAFFIC) ہوئی، میرا تعارف آپ سے کرایا گیا آپ کا تعارف شاید اس لئے نہیں کرایا گیا کہ یہ ذرا مشکل کام ہے، ایک آدمی کا دو آدمیوں کا تین آدمیوں کا تعارف کرایا جا سکتا ہے، اتنے بڑے مجمع کو کیسے متعارف کرایا جا سکتا ہے، پھر اس میں یہ ہوتا کہ کوئی اگر رہ جائے تو اس کو شکایت ہوتی، لیکن میں اپنی زندگی کی بڑی مدت پڑھانے والا استاد (TEACHER) رہا ہوں تو ٹیچر کو خاص طور پر اس بات کی مشق ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے مخاطبوں کو جن لوگوں کو وہ (ADDRESS) کر رہا ہے، جن لوگوں سے وہ بات کرنا چاہتا ہے، وہ ان کی پیشانی کی لکیروں کو پہچاننے لگتا ہے وہ ان کے چہروں کے اتار چڑھاؤ کو پہچانتا ہے وہ ان کی

آنکھوں کی چمک کو دیکھتا ہے اس لئے اور کوئی (DISTINCTION) نہ ہو، کوئی اور میری (QUALIFICATION) ہو نہ ہو، لیکن میں نے بچوں کو پڑھایا ہے نوجوانوں کو پڑھایا ہے، اس لئے میں کسی حد تک آدمی کو پہچانتا ہوں، جب میں دیکھتا ہوں کہ سنجیدہ باوقار، پر سکون اور سوچنے والے INTELLECTUAL (CLASS سے تعلق رکھنے والی ایسی (GATHERING) میرے سامنے ہے تو میرے دل میں ایک طوفان ایک جوش اٹھتا ہے کہ میں اپنا دل نکال کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔

اپنے گھر کی بپتا اپنے ملک کی کہانی

افسوس ہے کہ سائنس کی ساری ترقیوں کے باجود ابھی تک سائنٹسٹ اس میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں کہ کوئی شخص اپنا دل نکال کر رکھ دے، دل نکال کر رکھ دینا تو آسان ہے مگر اس کا واپس جانا مشکل ہے یعنی آپریشن کے ذریعہ دل نکال کر ٹیبل پر رکھا تو جاسکتا ہے مگر پھر وہ اپنی صحیح جگہ پر پہونچ جائے یہ مشکل ہے۔

دل کے آپریشن کامیاب تو ہو رہے ہیں لیکن ایسا کہاں ہو سکتا ہے کہ ہر مقرر اپنا دل نکال کر سامنے رکھ دے اور پھر اس کے بعد وہ اس کو اپنی جگہ پر فٹ بھی کر دے۔

لیکن سب کو اس کی ضرورت نہیں، مجھے یہ اطمینا ہے، میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آپ حضرات جب سردیوں کی اس رات میں ایک ایسے پردیسی آدمی کی بات سننے کے لئے جس سے آپ پہلے سے واقف نہیں تھے آئے ہیں تو آپ بہت (SER-IOUS) ہیں، آپ بہت سوچ سمجھ کر آئے ہیں اس لئے مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے دل کا درد اپنی بپتا اپنے گھر کی بپتا اپنے ملک کی بپتا اور اس صدی اس عہد (ERA) پہ جو چل رہا ہے، اس کی ٹریجڈی آپ کے سامنے بیان کروں اور اس کا زخم

اس کی المناک روداد اور اپنے دل کا زخم آپ کے سامنے رکھوں، اگر ایسا مجمع بھی اس کا حق نہیں رکھتا تو میں نہیں سمجھتا کہ وہ کون سا مجمع ہوگا جس کے سامنے دل کے درد کی کہانی سنائی جا سکے، ملک میں خطرے کی گھنٹی بج رہی ہے اور ہماری سوسائٹی، دنیا کی سوسائٹی خطرہ میں ہے، لیکن دنیا بہت بڑی ہے اور اس کی فکر کرنے والے بھی بہت ہیں لیکن یہ دیس ہمارا دیس ہے اس کی فکر کرنے والے امریکہ اور یورپ سے نہیں آئیں گے، روس سے نہیں آئیں گے، ہم ہی آپ ہوں گے اس لئے میں آپ کے سامنے اپنے دل کا درد رکھنا چاہتا ہوں اور آپ کو بھی اس درد میں شریک کرنا چاہتا ہوں، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میرے دل میں زیادہ درد ہے اور آپ کے دل میں درد نہیں ہے، لیکن سمجھتا ہوں کہ میں اپنا دردِ دل آپ سے کہوں اور آپ اپنا دردِ دل مجھ سے کہیں یہ بڑی اچھی علامت ہے، بہت اچھی (SIGN) ہے، ہماری اس سوسائٹی کی کہ اگر کسی کو کوئی دعوت دی جاتی ہے (INVITE) کیا جاتا ہے، اس میں کوئی سیاسی (POLTTICAL) غرض نہیں ہوتی، کسی پارٹی کی طرف سے جلسہ نہیں ہوتا جب کہ اتنے سنجیدہ مشغول لوگ جو کام میں مصروف ہیں، جنھوں نے دن میں محنت کی ہے، اور مطالعہ کیا ہے، پڑھا ہے لکھا ہے جو اسکالرس ہیں اور شہر کے معززین ہیں وہ جمع ہو جائیں جب تک ہمارے ملک میں اتنی بات ہے اس وقت تک اس ملک کی ناؤ ڈوبے گی نہیں، اگر کسی کی آواز پر خواہ اس آواز دینے والے کو نہ پہچانا جاتا ہو، پہچانتے ہوں جب تو کوئی بڑی تعریف کی بات نہیں ہے، اندور کے کوئی بڑے پروفیسر، بڑے مفکر، بڑے فلاسفر، بڑے اسکالر کے نام پر اگر آپ یہاں جمع ہوتے تو یہ کوئی زیادہ تعجب کی بات نہیں ہوتی، لیکن مجھ جیسے پردیسی اور ہمارے جیسے پردیسی بھائیوں کو سننے کے لئے آپ لوگ اپنے ضروری کام چھوڑ کر

آگئے ہیں، یہ بڑی اچھی علامت ہے اس وقت تک ہمیں اپنے ملک سے، اپنی سوسائٹی سے اچھی امید رکھنی چاہئے، جب تک کہ ایک اجنبی آواز پر اتنے بھائی جمع ہو جائیں۔

ذرائع اور وسائل

میرے بھائیو اور دوستو! آپ سب پڑھے لکھے لوگ ہیں آپ سب جانتے ہیں کہ دنیا میں دو چیزیں ہوتی ہیں، ایک کو ذرائع وسائل کہہ سکتے ہیں دوسرے مقاصد ہوتے ہیں، یعنی کرنا کیا ہے، ان ذرائع کو کس طرح استعمال کرنا ہے ان کو ہم (ENDS) کہہ سکتے ہیں، (PURPOSES) کہہ سکتے ہیں تو انہی دو چیزوں پر ہمارا تمدن چل رہا ہے اور انہی دونوں چیزوں کے (CO-ORDINATION اور (CO-OPERATION) سے، ان دونوں کے (BALANCE) سے اس وقت تک تمدن قائم رہا ہے، اور آئندہ بھی اس کے قائم رہنے کی، (CIVILIZA-TION) کے قائم رہنے کی، اخلاق کے قائم رہنے کی، سوسائٹی کے قائم رہنے کی امید کی جاسکتی ہے، دنیا میں جب کوئی (CRISIS) پیدا ہوا ہے، کوئی انتشار پیدا ہوا ہے تو ہمیشہ ان دونوں میں عدمِ توازن سے، یعنی ذرائع اور مقاصد دونوں الگ الگ ہو جائیں، دونوں میں ایک دوسرے سے روٹھ جائیں، ذرائع مقاصد کو تلاش نہ کریں، مقاصد ذرائع کو ٹھکرا دیں، بے پرواہ ہو جائیں، اس سے ہمیشہ انتشار اور بے چینی پیدا ہوئی ہے۔

ذرائع کی ترقی کا دور

ہم سب جانتے ہیں کہ یہ دور ذرائع کی ترقی کا دور ہے، یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے، جو سائنس کے براہ راست اسٹوڈنٹ نہیں ہیں وہ بھی جانتے ہیں کہ ہمارا

یہ دور ذرائع کی پیداوار (PRODUCTION) کا، ذرائع کی ترقی کا، انسان کی دسترس میں، انسان کے قبضہ میں، اس کے (DISPOSAL) میں آجانے کا دور ہے، اس دور کے بہت سے نام رکھے جاتے ہیں، کوئی کہتا ہے یہ فولاد کا دور ہے، کوئی کہتا ہے (ATOMIC ENERGY) کا دور ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو چیز سب کو (COVER) کرتی ہے وہ یہ کہ یہ دور ہے ذرائع کی ترقی کا، اس میں ایٹمک انرجی بھی آجاتی ہے، اس میں لوہا اور فولاد بھی آجاتا ہے، اس میں سائنس اور ٹیکنالوجی بھی آجاتی ہے، تو زیادہ سے زیادہ جو چیز (COVER) کر سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ دور ہے ذرائع کی ترقی کا، انسٹرومینٹ کی ترقی کا، ٹیکنالوجی کی ترقی کا، اور (MEANS) کی ترقی کا دور ہے، اور یہی دیکھئے کہ کل تک ہم کسی جلسے کو (AD-DRESS) کرتے تھے تو بہت زور سے ہم کو بولنا پڑتا تھا، آواز کسی کو پہنچتی تھی، کسی کو نہیں پہنچتی تھی، اب یہ خدا کی کتنی بڑی دین ہے، اور سائنس کا کتنا بڑا (CONTRIBUTION) ہے، حالانکہ بہت ہی معمولی بہت ہی حقیر اور بہت سی چھوٹا سا (CONTRIBUTION) مائک کی صورت میں ہمارے آپ کے سامنے ہے، مگر یہ بھی بڑی نعمت ہے، میں آسانی کے ساتھ آپ سے بات کر رہا ہوں اور اگر اس سے دس گنا مجمع ہوتا تو میری آواز آسانی کے ساتھ وہاں تک پہنچتی، ایک روشنی کو دیکھ لیجئے کہ موم بتیاں جلائی جاتی تھیں پھر بہت ترقی کی تو لالٹینوں کا زمانہ آیا پھر اور ترقی ہوئی تو گیسوں کا زمانہ آیا مگر اب ایک سوئچ دبایا تو یہ سب کا سب ہال جگمگا اٹھا، یہ سب ذرائع ہیں، پھر اس سے اور کچھ ذرائع ہیں۔

ذرائع خدا کی نعمت ہیں

یہ سب ذرائع خدا کی نعمت ہیں کوئی مذہبی انسان جو شخص (EXTRI-

(MIST ہو، جو بالکل پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھا ہو وہ بھی ان ذرائع کو ٹھکرا نہیں سکتا ان کی تحقیر نہیں کر سکتا ان کو (DENY) نہیں کر سکتا، ذرائع اللہ کی نعمت ہیں، ہمارے مذہبی آدمی جو مذہبی طریقے پر سوچتے ہیں (RELIGIOUS THINKING ہے (RILIGIOUS MENTALITY) ہے، وہ بھی اس کو مانتے ہیں، اور ہماری مذہبی کتابیں، آسمانی صحیفے ان میں سے قرآن شریف کا میں نے کچھ زیادہ مطالعہ کیا ہے، اس میں خدا نے جگہ جگہ اپنے بندوں پر احسان رکھا ہے جو کچھ دنیا میں ہے وہ سب میں نے تمھارے لئے ہی پیدا کیا ہے "هوالذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا" وہ ہے جس نے سب تمھارے لئے ہی پیدا کیا ہے، وہ سب تمھارے (DISPOSAL) میں دیدیا ہے تمھارے ہاتھ تمھاری مٹھی میں دیدیا ہے اور وہ کہتا ہے "ولقد کرمنا بنی آدمی وحملنهم فی البر والبحر" ہم نے انسان کی عزت، عظمت بڑھائی، خشکی اور تری پر اور فضا پر اس کو سوار کر دیا ہم نے زمین کو بھی اس کی سواری بنایا، ہوا اور فضا اور سمندر کو بھی اس کی سواری بنایا میں سمجھتا ہوں جو دوسری مذہبی کتابیں ہیں، ان سب میں ذرائع کو، (MEANS) کو، آلات اور خدا نے جو چیزیں پیدا کی ہیں وہ خدا کی بہت بڑی نعمت ہے، اب یہی دیکھئے فاصلے کیسے سمٹ گئے ہیں، میں لکھنؤ سے آپ کے یہاں اندور آیا ہوں یہی فاصلہ شاید ایک مہینے میں طے ہوتا کتنی بڑی خدا کی نعمت ہے کہ ریل پر، ہوائی جہاز پر، کار پر کوئی آدمی بیٹھے اور اس سواری کے حساب سے آدمی مہینوں کی منزل ہفتوں میں اور ہفتوں کی منزل دنوں میں اور دنوں کی منزل گھنٹوں میں طے کر سکتا ہے، یہ سب خدا کی نعمتیں ہیں۔

ذرائع کی افادیت نیک مقاصد پر منحصر

اب میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ یہ نعمتیں، یہ ذرائع، یہ (MEANS) یہ

انسٹرومنٹ خود کافی نہیں ہیں، انکی جو قدر و قیمت، ان کی جو (MERIT) ان کی جو افادیت ہے وہ سب مقاصد پر منحصر ہے کہ ان سے کیا کام لیا جاتا ہے، اگر ہمیں یہ نہ معلوم ہو کہ ہم ان سے کیا کام لے سکتے ہیں تو یہ ہمارا منھ دیکھتے رہ جائیں گے اور ہم ان کا منھ دیکھتے رہ جائیں گے، کوئی فائدہ نہیں اٹھائیں گے اور اگر ہم ان سے کوئی غلط کام لیں تو یہ بھی ان کی ناقدری ہوئی اور گویا ہم نے ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ ان سے کام کئی طرح کے لئے جا سکتے ہیں، لیکن جو سب سے بہتر کام ہو سکتا ہے، سب سے (SUPERIOR) ہے، اس کو ہم چھوڑ دیں اور ان سے ہم ادنیٰ درجہ کا کام لیں مثلاً میں یہ کر سکتا ہوں کہ میں اس مائک سے کچھ غلط باتیں کہنا شروع کر دوں، آپ کی دلآزاری کی باتیں کہوں، ریڈیو سے کتنا بڑا کام لیا جا سکتا تھا، ہم کو یہ بتایا گیا تھا، (اور یہ کوئی غلط بات نہیں تھی) کہ :۔

جب ریڈیو عام ہو جائے گا تو سب (COUNTRIES) تمام (NA-TIONS) ایک دوسرے سے بغل گیر ہو جائیں گے اور سب ایک دوسرے کے چاہنے والے اور ایک دوسرے سے محبت کرنے والے بن جائیں گے، ہر طرح کی عداوتیں، غلط فہمیاں شکایتیں رفع ہو جائیں گی، اس لئے یہ سمجھا جاتا تھا کہ دنیا کی سب سے بڑی بیماری یہ ہے کہ ایک دوسرے کو جانتا نہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ ایسا سمجھنے والے بڑے سادہ لوح، کم سمجھ تھے، ہمیں یہ بتایا جاتا تھا کہ دنیا میں جتنی لڑائیاں ہوتی ہیں، یہ سب نہ جاننے کی وجہ سے ہوتی ہیں، اگر ایک شخص دوسرے کی تہذیب سے واقف ہو، اس کی خوبیوں، کارناموں سے واقف ہو، اس کے ادب و شاعری اور لٹریچر سے واقف ہو، اس کے فنون لطیفہ (FINE ART) سے واقف ہو، اس کے جذبات سے واقف ہو، اس کے (ARCHITECTURE)

فن تعمیر سے واقف ہو تو پھر کبھی لڑائی کی نوبت نہ آئے، بہت دنوں تک یہ کہا جاتا اور لکھا جاتا رہا کہ دنیا کی ساری بیماریوں کا، سارے دکھوں کا علاج یہ ہے کہ ایک دوسرے کو جاننے لگیں پہچاننے لگیں اور (APPRECIATE) کر سکیں، ایک دوسرے کے دکھ درد کو معلوم کر سکیں تو ہم بھی سمجھتے تھے کہ بات دل کو لگتی ہوئی ہے، ٹھیک ہے، ایک آدمی دوسرے آدمی سے بعض اوقات لڑ جاتا ہے کہ پہچانتا نہیں ہے، بھائی سے بھائی لڑ جاتا ہے، اب جب ایک دوسرے کا (INTRO-DUCTION) ہوتا ہے، بتایا جاتا ہے کہ تمھارا بھائی ہے، تمھارے محلے میں رہتا ہے، ڈاکٹر ہے، انجینیر ہے، آدمی فوراً رک جاتا ہے، تو بات یہ غلط نہیں تھی، بہت (ABSURD) نہیں تھی، سمجھ میں آنے والی (REASONABLE) تھی، اور (COMMON SENSE) کے مطابق تھی، لیکن ہم نے یہ دیکھا کہ یہ دریافت (DISCOVERY) بڑی تکلیف دہ (DISCOVERY) ثابت ہوئی۔

ریڈیو جتنا عام ہوا جائے اس کے کہ فاصلے کم ہوں فاصلے بڑھتے چلے گئے، اور ریڈیو نے بجائے اس کے کہ ایک دوسرے کی خوبیاں بیان کی ہوتیں اور ایک دوسرے کی محبت کے خوبی کے گیت گائے ہوتے، ایک دوسرے کو جوڑنے کی کوشش کی ہوتی، ریڈیو نے سیاسی پروپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا، ہر ریڈیو کا کام یہ ہو گیا کہ وہ اپنے ملک کے قصیدے پڑھے، اس کی خرابیوں اور کمزوریوں کو بھی کمال بتائے اور دوسرے ملک کی شکایت کرے، دوسرے ملکوں پر تنقید کرے۔

آپ دیکھئے کہ ریڈیو جیسی چیز جس سے بڑھ کر کوئی طاقت نہیں تھی، قوموں سے قوموں کو قریب کرنے کے لئے، ملکوں کو ملکوں سے قریب کرنے کے لئے، فاصلوں کو کم کرنے کے لئے اور جو دیواریں کھڑی ہیں ان کو گرانے کے لئے،

دلوں کو جوڑنے کے لئے، اور قوموں کو ایک دوسروں سے بغل گیر کرنے کے لئے، ریڈیو سے بڑھ کر کون سی طاقت تھی جو اتنی آسانی کے ساتھ اور تھوڑے وقت میں یہ خدمت انجام دے سکتی تھی (DEPUTATION) جانے اور (SEMI-NAR CONFERENCE SYMPOSIUM) ہوتیں، یونائیٹڈ نیشن میں ایک دوسرے نیشن کا (RIPRESENTATIVE) یا ہر (COUN-TRY) کا ممبر اپنی قوم کا تعارف کراتا کتنی دیر لگتی، کتنا پیسہ خرچ ہوتا، گھر بیٹھے ہم ریڈیو سنتے ہیں، لیکن میں آپ سے پوچھتا ہوں، ہم آپ اسی دنیا میں رہتے ہیں، روز ریڈیو سنتے ہوں گے، کیا واقعی ریڈیو نے قوموں کو قریب کر دیا ہے؟ کیا واقعی ریڈیو نے دکھے ہوئے دلوں کو جوڑ دیا ہے؟ کیا واقعی ریڈیو نے ملکوں میں، قوموں میں، نیشن میں، (COUNTRY) میں یہ شوق پیدا کیا کہ وہ دوسرے قوموں کے لٹریچر کی (STUDY) کریں ان کی تاریخ کا مطالعہ کریں، ان کے ملکوں کو جا کر دیکھیں اور ان کو جو تکلیفیں ہیں جو (HARM) ہیں، وہاں قحط پڑا ہے، وہاں کوئی طوفان آگیا ہے، اس کی مدد کریں، کہاں تک ریڈیو نے یہ خدمت انجام دی اور کہاں تک اس سے فائدہ حاصل ہوا؟ ایسا کیوں ہوا؟

وجہ یہ ہے کہ ذرائع اور وسائل اور مقاصد مینس اور اینڈ س میں (CO-ORDINNATION) نہیں ہے، ان دونوں میں وہ تناسب نہیں ہے، وہ اتحاد نہیں ہے، اور کوئی ایسی ہستی کوئی ایسا ادارہ (INSTITUTION) کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جو ان دونوں کو ملائے جوڑے متحد کرے۔

اخلاقیات سائنس کا موضوع نہیں

سائنس ایک آلہ، ایک فن ہے، بڑے سے بڑے سائنٹسٹ نے یہ دعویٰ

یہ (CLAIM) نہیں کیا کہ وہ اخلاقی تعلیم اور اچھے مقاصد، بہترین (AIMS) آپ کو دے گا، وہ آپ میں احساس ذمہ داری (RESPONSIBILITY) پیدا کرے گا، یہ تمام باتیں اس کے دائرے سے خارج ہیں، نہ سائنس دانوں نے یہ دعویٰ کیا، نہ ہم اس پر ملامت یا شکایت کر سکتے ہیں، کسی سائنس داں سے یہ کہنا کہ تم نے بڑے ذرائع ہمارے سامنے رکھ دیئے، ایٹم بم اور نیوکلیائی اسلحہ بھی تیار کر لئے، لیکن تم ان کے استعمال پر نگرانی قائم نہیں کرتے، خدا کا خوف اور انسانوں سے ہمدردی کا جذبہ پیدا نہیں کرتے تاکہ ہیروشیما اور ناگاساکی جیسا تباہ کن واقعہ پیش نہ آئے، سائنس اور سائنسداں کا یہ جواب ہوگا اور بجا جواب ہوگا کہ یہ ہمارا موضوع نہیں، یہ مذہبی آدمیوں، اخلاقیات کے ماہروں (ETHICS) کے یا (REFORM) کے یا (PRIESTHOOD) کلاس کے لوگوں کا کام ہے، یہ سوال ان سے پوچھو، سائنٹسٹ اس پر وقت صرف نہیں کریں گے کیوں کہ یہ ان کا کام نہیں ہے، آج کی دنیا کا سانحہ (TRAGEDY) یہ ہے کہ ذرائع میں تو برابر ترقی ہو رہی ہے، اور ہر روز نت نئے وسائل وذرائع کا سلسلہ جاری ہے، ہم خود ذرائع کے متوالے ہو رہے ہیں، ہم پر ذرائع کا رعب طاری ہے، ہماری (MENTALITY) ایسی ہو گئی ہے کہ ہم یہ سوچتے بھی نہیں کہ مقاصد کی بھی ضرورت اور اہمیت ہے۔ یہ ذرائع ناکافی، نامکمل (INCOMPLETE) ادھورے بلکہ خطرناک ہیں، اگر ان کے ساتھ صحیح مقاصد نہ ہوں۔

ہمارا (MENTAL ATTITUDE) صحیح نہیں ہے، اگر ہمارے اندر (MORAL-SENSE)(CIVIC-SENSE) نہیں ہے، اگر ہمارے دل میں انسانیت کا احترام، انسانیت کی عزت، انسان کی محبت، انسانی جان کی قدر و قیمت

اور انسان کے بارے میں اعلیٰ تصور نہیں ہے، اگر ہم کوئی انسانی کلچر نہیں رکھتے تو یہ تمام ذرائع اور وسائل بڑے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں اور ہوئے، یہ ایک کھلی حقیقت ہے، یہ (COMMON SENSE) کی بات (PRACTICAL) چیز ہے، تجربات کی بات ہے۔

ذرائع اور مقاصد کی ہم آہنگی

وہ لوگ جو ذرائع میں بہت (ADVANCE) ہیں، بہت ترقی کر رہے ہیں، جو دنیا کو (LEAD) کر رہے ہیں، انسانیت کی قیادت کر رہے ہیں، خود ان کا کیا حال ہے؟ ایک جنگ عظیم (GREAT WAR) ہوئی، پھر دوسری جنگ عظیم (SECOND GRAEAT WAR) ہوئی، اب دنیا تیسری جنگ عظیم (THIRD GREAT WAR) کے خطرات سے دوچار ہے، جس کے متعلق اندیشہ ہے کہ اگر یہ ہوئی تو پوری نسل انسانی تباہ ہو جائے گی، اس لئے کہ (MEANS) ہیں، لیکن وہ (AIMS) نہیں ہیں جو کنٹرول کر سکیں اور بریک لگا سکیں، یہ تو ایسا ہی ہے کہ کسی ناسمجھ بچے کے ہاتھ میں بلیڈ، یا دیا سلائی دے دی جائے یا کسی ایسے آدمی کو جس کا دماغی توازن بگڑ چکا ہو (ABNORMAL) ہو کوئی ایسی نازک چیز دے دی جائے جس سے خطرہ ہو۔

آج دنیا کی یہ حالت ہے کہ اسے سائنس (DRIVE) کر رہی ہے، اور جو لوگ سائنس، تہذیب، تمدن، کلچر اور سیاست کی قیادت کر رہے ہیں، ان میں توازن (BALANCE) نہیں ہے، ان میں ذرائع کا صحیح استعمال کا احساس و شعور نہیں ہے، انھیں کسی ملک، کسی قوم، کسی شہر، کسی فرد کی تباہی کی پروا نہیں، ذرائع اور مقاصد کے عدم توازن کے تباہ کن نتائج، ہمارا دن رات کا مشاہدہ ہیں۔

انسانیت کی قسمت، انسانی تہذیب (CIVILIZATION) سوسائٹی کا تحفظ، ذرائع اور مقاصد کی ہم آہنگی پر منحصر ہے، ان دونوں میں تعاون (CO-OP-ERATION) ہو، ایک دوسرے کی خدمت کا جذبہ ہو، ایک دوسرے کو (FA-VOUR) کرے، طاقت پہونچائے، ذرائع آگے بڑھ کر کہیں کہ ہم خدمت کے لئے حاضر ہیں، اور مقاصد کے ہاتھ میں اپنی باگ ڈور دے دیں۔

پھر خدا کا خوف، انسانیت کا احترام، انسانی جان کی قدر و قیمت کا احساس اور یہ شعور ہو کہ ذرائع انسان کے خادم ہیں، آقا نہیں، سکھ پہونچانے کے لئے ہیں دکھ دینے کے لئے نہیں، آدمی کے دل میں ایسا جذبہ، ایک ایسی کیفیت ہونی چاہئے کہ وہ ذرائع کو احساس ذمہ داری کے ساتھ اور بہتر سے بہتر مقاصد کے لئے استعمال کرنے پر آمادہ ہو، اگر یہ بات نہیں ہے تو یہ سب چیزیں نہ صرف بے کار ہوں گی بلکہ انسان کو تباہ کر دیں گی۔

جب ذرائع کم تھے لیکن مقاصد اعلیٰ تھے

ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ جب ذرائع نہیں تھے، لیکن مقاصد اچھے تھے، نیتیں اچھی تھیں، دل اچھے اور پاک تھے، جب دماغ روشن تھے، جب خدا کا خوف غالب تھا، جب انسانوں کو انسانوں سے ہمدردی تھی تو بہت تھوڑے ذرائع میں انسانوں نے وہ کام کئے جو آج تک تاریخ میں نقش ہیں۔

راجہ بکر ماجیت جس کا دار السلطنت اجین تھا اور یہ پورا علاقہ اس کے زیر نگیں تھا، اس نے جو سماج بنایا، جیسے قوانین بنائے، اس کے ذرائع کیا تھے؟ ایران کا شہنشاہ نوشیرواں، اسلام کے خلفاء راشدین جن کے کارناموں نے انسانی تاریخ میں چار چاند لگائے، ان کا زمانہ آج جیسا ترقی یافتہ اور وسائل و ذرائع سے مالا مال نہیں

تھا، بادبانی کشتیوں، اونٹوں اور گھوڑوں کی پیٹھ پر بیٹھ کر وہ طویل فاصلے طے کرتے تھے، بڑے بڑے لشکر اونٹوں اور گھوڑوں کے ذریعہ دوسرے ملکوں تک جاتے تھے رسد وغیرہ کا کوئی معقول انتظام نہیں ہوتا تھا، لیکن انھوں نے انسانیت کی جو خدمت کی ہے، انصاف کیا ہے، ان کے دور میں عوام کو سکھ، اطمینان، عافیت اور خوشحالی نصیب تھی، دولت جیسی عام اور انسانی ذرائع کا حصول سب کے لئے جس طرح ممکن تھا اس کی مثال اب نہیں ملتی، تاریخ میں ان کا یہ ریکارڈ ہے کہ محدود ذرائع کے ساتھ انھوں نے کیسے اہم مقاصد پورے کئے اور کتنی بڑی کامیابی حاصل کی؟

اگر ذرائع ہوں اور مقاصد نہ ہوں تو ذرائع بیکار، اور مقاصد ہوں اور ذرائع نہ ہوں تو مقصد بیکار، خدا نے جو چیزیں پیدا کی ہیں، ہم اس کو (DISCOVER) کریں، اور جتنا (CAPTURE) کر سکتے ہیں کریں، کوئی مذہب اس سے نہیں روکتا، آدمی کے ارادے اچھے ہوں تو ذرائع پیدا ہوں گے، لیکن اگر اس کے اندر کسی نیک کام کی کوئی خواہش ہی نہ ہو، انسانی ہمدردی، انسان کی خدمت کا، سیوا کا جذبہ ہی نہ ہو تو یہ ذرائع کوئی نفع نہیں پہونچائیں گے، بجائے راحت کے نقصان پہونچائیں گے، جو ظلم پہلے بادبانی کشتی سے سفر کرتا تھا، جو سفاکی اور درندگی اونٹ اور گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر اور بیل گاڑیوں اور یکوں سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی تھی، آج وہ سفاکی، وہ درندگی، وہ حیوانیت و بہیمیت، وہ خود غرضی (SELFISHNESS) ہوائی جہازوں سے ایک ملک سے دوسرے ملک گھنٹوں میں پہونچ جاتی ہیں۔

پہلے ایک شخص کو ایک ملک سے دوسرے ملک پہونچنے میں مہینوں لگ جاتے تھے، سکندر کو یہاں پہونچنے میں مہینوں لگ گئے تھے، لیکن آج کوئی سکندر،

کوئی چنگیز، کوئی نیرو ہوائی جہاز میں چند گھنٹوں میں پہونچ جاتا ہے۔

اگر دل اچھا نہیں، من پاپی ہے، دماغ میں تاریکی ہے، روح بیمار ہے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ذرائع سے انسانیت کی تعمیر (CONSTRUCTIVE WORK) کی بجائے تخریب کا کام (DESTRUCTIVE WORK) ہوگا، ہماری تمام کوششیں منفی (NEGATIVE) ہو جائیں گی۔

سائنس کا مست ہاتھی

ہماری اس صدی کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ اس دنیا کو جنت بنانے کے تمام ذرائع ہمارے پاس موجود ہیں، ہمارا ملک آزاد ہے، اس کی باگ ڈور خدا نے ہمارے ہاتھ میں دی ہے، اس ملک میں کتنی یونیورسٹیاں ہیں، ۱۹۴۷ء کے بعد ہمارے یہاں کتنی یونیورسٹیاں، پاٹھ شالے، مدرسے قائم ہوئے، ریسرچ سنٹرز اور لائبریریاں وجود میں آئیں، ان سب کے باوجود انسان برابر انحطاط کا شکار، معاشرہ اخلاقی زوال سے دوچار اور ملک انارکی میں مبتلا ہے، پوری دنیا کا یہ حال ہے، شیکاگو کی لائبریری میں میں نے پوچھا کہ یہاں کتنی کتابیں ہیں تو لائبریرین نے کہا کہ پچاس لاکھ کتابیں، ہارورڈ یونیورسٹی جانے اور وہاں لیکچر دینے کا اتفاق بھی ہوا، وہاں معلوم ہوا کہ ایک کروڑ کتابیں ہیں۔

اس کے علاوہ امریکہ میں چپے چپے پر یونیورسٹی ہے، ایک ایک یونیورسٹی میں ایک ایک لاکھ طالب علم پڑھتے ہیں، لیکن کتابوں کی کثرت، یونیورسٹیوں کی بھرمار، لیبارٹریوں کی رونق، علم وسائنس کی ترقی، اس نے امریکہ کو کیا دیا؟ جب نیویارک کے پاور پلانٹ پر بجلی گری، اس وقت میں فلاڈیلفیا میں تھا، بجلی گری اور تین گھنٹے کے لئے پورا نیویارک شہر اندھیرے میں ڈوب گیا، لیکن ان تین گھنٹوں

میں دنیا کے اس متمدن شہر میں کئی ارب روپیوں کی لوٹ ہو گئی، لوگ بھک منگوں، فاقہ کشوں اور وحشی جانوروں کی طرح دوکانوں پر، تجارتی اداروں پر، سامان پر، کیش بکسوں پر ٹوٹ پڑے اور انھوں نے نیویارک کو لوٹ لیا، تین گھنٹے تک نیویارک (OUT OF CONTROL) ہو گیا تھا، وہاں کا انتظامیہ بے بس تھا، بتایئے !ان یونیورسٹیوں ،لائبریریوں ،لیبیارٹریوں نے امریکہ کو کیا دیا؟آج امریکہ ساری دنیا کے انسانوں کو بھولے بھالے بچوں کی طرح بہلا رہا ہے، جانوروں کے ریوڑ کی طرح ہانک رہا ہے، لیکن خود اس کا حال کیا ہے ؟

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تنہا ذرائع کچھ نہیں کر سکتے، اگر اخلاقی طاقت، احساسِ ذمہ داری اور مذہب کی زبان میں خدا کا خوف نہ ہو تو بڑے بڑے سائنس داں، ریسرچ اسکالرز، یونیورسٹیاں !لائبریریاں، لیبارٹریز، عظیم الشان پروجیکٹ کچھ نہیں کر سکتے۔

یہ احساس ہونا چاہئے کہ کسی بھی انسان پر ظلم اور زیادتی خود اپنے پر ظلم ہے، تمام انسان ایک ہی جسم کے ٹکڑے ہیں، قرآن کے الفاظ "ماخلقکم ولابعثکم الاکنفس واحدۃ "ایک جان کا پیدا کرنا گویا پوری نسل انسانی(MANKIND) کو پیدا کرنا ہے، پوری نسل انسانی ایک جسم ہے، گلستاں، بوستاں جیسی اخلاقی کتابیں جب بچپن میں پڑھائی جاتی تھیں تو ہم پڑھتے تھے۔

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند
کہ در آفرینش زیک جو ہر اند

آدم کے بیٹے ایک ہی جسم ہیں، کیوں کہ ایک ہی زمین، ایک ہی مادہ سے بنائے گئے ہیں، اسی کو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا "کلکم من ادم وادم من

تراب" اے انسانو! تم سب آدم سے بنے ہو اور آدم مٹی سے بنا تھا، کسی عربی کو عجمی پر، کسی عجمی کو عربی پر، کسی گورے کو کالے پر، کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں، کسی بات پر فخر کرنے کا حق نہیں۔

اس بات کی کمی نے آج روس اور امریکہ کو مست ہاتھی بنادیا ہے، سائنس کو مست ہاتھی بنادیا ہے، کسی کی خیر نہیں کہ کس چیہ کو کچل ڈالے اور کس غریب کے جھونپڑے کو گرادے۔

اس مست ہاتھی کو اگر کوئی چیز کنٹرول کر سکتی ہے تو وہ خدا کا خوف ہے، خدا پر یقین اور اخلاقی طاقت ہے، اس نے بڑے بڑے طاقتوروں کو جن سے دنیا لرزتی، کانپتی تھی پیٹ پر پتھر باندھنے، فاقہ کرنے، اور راتوں کو بھیس بدل کر پہرہ دینے پر آمادہ کیا!

میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں اور اس کی معافی چاہتا ہوں کہ چونکہ میں اسلامک ہسٹری کا طالب علم ہوں، میں نے اس موضوع پر کتابیں بھی لکھی ہیں، میں نے اپنی تاریخ کا زیادہ مطالعہ کیا ہے، اس لئے اس وقت ذہن میں یہی وقعہ آگیا، اور اسی کو مثال بنا سکتا ہوں، ورنہ ہندوستان میں جب بھی اخلاقی طاقت ہر چیز پر غالب تھی، ایسی مثالیں گذری ہوں گی، یہاں بھی بڑے بڑے لوگ گذرے ہیں۔

یہ واقعہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کا ہے جو پہلے خلیفہ تھے، ان کا پورا وقت خلافت و حکومت کے کاموں میں صرف ہوتا تھا لہذا ان کے گذارے کے لئے بیت المال سے ایک معمولی رقم بطور وظیفہ ملا کرتی تھی۔

مثالی حکمراں

حضرت ابو بکرؓ بیت المال سے اپنے لئے جو وظیفہ لیتے تھے، اس کی مقدار

کتنی تھی، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ ان کی اہلیہ کا جی چاہا کہ حلوہ کھائیں، شوہر سے فرمائش کی تو انھوں نے جواب دیا کہ گنجائش نہیں ہے، بیوی نے کہا کہ "اچھا آپ روزمرہ کے خرچ کے لئے مجھ کو جو دیتے ہیں، اب میں اسی میں سے پس انداز کروں گی یہاں تک کہ وہ حلوہ کی قیمت کے برابر ہو جائے، چند روز میں اتنا پس انداز ہو گیا کہ حلوہ بن سکے، خلیفۂ رسول کو اس کا علم ہوا تو فرمایا کہ "روز مرہ کا خرچ ان چند پیسوں کو کم دینے کے بعد بھی پورا ہو سکتا ہے جو تم روزانہ پس انداز کرتی تھیں، اس لئے اب آئندہ تم کو گھر کا خرچ کم کر کے دیا جائے گا، اور جو رقم حلوہ کے نام سے پس انداز ہوئی تھی، وہ بیت المال میں داخل کر دی۔

یہ مثال اس انسان کی ہے جو مدینہ سے لے کر سیریا اور پورے جزیرۃ العرب کا حکمراں تھا، جس کا رقبۂ سلطنت ہندوستان سے بھی زیادہ تھا۔

اصل ضرورت ذرائع اور وسائل کو مفید بنانے اور اسے صحیح رخ دینے کی ہے، سائنس کی ترقی اور وسائل کی فراوانی سے سوسائٹی اس خطرہ سے محفوظ نہیں رہ سکتی جو اس کے سر پر منڈلا رہا ہے، خدا کا خوف، اخلاقی حس، انسانیت کا اکرام اور احساس ذمہ داری کے ذریعہ انسانی سماج کو خطرات سے بچایا جا سکتا ہے۔

یہ دنیا سائنس اور ٹیکنالوجی میں، مالیات (FINANCE) میں اور زندگی کے تمام مادی شعبوں میں ترقی کر رہی ہے، ہمارا ملک بھی ترقی کر رہا ہے، اور خود کفیل بنتا چلا رہا ہے، لیکن جو کام نہیں ہو رہا ہے، وہ اخلاق، انسان کی عزت و محبت اور پریم کو عام کرنے کی دعوت ہے، آدمی کو آدمی سے ملانے، خود غرضی کو کم کرنے، خلوص کو پیدا کرنے، حب الوطنی اور وفاداری کے جذبات کو فروغ دینے اور ہر قسم کے کرپشن اور خرابیوں کو دور کرنے کے لئے عوامی سطح پر پرچار کا کام ہے۔

آج یورپ اور امریکہ کی سوسائٹی میں باوجود بہت سی خرابیوں کے یہ خوبی ہے کہ وہاں کرپشن، ملاوٹ اور وطن دشمنی آپ نہیں پائیں گے، دوامیں، غذامیں، ملاوٹ کا تو وہاں کوئی تصور نہیں کر سکتا اور ہمارے ملک میں یہ بھی ہوتا ہے اور بڑے پیمانہ پر ہوتا ہے۔

میں ترقی کا مخالف نہیں

میں کسی چیز کا انکار نہیں کرتا، کسی چیز کو(REJECT) نہیں کرتا، جو تعلیم عام کی جارہی ہے، اس کے اور زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے، اگر یونیورسٹیاں اور قائم ہوں تو ہمیں فخر اور خوشی ہوگی، میں کسی چیز کو کم نہیں کہتا، میں صرف ایک اضافہ چاہتا ہوں، وہ یہ کہ اس ملک میں اخلاق کا پرچار کیا جائے، انسانیت کا احترام پیدا کیا جائے، اور یہ بات دل میں بٹھادی جائے کہ درخت، جانور، دریا، ستارے، چاند، سورج، سب سے زیادہ قیمتی انسان ہے، یہ سب انسان کے لئے بنائے گئے ہیں، اور ہمیں انسان بننا ہے۔

اگر ہم ہوامیں بھی اڑنے لگیں، اور پانی میں پیرنے لگیں، لیکن ہمیں زمین پر آدمی کی طرح چلنا نہ آئے تو اس ملک کا اور انسانی سوسائٹی کا خدا حافظ، یہ ملک پھر بچ نہیں سکتا۔

یورپ اور امریکہ بھی خطرے میں ہیں، اس کے لئے کسی دوربین اور خوردبین کی ضرورت نہیں، صاف نظر آرہا ہے کہ یورپ وامریکہ ڈانواڈول ہورہے ہیں، اپنے دن پورے کررہے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ ہمارے دل میں یہ لگن لگ جائے کہ ہم اخلاق کا پرچار اور انسانیت کا احترام پیدا کریں، خدا نے جو نعمتیں ہمیں دی ہیں، ان کے استعمال کا

سلیقہ ہم میں ہونا چاہئے، ہمارے پاس صالح اور تعمیری مقاصد ہونے چاہیں، ہمارے اندر (GOOD WILL) کا جذبہ ہونا چاہئے۔

ہم وسائل کو انسانوں کے فائدے کے لئے، ان کے دکھ درد کو دور کرنے کے لئے، دنیا میں محبت اور پریم پھیلانے کے لئے، دلوں کو جوڑنے کے لئے، فسادات روکنے کے لئے، انسان کشی ختم کرنے کے لئے استعمال کریں، مل جل کر انسانیت کی ڈوبتی کشتی کو بچانے کی ضرورت ہے، اور یہی ہمارا پیغام ہے۔

یہ ملک جن خطرات سے دوچار ہے، اور انسانیت جس زوال کی شکار ہے، اس کا احساس ہر محبِ وطن کے دل میں ہونا چاہئے۔

انسانیت کا سفینہ گرداب میں

انسانیت کی کشتی گرداب میں ہے، اس پر نسل انسانی کا صدیوں کا قیمتی سرمایہ ہے، تہذیب وثقافت، ادب ولٹریچر، علوم وفنون، سب خطرے میں ہیں، کشتی غرقاب ہوگی تو کچھ بھی نہیں بچے گا، ڈوبنے والے بحری جہازوں اور حادثہ کے شکار ہونے والے ہوائی جہازوں میں پڑھے لکھے اور قابل لوگ بھی ہوتے ہیں اور وہ بھی لقمۂ اجل بن جاتے ہیں، بھور میں پھنسی ہوئی انسانیت کی کشتی کو بچانے کی ضرورت ہے، ہمارا یہی پیغام ہے، آپ حضرات سنجیدگی سے اس پر غور کریں، یہ نہیں کہ ایک قسم کی (CURSORY) آپ کو یہاں لے آئی ہو، محض تجسس، محض شوق آپ کو یہاں لے آیا ہو کہ دیکھیں یہ مولوی لوگ ٹیگور ہال میں کیا تقریر کرتے ہیں، اور سن کر سو جانا ہے، یہ تقریر نہیں بلکہ میری، آپ کی کہانی ہے، یہ آپ بیتی ہے، جگ بیتی نہیں، یہ ہماری زندگی کا معاملہ ہے، تاریخ، جغرافیہ کا مسئلہ نہیں، ہمیں نیک مقاصد، مذہب سے، اخلاقیات سے ملتے ہیں، نیک ارادے،

نیک لوگوں سے ملتے ہیں، اگر ہمارے مقاصد نیک نہیں تو یہ چیزیں معدوم ہیں۔ یہ چٹکلے مفید نہیں، صرف وسائل حاصل کرنا اور اس سے کوئی بحث نہیں کہ ان سے کیا کام لینا ہے، بے معنی بات ہے، اگر اس مائک سے میں کوئی غلط بات کہہ دوں تو یہ جوں کا توں اسے پہونچادے گا، قصور مائک کا نہیں، کہنے والے کا ہوگا، قصور سوچنے سمجھنے والوں کا ہے، ان جمادات کا قصور نہیں، جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہیں، آج ملک میں ہر جگہ آگ لگی ہوئی ہے، اپنے ذاتی مقاصد اور ارادوں کے لئے نیند حرام کرنے والے، گھر بار چھوڑنے والے، وطن سے بے وطن ہونے والے موجود ہیں، لیکن کوئی ایسا نہیں جو آستیں چڑھا کر اور خم ٹھونک کر میدان میں آجائے اور کہے کہ میری زندگی میں ملک تباہ اور انسانی معاشرہ برباد نہیں ہو سکتا، ہم پڑھے لکھے لوگ، دانشور انسان اگر یہ کام نہیں کریں گے تو کیا آسمان سے دیوی اور دیوتا اصلاح کے لئے آئیں گے ؟ جو لوگ رشوت لیتے ہیں، پیسے کی محبت میں، کسی لالچ میں اپنا گھر بھرتے ہیں، اور دوسروں کا گھر اجاڑتے ہین، ہم آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ روکیں، انھیں سمجھائیں ان کو سنبھالیں، آج سارا ملک یا تو سیاست میں لگا ہوا ہے یا دولت کے حصول میں اُلجھا ہوا ہے، آج صرف دو زندہ حقیقتیں ہیں، طاقت اور دولت (POWER AND WEALTH)

فقیرانہ آئے صدا کر چلے

طاقت اور دولت کی پوجا میں ملک تباہ ہو رہا ہے، یہ ملک طاقت اور دولت سے نہیں بچے گا، یہ ملک اخلاق، انصاف، شرافت اور خدا کے خوف سے بچے گا، آپ سب پڑھے لکھے لوگ ہیں، ہمارا کام تو صرف صدا لگانا ہے، آج یہاں صدا لگائی، کل کہیں اور یہ صدا لگائیں گے۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

ہم نے صدا لگادی، آپ نے ساتھ دیا تو قافلہ بن جائے گا، ہم نے اپنی ذمہ داری محسوس کر کے خطرے کی گھنٹی بجائی، جھنجھوڑا، تاکہ ہم خدا کے سامنے کہہ سکیں کہ ہم نے آگاہ کر دیا تھا، یہ ملک تباہی کے کنارے پر ہے، اسے کوئی پالیٹکس، کوئی پارٹی خواہ وہ کانگریس ہو یا جنتا پارٹی کوئی نہیں بچا سکتا، یہ ان کے بس کا کام نہیں، یہ ان کا (RUNCTION) نہیں ہے، ہاں! گاندھی جی کو اس کا خیال تھا لیکن انھیں موقع نہیں ملا، بعد میں لوگ ملک کے مسائل اور انتظامی معاملات میں ایسے کھو گئے کہ اخلاقیات کا انھیں خیال نہیں رہا، پالیٹکس کے پٹے ہوئے، راستے پر چل کر اور سیاسی پارٹیوں کے جتانے اور ہرانے سے کام نہیں چلے گا، بے غرض ہو کر خدا کی رضا اور انسان کی خدمت کے نیک مقصد کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے، ملک کے بچانے، انسانیت کے وقار کو بلند کرنے اور تہذیب و تمدن اور ادب و لٹریچر کو پروان چڑھانے کا کام انھیں بے لوث اور انجان لوگوں نے کیا جو تعریف سے بے نیاز رہے اور تنقید سے خائف نہ ہوئے، انھوں نے خاموش کام کیا اور اس دنیا سے بھی چلے گئے، آج ہمیں پھر انتظار رہے، ان سعید فوجوں اور بہادر انسانوں کا جو اس ملک کو تباہ ہونے سے پہلے بچالیں، ہمیں اندیشہ ہے کہ ان سیاسی لوگوں اور خود غرضوں کے ہاتھوں جو ہر مسئلہ کو اپنی پارٹی کے نقطۂ نظر سے سوچتے ہیں، ملک تباہ نہ ہو جائے۔

ہمیں امید ہے کہ خدا اس ملک سے بڑا کام لے گا، یہاں بڑے بڑے لوگ پیدا ہوئے، مسلمانوں میں بھی غیر مسلموں میں بھی، ان لوگوں نے دور دراز خطوں

تک پریم راگ پہونچایا ہے، محبت کو عام کیا ہے، خدا اس ملک کو مہلت دے گا، اور موقع دے گا کہ یہ ملک زوال و پستی سے نکل آئے، یہ ملک اپنے کو بھی بچائے گا، اور اس دنیا کو بھی بچائے گا جو ڈوبنے کو ہے۔

میں نے بے غرض ہو کر یہ باتیں پیش کی ہیں، امید ہے کہ آپ بھی اسے دل و دماغ میں جگہ دیں گے، تعلیم یافتہ لوگ بڑھیں، پہلے کشتی کو بچائیں، پھر اس کا فیصلہ کر لیں گے کہ کون سی چیز کہاں رکھی جائے۔

ایسا باوقار، پڑھا لکھا مجمع دیکھ کر امید بندھتی ہے، خوشی ہوتی ہے، اور یہ ایک اچھی علامت ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.



اس سے خبردار رہئے کہ کوئی امریکی یا یورپی اسلام پیدا ہو جائے

یہ تقریر شمالی امریکہ کے شہر نیو جرسی (NEW JER-SEY) کے اسلامک سنٹر میں ۴ جون ۱۹۷۷ء کو کی گئی، فاضل مصری عالم ڈاکٹر سلیمان دنیا نے مقرر کا تعارف کرایا اور عربی زبان و اسلامی علوم میں ہندوستانی علماء کی خدمات اور کارناموں کو سراہا اور کہا کہ اسلام جغرافیائی و ملکی حدود سے آزاد ہے، اور اس میں عجمی مسلمانوں نے عرب علماء کے برابر یا ان سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے، سامعین میں تعلیم یافتہ عربوں، ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد شریک تھی، جو امریکہ میں مقیم ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس سے خبردار رہئے کہ کوئی امریکی یا یورپی اسلام پیدا ہو جائے

امابعد!

دوستو اور بھائیو! میری خوش قسمتی ہے کہ اس بڑے اسلامی مرکز میں اس مبارک موقع پر آپ سے ملاقات ہو رہی ہے، شمالی امریکہ اور کناڈا کا یہ میرا پہلا دورہ ہے، اس سے پہلے میں اس ملک اور اس میں اسلام کی اشاعت اور یہاں بس جانے والے مسلمان بھائیوں کے دینی شغف اور دین سے محبت اور دلچسپی کے بارے میں سنا کرتا تھا، لیکن آپ سے اپنا یہ احساس چھپانا نہیں چاہتا کہ مجھے اندازہ نہ تھا کہ میں اللہ کے کرم سے اس دور افتادہ ملک میں اپنے دینی بھائیوں کی اتنی بڑی تعداد سے ملوں گا، اور دین کے لئے اتنا جوش و خروش اور ایسا مبارک اسلامی جذبہ دیکھنے میں آئے گا۔

مجھے یہاں آکر معلوم ہوا کہ اسلام اس ملک میں قدم جمانے کی کوشش کر رہا ہے جو معاصر دنیا پر حکومت کر رہا ہے، اور اپنی ٹکنالوجی جدید تجرباتی علوم اور ایجادات کی بدولت دنیا کی سیاسیات پر بھی چھایا ہوا ہے، خدا کا شکر ہے کہ اسلام اس منطقہ میں داخل ہو چکا ہے، اور برابر اپنا راستہ صاف کرتا جا رہا ہے، اور انشاء اللہ وہ

دن قریب ہے، جب اس دور دراز ملک میں اسلامی معاشرہ قائم ہو جائے گا۔

میں اسے اسلام کے لئے ایک فال نیک اور مسلمانوں کے لئے سعادت ومسرت کی بات سمجھتا ہوں، لیکن اسی کے ساتھ میرا جو تھوڑا بہت تجربہ اور تاریخ کا مطالعہ ہے، اس کے پیش نظر مجھے ایک اندیشہ بھی لاحق ہو رہا ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام اسلامی ثقافت اور اسلامی زندگی کے مراکز سے ہزاروں میل دور ملک میں اسلامی معاشرہ کا وجود بڑے خطرات اور نزاکتیں رکھتا ہے، فاضل محترم ڈاکٹر سلیمان دنیا (جن کی علمی کاوشوں سے میں نے بھی استفادہ کیا ہے) نے صحیح فرمایا کہ "اسلام کسی ملک کے ساتھ مخصوص نہیں" میں بھی ان سے اس بات میں سو فیصد اتفاق کرتا ہوں کہ اسلام کوئی مخصوص ملکی اور علاقائی مذہب نہیں لیکن اس سب کے باوجود اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اسلام کو ایک مخصوص ماحول اور مناسب فضا کی بھی ضرورت ہے، وہ اس ذوق کا بھی طالب ہے، جو فکر و شعور اور قلب و نظر کے معیاروں پر حاوی ہو اور دور سے اس سے اسلام کی خوشبو آتی ہو، اسے ایک اسلامی وطن کی بھی ضرورت ہے، اور اگر میں مزید صراحت و وضاحت سے کام لوں تو یوں کہوں گا کہ اسے ایک خاص موسم، آب و ہوا اور متعین درجۂ حرارت وبرودت (TEMPERATURE) کی بھی ضرورت ہے، کیوں کہ وہ ایک زندہ انسانی دین ہے، وہ کوئی ذہنی و فکری فلسفہ نہیں، جو دماغوں اور فلسفیانہ کتابوں میں محدود رہتا یا لائبریریوں کی زینت ہوتا ہے، اسلام صرف عقیدہ نہیں، اور نہ وہ محض انسان کے مذہبی عقائد واعمال کی (کوئی چھوٹی بڑی) خشک فہرست ہے۔

اسلام بیک وقت عقیدہ و عمل، معاملات واخلاق، جذبہ و شعور کا حامل ہے، اسی طرح وہ ایک خاص طرح کا ذوق بھی ہے ایسا ذوق جو انسان کا احاطہ کر لیتا ہے، اور

اسے ایک نئے طرز میں ڈھال دیتا ہے، اگر کسی کو اللہ تعالیٰ اسلام کے لئے شرح صدر نصیب کرے اور وہ اس پر خدا کے پسندیدہ دین اور آخری رسالت سمجھ کر ایمان لائے تو وہ اسلام کے سانچے میں ڈھل جائیگا اس پر ایک نیا رنگ چڑھ جائے گا، اور اس طرح اس کی کایا پلٹ ہو جائے گی، گویا وہ از سر نو پیدا ہوا ہے، کیوں کہ وہ ایک مستقل زندگی اور کامل و جامع زندگی ہے، اس میں انقلاب و تغیر اور کمال و جمال کا ہر پہلو موجود ہے، اسلام کوئی خشک و بے روح عقیدہ اور لفظی و کتابی مذہب نہیں، بلکہ وہ ایسا دین ہے، جو انسان کے باطن و اندرون میں جذب و پیوست ہو کر رگ و پے میں مجلی کی لہر بن کر دوڑنے لگتا ہے، جیسے کرنٹ ایک تار سے دوسرے تار میں جاری اور منتقل ہو جاتا ہے۔

اگر اسلام کی یہ صحیح تصویر سامنے ہو تو وہ لفظ و حرف کے ذریعہ محض نقل و روایت ہونے والی چیز یا محض کتاب میں دیکھ لینے والی چیز نہیں، وہ سوچنے کا ایک خاص ڈھنگ اور مخصوص ذوق ہے، اس لئے اشیاء کے بارے میں وہ پسندیدہ و ناپسندیدہ اور خوب و ناخوب کا فیصلہ اور حکم کرتا ہے جیسا کہ نبی ﷺ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ بہت سی چیزوں کو پسند اور بہتوں کو ناپسند فرماتے تھے، مثلاً آپ ہر اچھے کام کو دائیں سے شروع کرنا پسند فرماتے حتیٰ کہ پاپوش پہننے اور کنگھی کرنے میں دائیں جانب سے آغاز فرماتے تھے، اسی طرح بہت سی چیزوں سے آپ کو نشاط و انشراح ہوتا، اسی طرح بہت سی چیزوں سے تنغص اور انقباض ہوتا تھا، تو دراصل اسلام ایک نبوی و آسمانی ذوق سلیم ہے، جو سات آسمانوں کی بلندیوں سے اترا ہے، اور انبیاء علیہم السلام اس کے حامل و وارث بنے ہیں، اور اس کی وراثت چھوڑی ہے۔

اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو صبغۃ اللہ (خدائی رنگ)

فرمایا ہے، اگر اسلام صرف عقیدہ یا صرف عمل ہوتا تو اسے رنگ اور طرز نہ کہا جاتا، کیونکہ "صبغۃ" چھاپ اور ٹھپے ممتاز علامت اور فیصلہ کن شعار کے معنی میں ہے، اور یہ اسی وقت ہوگا، جب اسلام ایک انسان اور دوسرے انسان میں، ایک زندگی اور دوسری زندگی، ایک کردار اور دوسرے کردار، ایک ذوق اور دوسرے ذوق میں کھلا فرق وامتیاز پیدا کردے، اور اشیا اور اقدار حیات کے معیاروں کا اختلاف نمایاں کردے کیونکہ اسلام کی میزان و معیار کفر و جاہلیت کی میزان و معیار سے بالکل الگ ہیں، اسی لئے آپ حدیث نبوی اور سنت کے ذخیرہ میں جاہلیت اور اس کے شعاروں کے بارے میں تنبیہ دیکھیں گے، مثلاً کبھی فرمایا جاتا ہے کہ یہ چیز جاہلی عادات میں سے ہے، یہ چیز حمیت جاہلی جیسی ہے، قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ . تم عورتیں اگلی جاہلیت جیسی آرائش و نمائش نہ کرو۔

ایسا کیوں کہا گیا؟ جاہلیت کا دور تو کب کا ختم ہو چکا تھا، پھر قرآن جاہلیت سے کیوں عار دلاتا ہے؟ ایسا اس لئے ہے کہ جاہلیت ایک مستقل زندگی تھی، جس میں حسن وقبح، حلال و حرام، فرض وواجب، مباح و ممنوع کی تقسیم اور اشیاء کو تولنے کے پیمانے مقرر تھے، اور ایسی زندگی تھی، جسے اللہ تعالیٰ نے ناپسند کیا اور مکروہ وملعون قرار دیا اس لئے حدیث شریف میں آتا ہے کہ۔ان اللہ نظر الیٰ اھل الارض فمقتھم عربھم عجمھم الا بقایا من اھل الکتاب . اللہ تعالیٰ نے روئے زمین کی طرف دیکھا اور اس کے رہنے والے عرب و عجم سے ناخوش ہوا سوا تھوڑے اہل کتاب کے۔

چنانچہ اس جاہلیت سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوا، اسے لعنت زدہ قرار دیا، اور

سے بے وقعت بنا کر اپنے بندوں کے لئے ناپسندیدہ ٹھہرایا، اس لئے فرمایا کہ "اگلی جاہلیت جیسی نمائش وآرائش نہ کرو" نیز فرمایا، اذجعل الذین کفروا فی قلوبھم الحمیة حمیة الجاھلیة . جب کافروں نے اپنے دلوں میں حمیت وغیرت کا جذبہ بیدار کیا یعنی جاہلی حمیت کا۔

نبی ﷺ جب کسی مسلمان میں جاہلیت کی کوئی بات دیکھتے تو فرماتے۔ إنك إمرؤ فيك جاهلية ، تم میں ابھی جاہلیت کا اثر باقی ہے۔

جیسا کہ آپ نے حضرت ابوذر جیسے جلیل القدر صحابی سے جب آپ نے ان کے اور ان کے غلام کے درمیان اونچ نیچ دیکھی اور انھیں اپنے غلام کو مارتے اور اس کے ساتھ توہین آمیز سلوک کرتے دیکھا تو فرمایا کہ "تم سے ابھی جاہلیت کی بو نہیں گئی" چنانچہ اس تنبیہ سے حضرت ابوذرؓ اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنے اور اپنے غلام کے درمیان تفریق کرنا چھوڑ دی، اپنے غلام کو وہی کپڑے پہناتے جو خود پہنتے، اور جو خود کھاتے وہی اس کو بھی کھلاتے تھے۔

اللہ سبحانہ نے اسلام کو "صبغة الله "فرمایا ہے اگر اسلام زندگی کا ایک خاص رنگ وآہنگ اور طرز واسلوب نہ ہوتا تو اسے "رنگ" سے تعبیر نہ کرتا چنانچہ فرمایا۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَ مَنْ اَحسنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً، یہ اللہ کا رنگ ہے اور اس سے بہتر کس کا رنگ ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو انبیاء علیھم السلام کی اتباع پر آمادہ کرتے ہوئے انبیاء کی ایک طویل اور زریں فہرست کی رونمائی کرتے ہوئے فرمایا۔

وَوَهَبْنَا لَهٗ اِسْحٰقَ وَيَعقُوبَ كُلًّا هَدَينَا مِنْ قَبلُ وَمِنْ ذُرِّيتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمَانَ وَايوبَ ويوسفَ ومُوسىٰ وهَارونَ وَ كذٰلكَ نَجزِىٰ المُحسنينَ وَزَكَرِيَا

ویحیٰ وعیسیٰ والیاسَ کلٌ من الصّٰلحِینَ واسماعیلَ والیسعَ و یونسَ ولوطاً کلاً فضّلنا علیٰ العالمینَ ومِن ابائھمْ وذُرّیاتھمْ وَاِخوانھم واجتبیناھُم وَھَدینا ھُم اِلیٰ صِراطٍ مُستقیم ذٰلکَ ھُدَی اللہِ یَھدِی بِہٖ مَنْ یَّشَاءُ مِنْ عِبَادِہٖ وَلَو اَشرکُوا لَحبَطَ عَنھُم مَاکَانُوا یَعلَمُونَ . ہم نے اسے اسحٰقؑ ویعقوبؑ عطا کئے، اور سب کو ہدایت دی، اور اس کی اولاد میں داؤدؑ وسلیمانؑ، ایوبؑ ویوسف، موسیٰؑ وہارونؑ کو، اور ہم اسی طرح نیکوکاروں کو بدلہ دیتے ہیں، اور زکریاؑ ویحییٰؑ، عیسیٰؑ اور الیاسؑ، سب نیکوں میں سے تھے، اور اسماعیلؑ، الیسعؑ، یونسؑ، اور لوطؑ سب کو ہم نے دنیا جہان پر فضیلت دی اور ان کے آباء واولاد اور بھائیوں میں سے بھی بعض کو، اور ہم نے انھیں چنا اور انھیں سیدھے راستہ پر چلایا یہ اللہ کی رہنمائی ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، ہدایت دیتا ہے اور اگر وہ شرک کریں تو ان کا سارا کیا دھرا اکارت جائیگا۔

پھر فرمایا۔ اُولٰئِکَ الذینَ ھَدَی اللہُ فَبِھُدَاھُم اقتَدِہ . یہ وہ ہیں جنھیں اللہ نے ہدایت دی ہے تو ان کے طرز کو اپنایئے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اقتداء کا یہ حکم اپنے نبی کے لئے خاص کردیا، جن کی سیرت اسوۂ حسنہ اور کامل نمونہ ہے، چنانچہ مومنین کو نبی ﷺ کی زبان سے مخاطب کیا گیا کہ۔

قُل انْ کنتمُ تُحبُونَ اللّٰہَ فَاتبعُونِی یُحبِبکُمُ اللّٰہُ وَیغفِرلَکُم ذُنُوبَکُم . آپ کہدیجئے کہ اگر اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا، اور تمہارے گناہ معاف کردیگا۔

اسلام دوسرے مذاہب کے مقابل زیادہ ذکی الحس (SENSETIVE) واقع ہوا ہے، اگر کوئی مسیحی اپنے کو نصرانی کہتا ہے تو اس کا کہنا ہی کافی ہے، اس کے

بعد وہ تمدن و تہذیب، فلسفہ و طرزِ حیات اور فکر و نظر کے جو پیمانے بھی چاہے اپنا سکتا ہے، میرے ایک ہندستانی دوست نے ایک بڑے پڑھے لکھے ہندو دوست سے پوچھا کہ "میرے بھائی! کسی مسلمان سے پوچھا جاتا ہے کہ مسلمان کسے کہتے ہیں تو وہ بے تکلف جواب دیتا ہے کہ جو کلمہ طیبہ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پڑھے اور اس پر عقیدہ رکھے، اس کلمہ میں اسلام کا خلاصہ آگیا ہے، اسی طرح اگر آپ سے ایک ہندو ہونے کے ناطے سوال کیا جائے تو آپ کا کیا جواب ہوگا؟ میں کوئی تفصیلی جواب نہیں چاہتا کیونکہ تفصیل کے لئے اور برہمن فلاسفی یا ویدانت کے سمجھنے کے لئے میری لائبریری میں بہت سی کتابیں ہیں، لیکن میں کہتا ہوں کہ میرے پاس صرف ایک یا دو منٹ ہیں جس میں آپ مجھے ایک جملہ میں ہندوازم سمجھ دیں جس میں اس کی روح اور جوہر آگیا ہو، میرے دوست کا کہنا ہے کہ وہ ہندو دوست کچھ دیر رک کر بولے "دیکھئے جناب! ہندو ہر بات پر عقیدہ رکھ سکتا ہے، اور ہر بات کو رد کر سکتا ہے، اس لئے اگر کوئی آدمی اپنے کو ہندو کہتا ہے تو پھر اس کے بعد کسی اور بات کی ضرورت نہیں رہتی، پھر وہ جو کچھ مانے اور جو کچھ کرے ہندو ہی رہتا ہے"۔

مگر میرا کہنا یہ ہے کہ اسلام کا معاملہ ایسا نہیں، اسلام جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ بہت ہی ذکی الحس واقع ہوا ہے، اور کسی اور دین کے مقابلہ میں اپنے سے منافی باتوں سے جلد متاثر ہوتا ہے، اس کے حدود متعین و معروف ہیں کہ یہ اسلام ہے، اور یہ کفر ہے، یہ اسلام ہے اور یہ جاہلیت ہے، یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے، یہ پاک ہے، اور یہ ناپاک اور یہاں تک اسلام کی سرحد ہے، اور اس کے بعد ارتداد و کفر کا علاقہ ہے، ردت کا یہ واضح مفہوم جیسا کہ ہم سمجھتے ہیں، غالباً کسی اور دین میں موجود

نہیں، جب کہ ہمارے یہاں مرتد ہونا سب سے بڑا جرم اور گناہ ہے جس کے تصور ہی سے روئیں کھڑے ہو جاتے ہیں، جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ (کمال ایمان کی علامت ہے کہ) "مسلمان کو اس تصور سے کہ وہ کفر کی طرف واپس جاسکتا ہے، ایسی وحشت ہو کہ جیسے وہ آگ میں ڈالا جارہا ہے، "وَیکرہ اَنْ یعُودَ اِلی الکفرِ کَمَا یکرہ اَن یقذفَ فِی النَّار".

تو جب اسلام کا یہ مزاج اور یہ صورت حال ہے تو ان مسلمانوں کی ذمہ داری (جو امریکا و یورپ میں مقیم ہیں) بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے، اگر اسلام اور ادیان کی طرح صرف عقیدہ، یا صرف اعمال و عبادات کا نام ہوتا تو معاملہ بہت آسان تھا، لیکن اگر وہ ایک رنگ ہے، اگر وہ ایک طرز زندگی، جذبہ و شعور، ذوق و وجدان اور احساس بھی ہے، اور دوسرے مذاہب کی بہ نسبت زیادہ نازک اور لطیف طبع بھی ہے، اور اشیاء کے معیار و اقدار اور چیزوں کے حسن و قبح کے تصور میں بنیادی تبدیلی کا داعی بھی، تو اس کا معاملہ بہت نازک اور مشکل بن جاتا، اور اس کی ذمہ داری بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

اس لئے ہم صرف کتابوں کے مطالعہ اور مقالات کے سننے سنانے پر ہی اکتفا نہیں کر سکتے، خواہ وہ کیسے ہی بلند پایہ اور علمی کیوں نہ ہوں ہم اسلام کا ذوق و احساس صرف ان کتابوں اور مقالوں سے حاصل نہیں کر سکتے، اگر چہ یہ کتابیں اور مقالات بھی ضروری اور مفید ہیں، لیکن ان پر اکتفا و انحصار صحیح نہیں بلکہ ہماری اصل ضرورت ایک اسلامی خطہ، اسلامی فضا، اسلامی رنگ کا وجود ہے، جہاں ہم اپنی آنکھوں سے اسلام کو دیکھ سکیں، اپنے کانوں سے اس کی آواز سن سکیں، اسے اپنے ہاتھوں سے چھو سکیں اور اپنے حواس سے اسے محسوس کر سکیں، اس کے لئے

ملاقاتوں اور ملنے جلنے کی ضرورت ہے اس کے لئے ہمیں اسلامی زندگی گزارنے کی حاجت ہے کہ ہم ان علاقوں میں جائیں جہاں اسلامی زندگی اور کسی بھی درجہ کا مثالی مسلم معاشرہ پایا جاتا ہے، جہاں ہم اسلام کو ایک زندہ توانا انسان کی طرح چلتے پھرتے اور متحرک و متنفس دیکھ سکیں۔

اسی لئے مسلمانوں اور سچے ایمان والوں کی صحبت و معیت ضروری ہے، ہم اللہ تعالیٰ کو اپنے نبیؐ سے فرماتے ہوئے دیکھتے ہیں (حالانکہ وہ معصوم و محبوب اور تمام نسل انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ ہیں) کہ وہ صالحین ہی کی صحبت میں رہیں۔

وَاصبِر نَفسَكَ مَعَ الذينَ يَدْعُونَ ربهُم بالغداةِ والعشيِ يُريدونَ وجهَهُ وَلَا تَعدُ عَيناكَ عَنهُم تُريدُ زينةَ الحياةِ الدنيا وَلَا تُطِع مَن اَغفَلنَا قَلبهُ عَن ذِكرِنا وَاتبَعَ هَواهُ وَكانَ امرُهُ فُرُطًا. اور آپ خود کو ان لوگوں کے ساتھ رکھئے جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے اور اس کی رضا کے طالب رہتے ہیں، اور آپ ان سے صرفِ نظر کر کے دنیوی زندگی کی زینت کو نہ دیکھیں اور نہ اس کی اطاعت کریں جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے، اور وہ اپنی خواہش نفسانی کا پیرو ہے، اور اس کا طرز عمل ہمیشہ افراط و غلو کا حامل ہوتا ہے۔

جب نبی معصومؐ کو یہ تاکید ہے تو پھر عام مسلمانوں کا حال اسی سے قیاس کیا جا سکتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **يَا اَيُّهَا الَّذِينَ امنُوا اتقُوا اللّٰهَ وَكُونوا مَعَ الصّٰدِقِين۔** اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محض مطالعہ و کتب بینی سے یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔

یہاں اسلامی معاشرہ ابھی اپنے دور طفولیت اور نشو و نما کے ابتدائی مراحل

میں ہے، اس لئے ہمیں اس نوخیز معاشرہ کے سلسلے میں باشعور اور اپنی ذمہ داری کا احساس ہونا چاہئے، ہمیں یقین ہے کہ اللہ کے فضل سے قائم ہونے والا یہ معاشرہ نہ صرف قائم رہے گا، بلکہ اپنی پختگی اور سن شعور کو پہونچے گا اور اس کے پاس تربیت کے اسباب ووسائل ہوں گے، وہ اسبابِ تربیت کیا ہیں؟ وہ عقیدہ وایمان، تحقیق ومطالعہ، علم وثقافت، صحبت صالح اور مجاہدہ ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوا فِینَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ. اور جو لوگ ہمارے لئے کوشش کریں گے تو ہم انھیں اپنے راستوں کی رہنمائی ضرور کریں گے اور اللہ نکوکاروں کے ساتھ ہے۔

جو لوگ اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے کوشاں رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر حکمت وایمان اور فہم وبصیرت کے ایسے دروازے کھولتا ہے، جس کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔

یہ اس معاشرہ کی ذمہ داریاں ہیں، جس کے آپ محمد اللہ بانی وارکان ہیں، اور اس کو وجود میں لانے میں آپ کا بڑا حصہ ہے، اگر آپ وطن عزیز کو چھوڑ کر یہاں نہ آتے اور اسے دوسرے ملکوں پر ترجیح نہ دیتے تو یہ معاشرہ برپا نہ ہوتا، لیکن اس کے ساتھ یہ کوشش بھی کیجئے کہ یہ معاشرہ، ثابت ہو، کیونکہ اسلام محض کوئی سیاسی فلسفہ، صرف اقتصادی ومعاشرتی تنظیم، اور خالی نظام حکومت نہیں، بلکہ ان سب چیزوں سے پہلے وہ انسان کے اندرون اور احساسات میں اتر جانے والا اور طبیعت انسانی کی گہرائیوں میں جگہ بنانے والا عقیدہ وایمان ہے، وہ ایک عملی زندگی اور مخصوص مذاق طبیعت ہے، صحابہ کرامؓ کا اسلام ان تمام پہلوؤں پر حاوی ومشتمل تھا، وہ عقیدہ واخلاق، اور ذوق ووجدان اور ہر لحاظ سے مسلمان اور اقدار واشیاء کے لئے

معیار و میزان تھے ،اسی لئے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ۔ ما رآہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسنٌ "(مسلمان جو اچھا سمجھیں وہ خدا کے نزدیک بھی اچھا ہے) محققین کے نزدیک ان مسلمانوں سے مراد، صحابہؓ ہیں، یعنی صحابہ کرامؓ جسے اچھا سمجھیں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھا ہے، اور جسے وہ اجتماعی یا اکثری طور پر برا سمجھیں وہ برا ہے۔

اسی طرح اسلام اور قرآن، مسلمان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ معیار حق اور میزان عدل بنے اور اس کا اسلام ان تمام پہلوؤں کو شامل ہو وہ اسلام کا حقیقی ذوق رکھتا ہو یہاں کے امریکی اپنے معاشرے کے درمیان (جس کو مادیت اس بے رحمی اور وحشیانہ انداز سے انکار ہی ہے، جس میں کوئی نرمی اور رحم و کرم نہیں) اور اس اسلامی معاشرہ کے درمیان واضح طور پر فرق محسوس کریں جو مطمئن، پر سکون، مؤدب وباوقار، پاک وصالح معاشرہ ہے، جس کی راتیں عبادت وانابت میں گذرتی ہیں، اور جس کے دن دینی محنت، رزق حلال کی تلاش اور انسانیت کی خدمت میں بسر ہوتے ہیں۔

اور صرف ایسے اسلامی معاشرے کا وجود ہی بجائے خود اسلام کی فتح وکامرانی کا سبب ہوگا، جسے ایک امریکی دیکھ کر بول اٹھے گا کہ زندگی کا اصل لطف تو اس اسلامی معاشرے میں ہے نہ کہ ہمارے معاشرے میں، اور امریکن اس معاشرے کی طرف لپکیں گے، جس میں اطمینان وسکینت، اور نورانیت ہوگی اور اپنے متعفن وفاسد ماحول پر (جس میں وہ پلے بڑھے ہیں) لعنت بھیجنے لگیں گے۔

اخیر میں مجھے یہاں امریکا اور ہر جگہ اس وقت کا خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ جب ہم اپنی ذات تک محدود اور اپنے خول میں سمٹ جائیں جیسے سانپ اپنی کینچلی میں

بند ہو جاتا ہے، اور صرف مطالعۂ کتب اور علمی تحقیقات میں الجھ کر رہ جائیں، اور اسلام کے حقیقی سرچشموں اور اسلام کے ان مرکزوں سے ہمارا رشتہ باقی نہ رہے، جن میں کمزوریوں کے باوجود اسلام زندہ ہے، اور جن کی فضاؤں پر اسلام چھایا ہوا ہے، اور ہمارے قلب وروح کے اندر موجزن اسلامی جذبات واحساسات کے سرچشمے خشک ہو جائیں تو پھر امریکی اسلام، یورپی اسلام، جاپانی وایرانی، ہندوستانی اور پاکستانی اسلام ابھرنے لگے گا جن میں سے ایک دوسرے کو پہچان بھی نہ سکے گا، اور وہ آپس میں اس طرح مختلف ہوں گے جیسے امریکی ایشیائی سے، اور جاپانی انسان افغانی انسان سے مختلف ہوتا ہے، اور ایسے مسلم معاشرے وجود میں آجائیں گے جنکے ذوق وذہن، اور اقدار ومعیار، بالکل الگ ہوں گے۔

یہ صورت حال اسلام کے لئے ایک خطرہ ہے، جس کا ابھی سے مقابلہ کرنا چاہئے، جب کہ ابھی معاملہ حد سے آگے نہیں بڑھا ہے، اور زمام کار اسلامی رہنماؤں کے ہاتھ سے نہیں نکلی ہے، حج کی مشروعیت، اور مسلمانوں کے ان کے ماحول، قومیت، اور زبان وثقافت کے اختلاف کے باوجود ایک سرزمین اور ایک وقت کے اجتماع میں یہ مصلحت کارفرما ہے کہ دین کی کوئی بات کسی کے لئے مشتبہ اور مبہم نہ رہ جائے، اور ساری دنیا کے مسلمانوں اور ان کے اسلامی خدوخال کا بیک وقت جائزہ لیا جاسکے، علاقائی بدعات اور اس سبزۂ خودرو کا علم ہو سکے جو علم کی کمی یا علماء کی غفلت یا دوسری قوموں کے اختلاط کی وجہ سے اسلام کے چمنستان اور اس کی زمین پر جا بجا اگ آیا ہے، اس کی نشاندہی بھی ہو جائے، اور اس کے استیصال کی طرف متوجہ بھی کیا جاسکے، بقول حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ) اگر حج نہ ہوتا تو یہ دین اور مشرق ومغرب کے مسلمان، دوسرے مذاہب کی طرح تحریف وتبدیلی کا

نشانہ بن سکتے تھے، اور اس کا برسوں پتہ بھی نہ چلتا۔"

اس لئے میرے بھائیو! علاقائی ملکی وجغرافیائی، اور "خودرَو" اسلام کے ظہور اور ایسے مسلم معاشروں کے وجود سے چوکنا اور ہوشیار رہئے جو جوہر اسلام اور روحِ اسلام سے عاری ہو، اور ان اصل بنیادوں پر قائم نہ ہو جن پر اسلام کو قائم ہونا چاہئے

یہ وہ مضمون ہے جو اس وقت اللہ نے میرے دل میں ڈالا اور میری زبان سے کہلوایا، اور میں اس کو امریکہ اور یورپ کے مسلمان بھائیوں کے لئے ایک نہایت ضروری اور اہم پیغام سمجھ رہا ہوں جب آپ تنہائی میں اور اپنے گھر جا کر اس پر غور کریں گے تو اس کی قدر و قیمت اور اہمیت و ضرورت محسوس کریں گے، اور تجربہ اس کی تصدیق کرے گا، اللہ تعالیٰ ہم سب کی صحیح رہنمائی فرمائے اور صراط مستقیم پر قائم رکھے۔

واخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین.

☆☆☆☆☆

☆☆☆

مدارسِ دینیہ کے قیام وبقا کے شرائط

۲۶ر نومبر ۱۸۸۳ء بروز جمعہ مدرسہ ریاض العلوم کھجرانہ (اندور) کے دارالاقامہ کے سنگ بنیاد کے موقعہ پر مفکر اسلام رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تقریر کی تھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مدارسِ دینیہ کے قیام وبقا کے شرائط

انسانی سعی وکوشش کے آثار ومظاہر

حضرات! میں یہاں آرہا تھا، اور میری زبان پر ایک شعر خود بخود جاری ہوگیا، کسی صاحب بصیرت شاعر کا کہ ؎

عزم راسخ ہے نشانِ قیس وشانِ کوہ کن
عشق نے آباد کر ڈالے ہیں دشت وکوہ سار

یہ شاعر کی بات نہیں ہے، یہ اصل میں تو قرآن کی ترجمانی ہے۔

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی ثُمَّ یُجْزٰىهُ الْجَزَاءَ الْاَوْفٰی. اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے، جس کی وہ کوشش کرتا ہے، اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی، پھر اس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائیگا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان کے لئے اتنا ہی ہے، جس کی وہ کوشش کرے، اور پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اور خاص طریقہ ادائے قرآنی کے ساتھ فرمایا گیا، "وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی" (اور اس کی کوشش ایک مرتبہ نظر آکر رہے گی) یہ بھی قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ یہاں "سوف" کا لفظ استعمال ہوا، جو عام طور پر مستقبل بعید کے لئے استعمال ہوتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر جلدی تمہیں

نتائج نظر نہ آئیں تو مایوس نہ ہونا "سوف یری" وہ نظر آئیگا، جو کچھ دنیا میں دیکھ رہے ہیں، سلطنتوں کا قیام، تہذیبوں کا عروج، علوم وفنون کی اشاعت، باکمال لوگوں کا پیدا ہونا، سب انسانی سعی وجہد کے ظہور کے نتائج ہیں، اور قرآن مجید کی اس آیت کی تفسیر ہے۔

مردم خیز شہر اور قصبے

کسی سرزمین میں کچھ لوگ پیدا ہو جاتے ہیں، اور ان کو دھن لگ جاتی ہے کسی کام کی، کسی علم وفن میں امتیاز پیدا کرنے کی، اور لوگوں تک اس دولت کے عام کرنے کی، پھر علم پانی کی طرح برستا ہے، ہندوستان کی تاریخ اور یہاں کے خاندانوں کی تاریخ پڑھیے، جس خطہ کا تذکرہ پڑھیے گا، تو معلوم ہوگا کہ اولیاء اللہ، اور باکمال لوگ زمین سے اگتے تھے، یا آسمان سے برستے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ یہاں یا ولی اللہ پیدا ہوتے تھے، یا امام فن پیدا ہوتے تھے، اس پر اس وقت کے لوگوں کو تعجب کرنے کا حق ہے، جب کسی چیز کا چلن ہو جاتا ہے، تو ایسا ہی ہوتا ہے، یہ تہذیب بھی جب اپنی عمر پوری کریگی، اور کوئی مورخ لکھے گا، کہ اس زمانہ میں اس ملک میں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں گریجوٹ تھے، ڈاکٹر تھے، انجینیر تھے، ایل، ایل، بی تھے، اور خدا جانے کیا کیا تھے، لوگ کہیں گے کتنا مبالغہ ہے، بھلا ایک ملک میں کتنا ہی بڑا ملک ہو، اور ایک زمانہ میں ایک سو برس دو سو برس کے اندر اتنے باکمال وفاضل پیدا ہو گئے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک میں کوئی اور آدمی رہتا ہی نہ تھا، سب ڈاکٹر، انجینیر اور اسکالر ہی رہتے تھے، حقیقت ہے کہ جس چیز کی ہوا چل جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے، (اصل تو ارادۂ الٰہی ہے، اور اس کی طرف سے ہر طرح کی آسانی دی جاتی ہے) تو پھر لوگوں کی طبیعتوں میں ایسی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ تھوڑی کوشش

سے بڑے بڑے نتائج نکلنے لگتے ہیں، بڑے بڑے کمالات حاصل ہونے لگتے ہیں۔

مالوہ کی قدیم تاریخ

مالوہ کی تاریخ آپ پڑھیں، صرف شیخ محمد حسن مندوی کی "گلزارِ ابرار" ہی پڑھ لیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اولیاء اللہ، مشائخ طریقت، اور اصحابِ سلسلہ، اور اہل روحانیت بارش کے قطروں کی طرح مانڈو کی سرزمین پر نازل ہوئے تھے، آدمی کو حیرت ہوتی ہے کہ کیا اس وقت کوئی اور کام نہیں رہ گیا تھا، لیکن یہ حضرات اتنے نمایاں تھے کہ مورخ ان کو نظر انداز نہیں کر سکا، کوئی بھی تاریخ ایسی نہیں ہے، جس کو یہ کہا جائے کہ یہ ایک طرح کی ڈائرکٹری ہے، جس کا چاہے نام نکال لیجئے، یا ڈکشنری ہے، جس کا چاہے نام تلاش کر لیجئے، یہ بات نہیں ہے، اگر انھوں نے سو کا ذکر کیا ہے تو ڈیڑھ سو دو سو آدمی چھوٹ بھی گئے، یہ زمین سب کچھ اگانے کے لئے تیار ہے، آپ چاہیں تو یہ سبزی پیدا کرے، درخت پیدا کرے، اور آپ چاہیں تو اللہ کے حکم سے اولیاء اللہ پیدا کرے، اور کاملینِ فن پیدا کرے، زمین ہی کی طرف نسبت کرتے ہیں، کہ اس سرزمین سے کتنے آدمی اٹھے۔

رضا کار وایثار پیشہ خادمِ دین علماء اورنگران حکومت ومعاشرہ صوفی

بس ضرورت اس کی ہوتی ہے کہ پہلے کوئی بندہ دیوانہ بن جائے، تو اس کے بعد پھر تو دریا بہہ جاتے ہیں، ایسے ہی یہ جنگل پڑا ہوا ہے، ہم نے بہت کچھ بنا ہوا دیکھا اور جن کی زندگی ہے، وہ دس برس کے بعد آئیں گے، اور بہت کچھ بنا ہوا دیکھیں گے، یہاں تک کہ ہو سکتا ہے، کہ یہ سارا میدان آپ کو گھروں کا اور اداروں کا ایک شہر نظر آئے، بہر حال یہ ایک مبارک بات ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے چند

عزیزوں کو اس کی توفیق عطا فرمائی، اور انھوں نے یہاں پر ایک کوشش شروع کی ہے، بغیر کسی سلطنت کی سرپرستی کے، میں آپ کو یہ بھی بتلادوں کہ پہلے بھی جو کوششیں ہوئی ہیں، وہ ان سلطنتوں کی سرپرستی سے نہیں ہوئی ہیں، سلطنتیں اپنا کام کررہی تھیں، ان کا مذاق اور تھا، ان کی ضرورتیں اور تھیں، ان کے مصالح اور تھے، یہ سب وہ لوگ کررہے تھے، جو پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے تھے، اور بہت سے دوسرے ملکوں سے آئے تھے، یہاں آکر انھوں نے علم وروحانیت کا دریا بہادیا، اور سلطنتوں سے تو وہ دور ہی دور رہے، سلسلۂ چشتیہ نے خاص طور پر اس کا لحاظ رکھا کہ سلطنت سے دور رہے، ایک بزرگ کا قول ہے کہ سلطنت وقت، اور بادشاہِ وقت آگ کی طرح ہے کہ دور بیٹھ کر تاپے، آدمی پاس نہ جائے ورنہ جل جائے گا، ان لوگوں نے یہی طرز عمل رکھا، بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ تارک الدنیا تھے، ان کو خبر نہیں تھی کہ حکومتوں میں کیا ہورہا ہے، اچھا بُرا سب ہورہا تھا، یہ بیٹھے بیٹھے اللہ اللہ کررہے تھے، اور وظیفہ پڑھ رہے تھے، اور ضربیں لگارہے تھے، یہ غلط ہے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی ایک مثال دیتا ہوں کہ وہ غیاث پور کی خانقاہ میں بیٹھے ہوئے پورے ہندوستان کی نگرانی کررہے تھے، کیسے لوگ آرہے ہیں، کیسے آدمیوں کی ضرورت ہے اور جب ضرورت پڑتی تھی تو بادشاہ کو ایسے آدمی دے دیا کرتے تھے، کہ نگینہ کی طرح حکومت میں اس طرح جڑ جاتے تھے، جیسے انگوٹھی میں نگینہ جڑ دیا جائے، علاء الدین خلجی نے ایک مرتبہ کہلوایا کہ میں تو مل کر رہوں گا، چاہے جو کچھ ہو، فرمایا کہ میری خانقاہ کے دو دروازے ہیں، بادشاہ ایک دروازہ سے آئے گا میں دوسرے دروازہ سے نکل جاؤں گا، چنانچہ جب بادشاہ آیا تو حضرت اجودھن چلے گئے، فرمایا، ملنے ملانے کی کوئی ضرورت نہیں، ملنے کا بالکل خیال نہ

کریں، ہم دعا کر رہے ہیں ہمارا کام ہے دعا کرنا عام انسانوں کے لئے، پھر مسلمانوں اور والیِ سلطنت کے لئے کیوں نہیں،، جس کی خوبی پر، جس کی بہتری پر بہت کچھ موقوف ہے، اور یہی ان کا طرز عمل ساری عمر رہا۔

بات زبان پر آگئی تو کہدوں کہ ایک وقت ایسا آیا کہ محمد تغلق کا ٹھٹہ (سندھ) میں انتقال ہوا، وہاں دریائے سندھ کے اس پار مغل پڑے ہوئے تھے، وہ مغل جو وحشی مغل تھے، وہ نہیں جو بعد میں آئے، کئی لاکھ کا لشکر پڑا تھا، مسلمان لاوارث ہو گئے، اور کسی کے کچھ بنائے نہیں بنتی تھی، اور لوگ اس انتظار میں تھے کہ مغل دریا پار کر کے آئیں گے، اور جیسے کہ بکریوں کا شکار بھیڑیئے کھیلتے ہیں، ایسے ہی مغل اس لاوارث فوج کی بوٹی بوٹی کر دیں گے، اس وقت کسی کے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے، بادشاہ کا کوئی بیٹا اس قابل نہیں تھا، اس وقت حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی موجود تھے، ان کو بادشاہ نے ایک بہانہ سے بلالیا تھا، لیکن اصل میں اللہ نے ان کو پہونچایا تھا، انھوں نے فیروز تغلق سے کہا (جو محمد تغلق کا چچا زاد بھائی تھا) کہ دیکھو اگر تم سلطنت سنبھالتے ہو تو سنبھالو، ورنہ ہم کسی اور کے حوالہ کریں گے، اور اگر تم عدل اور حکومت کے خیال سے، رزم اور بزم کے خیال سے حکومت لیتے ہو تو میں اللہ سے تمہارے لئے تیس سال مانگ لوں گا، چنانچہ پورے تیس سال نہایت کامیابی کے ساتھ اس نے سلطنت کی، حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کا بٹھایا ہوا فیروز تغلق بادشاہ تھا، جس کے متعلق بعض تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ دہلی کے تخت سلطنت پر فیروز تغلق سے بہتر اور مکمل اور جامع آدمی کوئی نہیں آیا، بعض حیثیتوں سے عالمگیر مرحوم سے بھی وہ فائق تھا، اور بعض حیثیتوں سے وہ فائق تھے لیکن مجموعی طور پر فیروز تغلق جیسا بادشاہ نہیں آیا، پورے ملک

میں امن وامان ہو گیا، جرائم ختم ہو گئے، ظلم کرنا لوگوں نے چھوڑ دیا، بے ایمانی کا رواج کم ہو گیا یا ختم ہو گیا، اور یہ کیا تھا، یہ ایک فقیر ایک درویش کی دعا اور سرپرستی۔

تو اللہ تعالیٰ کو جب منظور ہوتا ہے، اور کسی کے دل سے لگ جاتی ہے تو جنگل میں منگل ہو جاتا ہے، دل کے لگنے کی بات ہے، اور کچھ بھی نہیں، دل سے لگ گئی اللہ کے ایک بندہ کے تو دار العلوم دیوبند کھڑا ہو گیا، یہ کیا ہے؟ حضرت حاجی عابد حسین صاحب، اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے دل میں خیال پیدا ہوا ایک نے اس کی ابتدا کر دی، دوسرے اس کی نگرانی کرتے رہے، اور ایسے ہی (جس کی طرف ان بھائیوں اور عزیزوں کا انتساب ہے) ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے دل سے لگ گئی، اور دیکھئے کتنے ساتھی تیار کر لئے، اور آج ندوۃ العماء کی کیا حیثیت ہے، اور ایسے ہی مدرسہ مظاہر علوم اپنے بانیوں کے عزم واخلاص کا کرشمہ ہے، اور جو بھی بڑے بڑے جامعات ہیں، ازہر ہو یا اور کوئی جامعہ، سب کے پیچھے آپ کو کوئی شخصیت نظر آئیگی پھر وہ شخصیت اپنے ساتھی بنالیتی ہے۔

اجتماعی کام کی شرطیں

اللہ کو جب کوئی کام منظور ہوتا ہے، تو اس کے بانی اور ذمہ دار شخصیت کی طبیعت میں صلاحیت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ ہر ایک سے کام لے لے، سب کو ملا کر رکھے، اپنے کو جھکا کر رکھے، دوسروں کو بڑھا کر رکھے، یہ علامت ہوتی ہے، کہ اللہ کو کچھ کام لینا ہے، اور جب اللہ کو کام لینا نہیں ہوتا شخصیت تو ہوتی ہے، لیکن روز جھگڑا، کوئی اس کے ساتھ کام نہیں کر سکتا، سمجھ لیجئے کہ کام ہونا منظور نہیں ہے، تو اللہ تعالیٰ شخصیت بھی پیدا کرتا ہے، اور اس کے ساتھی بھی پیدا کرتا ہے، اور اس شخصیت کے دل میں ان کی قدر، اور ان کے دل میں اس کی عزت اور اس کا

اعتراف، اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کچھ اہلِ استطاعت واہلِ توفیق کو بھی کھڑا کر دیتا ہے، وہ اپنی سعادت سمجھتے ہیں کہ آپ تو ایثار سے کام لے رہے ہیں، اور لیتے رہیں لیکن ہمیں موقعہ دیجئے کہ ہم خدمت کریں، ہمارا بھی حصہ ہو جائے۔

عمارت کے تین پتھر

اس طرح کم سے کم تین پتھر ہوتے ہیں، ایک اصل کام شروع کرنے والا ایک اس کے ساتھی، اور ایک اس کے ساتھ اس کے معاونین، یہ تینوں جب پیدا ہو جاتے ہیں، تو چوتھی چیز مدرسہ کی شکل میں، جامعہ کی شکل میں نکل آتی ہے، اور دنیا دیکھتی ہے کہ کتنا بڑا دارالعلوم قائم ہو گیا بس ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ توفیق دے، اور عمر میں برکت دے ان لوگوں کی جنھوں نے یہ کام شروع کیا، اور اسی طریقہ سے اللہ تعالیٰ تعاون کا جذبہ، اور لوگوں میں مل کر کام کرنے کی صلاحیت پیدا فرمادے، جو آج عمومی پیمانہ پر دنیا سے رخصت ہوتی جارہی ہے، اور خصوصی طور سے مسلمانوں کے اندر سے رخصت ہوتی جارہی ہے۔

مسلمانوں میں تعاون کی کمی

مسلمان سے سب کچھ کرالیجئے، مسلمان سے کہئے تو وہ سر کے بل کھڑا رہے گا، سر نیچے اور پاؤں اوپر رات بھر کھڑا رہیگا، اور کہئے تو پیٹ پر پتھر باندھنے کے لئے تیار ہے، اور کہئے تو کسی وقت خندق میں کودنے کے لئے بھی تیار ہے، مگر یہ کہئے کہ دو دن کسی آدمی کے ساتھ مل کر کام کر لیجئے تو مسلمان کے لئے یہ مشکل ہے، حالانکہ یہی سب سے بڑا کام ہے، جو کامیابی انبیاء علیہم السلام سے لے کر ان کے جانشینوں تک ہوئی ہے، وہ اسی کا کرشمہ ہے، وہ وہی لوگ ہیں، کسی طریقہ سے اللہ نے جن کے دل جوڑ دیئے۔

پہلے دل جوڑنا پھر اینٹیں

پہلے دل جوڑنا پڑتا ہے، پھر اینٹیں جوڑنا، لوگ سمجھتے ہیں اینٹیں جوڑنا اصل کام ہے، نہیں دل جوڑنا اصل کام ہے، دل جڑے تو اینٹیں سب جڑ جائیں گی، بڑی سے بڑی عمارت کھڑی ہو جائیگی، ہم پڑھتے ہیں بڑے بڑے مدرسوں کے بانیوں کے حالات، میں نے دیکھا کہ کیسے کیسے نازک مواقع آئے، خود ندوہ کے بانیوں نے اور اس کے شروع کے ناظموں نے کیسے کیسے کڑوے گھونٹ پیے ہیں، اور کیسے کیسے لوگوں کو برداشت کیا، اس وقت ہمارے اس کام کا تقاضا یہ ہے کہ ہم سب کی سن لیں، اور سب سے فائدہ اٹھائیں، اور سب کو ہم سینہ سے لگائیں، تب جا کر اللہ تعالیٰ نے یہ دن دکھایا کہ ندوہ کے پڑھے ہوئے فرزند یہاں موجود ہیں، اللہ ان سے کام لے رہا ہے، کسر وانکسار ضروری ہے، تھوڑا سا توڑنا، تھوڑا سا ٹوٹنا، جب ہی کام چلتا ہے، اور توڑنا ہی توڑنا ہو، دوسرے کو توڑے اور خود نہ ٹوٹے تو اس طرح کام نہیں چلتا۔

جہاں بھی آپ دیکھ رہے ہیں کوئی انتشار ہے اس کا سبب یہ ہے کہ کارکن جھکنا نہیں جانتے، ماننا نہیں جانتے، کسی کی بات قبول کرنا نہیں جانتے، ایک ہی سبق پڑھا ہے کہ ہماری مانو، اس کی وجہ سے آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ بڑی بڑی جگہوں میں انتشار اور جھگڑا ہے، اللہ تعالیٰ ہماری اپنے نفس کے آفات وشرور سے حفاظت فرمائے، اور اس جنگل میں اپنے فضل سے محض اپنی قدرت کاملہ سے صحیح علوم دینیہ کا ایک مرکز قائم کرے، جہاں سے علوم نبوت کے آفتاب کی شعاعیں پھیلیں، اور واقعی اس سرزمین کو مالا مال کر دے، اور صحیح معنی میں مالوہ بنا دے اور پھر یہاں سے دور دور فیض پہونچے۔

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم .

شرفا اور اونچے گھرانوں کی خاص بیماریاں
اور
ان کے لئے ترقی کا واحد راستہ

۲۵ر نومبر ۱۹۸۳ء بروز جمعرات
دیپال پور کی نئی مسجد میں مدرسہ کے سنگ بنیاد
کے موقعہ پر مفکر اسلام رحمۃ اللہ علیہ کی اہم
اور موثر تقریر۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شرفا اور اونچے گھرانوں کی خاص بیماریاں
اور
ان کے لئے ترقی کا واحد راستہ

حمد وصلوۃ کے بعد :۔

میرے بھائیو اور دوستوں !آپ حضرات بہت دیر سے یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، اور علمائے کرام اور قرآن مجید کے شارحین اور خدمت کرنے والوں کی تقریریں سنتے رہے ہیں، اب بظاہر کسی تقریر کی ضرورت نہیں، لیکن اس خیال سے کہ اکثر جگہ جہاں جانا ہوا ہے، وہاں کچھ نہ کچھ میں عرض کرتا ہوں، آپ لوگوں کو کہیں خیال نہ ہو کہ یہیں آکر میں نے کیوں خاموشی اختیار کی اور کچھ نہیں کہا؟ حالانکہ یہاں سے جو تعلق ہے، وہ آپ کو معلوم ہے، دیپال پور کے رہنے والوں کی دعوت پر ہی ہم لوگ آئے ہیں، اور یہیں کچھ نہ کہا جائے یہ مناسب نہیں، اس لئے میں مجبوراً بیٹھ گیا، ورنہ خدا کے فضل سے آپ کی جھولی قرآن وحدیث کی باتوں، اور اللہ ورسول کے اقوال سے بھر چکی ہے۔

خواص کے ساتھ خصوصی معاملہ

میں صرف ایک بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا قانون امت

مرحومہ کے ساتھ الگ ہے، اور دوسری قوموں کے ساتھ الگ ہے، اور ہم آپ سب بھی ایسا کرتے رہتے ہیں، مثلاً مکتب میں کئی لڑکے بٹھائے جائیں، تو ایک لڑکا جس سے دور کا تعلق نہیں، کہیں پاس پڑوس کا آگیا ہے، کسی نے بھرتی کر دیا ہے، اس کے خاندان کو بھی ہم نہیں پہچانتے، اس سے کسی قسم کا جذباتی، خاندانی لگاؤ نہیں، وہ اگر نہیں پڑھتا تو استاد یا مدرسہ کے جو ذمہ دار ہوتے ہیں، وہ طرح دے جاتے ہیں، اور چشم پوشی کرتے ہیں، سنی ان سنی بھی کر دیتے ہیں، بھاگ جائے تو بھاگنے دیتے ہیں، لیکن گھر کا کوئی لڑکا، کسی معزز گھرانہ کا جن کا اس مدرسہ کے قائم کرنے میں خاص ہاتھ ہوتا ہے، ان کا بڑا احسان ہوتا ہے، یا مدرسہ کے پڑھانے والے استاد وغیرہ اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، ایسے کسی گھر کا لاڈلا بچہ مکتب میں داخل ہوتا ہے، تو اس کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہوتا، سبق یاد کرے نہ یاد کرے، چلو چلنے دو، وقت پورا کر کے چلا جائے، یا بھاگتا ہو، چوری کی عادت پڑ جائے تو ایسے ہی منہ پھیر لو، آنکھ بند کر لو، یہ نہیں ہوا کرتا، پھر اللہ تعالیٰ کا اس امت مرحومہ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے اپنا جو قانون بنا دیا ہے، عزت کا اور ترقی کا، اس قانون پر چلے بغیر اس کی عزت اور ترقی نہیں ہو سکتی۔

نزد یکاں رابیش بود حیرانی

پھر اس امت مرحومہ میں بھی جن خاندانوں کے افراد کی رگوں میں صدیق اکبرؓ کا خون ہو، فاروق اعظمؓ کا خون ہو، سیدنا عثمان غنیؓ کا خون ہو، سیدنا علی مرتضیٰؓ کا خون ہو، حضرات انصار کا خون ہو، مہاجرین کا خون ہو، اللہ تعالیٰ ان کو اس طرح کی ڈھیل نہیں دیتا، ان کے لئے قانون یہ ہے کہ دوسروں سے آگے

بڑھنے کی کوشش کریں، یہ سمجھیں کہ اگر کسی کے لئے کوئی بات ایک مرتبہ ضروری ہے، تو ہمارے لئے چار مرتبہ ضروری ہے، اگر کسی کے لئے فرض پڑھ لینا کافی ہے، تو ہمارے لئے سنتیں پڑھنا بھی اور نفلیں پڑھنا بھی ضروری ہے، اس لئے کہ "**نزدیکاں را بیش بود حیرانی**" جو جتنے نزدیک ہیں، جن کا جتنا قرب ہوتا ہے، ان کو اتنی ہی احتیاط کرنی پڑتی ہے، دیکھئے نا! بادشاہوں کے دربار میں جن کو پاس کرسی ملتی ہے، اور جو بڑے عہدہ دار ہوتے ہیں، وہ مکھی بھی بیٹھ جائے تو اڑا نہیں سکتے، اور دوسرے دو آپس میں باتیں بھی کر سکتے ہیں، لڑ جھگڑ بھی سکتے ہیں، لیکن جو بادشاہ کے قریب بیٹھا ہوتا ہے، اس کو اگر کھجلی معلوم ہوتی ہے تو ہاتھ نہیں ہلا سکتا۔

بابر کتنا بڑا فاتح گذرا ہے، اس نے ہندوستان میں سب سے زیادہ مضبوط، سب سے زیادہ لمبی عمر کی سلطنت قائم کی، اس نے کہا کہ میری زندگی میں سب سے بڑے امتحان اور نازک وقت دو گذرے ہیں، ایک اس وقت جب میں ایک سفر میں ایک پتھر پر سر رکھ کر سو رہا تھا، میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ ایک سانپ اپنا منہ کھولے ہوئے میرے منہ کے قریب پھنکار رہا ہے، کالا سانپ بڑا زہریلا، اب میں اگر حرکت کرتا ہوں تو مجھے ڈس لے گا، یا معلوم نہیں منہ میں چلا جائے؟ اور اسی حال پر رہے تو بھی چھوڑے گا نہیں، بس میں نے ہمت کی اور اپنے منہ سے اس کے منہ کو دبالیا، اور دبائے دبائے اس کو کچلا ہوا اٹھایا اور اٹھ کر کے اس کو دور جا کر پھینکا اور مارا۔

دوسرا واقعہ یہ کہ میں دربار کر رہا تھا، سلطنتوں کے سفیر آئے ہوئے تھے، مجھے اس زمانہ میں داد کی بیماری تھی، کھجلی کا شدید تقاضا ہو رہا تھا، اور میں کھجلا نہیں سکتا تھا کہ بادشاہ دربار میں کھجائے، اس کے داد ہو یا خارش ہو، اس کے ضبط کرنے میں جو میری حالت ہوئی وہ میں ہی جانتا ہوں، آپ دیکھئے! اتنے بڑے بادشاہ نے کتنی

بڑی بڑی مہمیں سر کی ہیں، اور کیسی کیسی فتوحات اور خطرہ سے وہ دوچار ہوا ہے، وہ ان دو واقعوں کا ذکر کرتا ہے، بات کیا ہے؟ کہ جو بات ایک معمولی آدمی کے لئے صرف جائز ہی نہیں، مستحسن ہے، وہ ایک ذمہ دار آدمی کے لئے غیر مستحسن ہے، اور بڑے عیب کی بات ہے، کھجانا کوئی عیب کی بات ہے؟ نہ شرعاً، نہ اخلاقاً، نہ قانوناً، نہ طبی اصول سے، لیکن اس کو خیال تھا کہ میں اس وقت دربار کر رہا ہوں، سلطنتوں کے سفراء حاضر ہیں، اور دم بخود کھڑے ہیں، اور میں کھجا رہا ہوں، یہ میرے لئے مناسب نہیں۔

بھائیو! یہی نامی گرامی خاندانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے کہ ان کی ذرا سی غلطی، اور ان کی ذرا سی ناقدری (غلطی بھی اتنی بڑی چیز نہیں ہے جتنی ناقدری) اللہ کی شریعت کی ناقدری، اس پر نہ چلنا جس پر ان کے بزرگوں نے، اسلاف نے سر کٹا دیئے ہیں، اس پر وہ انگلی بھی نہ ہلائیں، اس پر وہ چار پیسے کا نقصان بھی نہ برداشت کریں، اپنے بچے کے لئے ذرا سا خطرہ بھی نہ مول لیں کہ یہ دینی تعلیم حاصل کرے گا، یہ نیک دیندار بنے گا، تو اتنی بڑی ——————

——————— تنخواہ نہ ہوگی، اتنی بڑی آمدنی نہ ہوگی جو دوسروں کی ہے، جنھوں نے دنیا کا راستہ اختیار کیا، تو دین کی اس ناقدری کو اللہ معاف نہیں کرتا۔

شرفا کی بستیوں میں فلاکت کیوں؟

میں ملک ملک پھرا ہوں، اور ہندستان کا تو چپہ چپہ تقریباً دیکھا ہوا ہے، میں نے ہر جگہ شرفاء کی بستی میں فلاکت دیکھی، خود ہمارے خاندان کی بعض بعض بستیوں میں جہاں ہمارے بزرگ تھے، اور جہاں ان کے مزارات ہیں، اور

بڑے بڑے اولیاء اللہ گذرے ہیں، آج وہاں جایئے تو بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاکت برستی ہے، اور فلاکت کیا برستی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ تختہ ہی الٹ گیا ہے، ایسی شرفاء کی بستیاں ہمارے اودھ میں بہت ہیں، بات کیا ہے، محض اللہ کی شریعت کی ناقدری اور دین کو اپنے لئے باعث ترقی نہ سمجھنا، باعث کامیابی نہ سمجھنا، دنیا کو اپنے لئے باعث کامیابی سمجھ لینا، یہ بات اللہ تعالیٰ کو ہر ایک کی بُری معلوم ہوتی ہے، لیکن جو صحابہ کرامؓ کی اولاد ہوں، اور اپنے کو اشراف کہیں، ان کے لئے تو بالکل ناقابل برداشت ہے، اس کا اثر ضرور ہوتا ہے، ہمارے اور آپ کے لئے ترقی کا راستہ، دین اور علم دین کا راستہ ہے، اس میں جو آسانی ہمیں تھوڑی محنت سے ہوگی، وہ دوسرے راستوں میں بڑی محنت سے بھی نہیں ہوگی۔

تاریخی بستیوں اور اونچے خاندانوں کی خاص بیماریاں اور کمزوریاں

یہ آپس کی ناچاقیاں ان بستیوں اور خاندانوں کی خاص بیماری ہے، میں نے اشراف میں اکثر یہ مصیبت دیکھی، گھر گھر لڑائی، بھائی بھائی سے دل صاف نہیں، شرفاء اور خاندانی لوگوں میں یہ بیماری ایسی پائی جاتی ہے کہ اس کا عشر عشیر (دسواں حصہ) بھی ان لوگوں میں نہیں ہے، جنھوں نے سو برس سے اسلام قبول کیا ہے، دو سو برس سے اسلام قبول کیا ہے، وہ خوب پھل پھول رہے ہیں، ماشاء اللہ بڑے متحد، متفق ہو کر رہ رہے ہیں، ان کے اندر حفظِ قرآن کا رواج ہے، علم دین حاصل کرنے کا شوق ہے، میں نام نہیں لیتا، نو مسلم ہونا کوئی عیب نہیں، صحابۂ کرامؓ سب نو مسلم تھے، یہ حضرات معلوم نہیں سو برس، دو سو برس، چار سو برس سے اسلام لائے ہوں گے، اور بڑے اہل اللہ کے ہاتھوں پر، معلوم ہوتا ہے اسلام

لائے ہیں، لیکن ان کے خاندانوں میں ایسی برکت دیکھی، شریعت کا احترام، نماز کی پابندی اور ماشاء اللہ اولاد میں بھی برکت جو ہمارے یہاں شرفاء کے یہاں نہیں ہے، اور پھر اس کے ساتھ ساتھ حفظ قرآن کا رواج، ایسے ایسے جید علماء ان برادریوں میں ہیں کہ سادات اور شیوخ میں ان کا آدھا بھی کوئی نہیں، بڑے بڑے محدث، بڑے بڑے عالم، کیا بات ہے، انھوں نے اللہ کے دین کی قدر کی، شریعت کی قدر کی، اور وہ نفسیات کہ ہر ایک کہتا ہے "ہم چو من دیگرے نیست" وہ بات ان کے اندر نہیں تھی یا کم تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کی برکت سے یہ نعمت وبرکت ان کو عطا فرمائی۔

اتحاد واتفاق کے لئے ایثار وقربانی

بھائیو! دو تین باتیں ہیں جو میں عرض کرتا ہوں، الحمد للہ سب کام کی باتیں ہو چکی ہیں، ایک تو اس ناچاقی اور نااتفاقی سے بچئے، اور خدا کے لئے اس کو دور کیجئے، اور اللہ کی خوشی کے لئے مل جایئے، اور یہ کہہ کر اپنے بھائی کے پاس جایئے کہ کوئی مجبوری نہیں ہے، ابھی دس برس آپ سے اور لڑ سکتا ہوں، مقدمہ بھی لڑ سکتا ہوں، اور جسمانی طور سے بھی لڑ سکتا ہوں، لیکن محض خدا اور رسولؐ کی خوشی کے لئے، اللہ کو راضی کرنے کے لئے، ایثار کر کے میں اپنا حق معاف کرتا ہوں، اور آپ سے ملتا ہوں، اور باقی اب آگے جو کچھ بھی ہو، جو لوگ ایسا کریں گے میں سمجھتا ہوں کہ انھیں بڑی بڑی نفل نمازوں سے اور ممکن ہے کہ نفلی حج سے بھی زیادہ ثواب ملے، اس لئے کہ یہ نفس کے خلاف کرتا ہے اور نفس کے خلاف میں اللہ تعالیٰ کی جو رضا اور ثواب ہے وہ نفس کی لذت کے ساتھ نہیں، ماشاء اللہ نفلی حجوں میں تو بڑے لطف ہیں، دور جانا، نئی نئی چیزیں دیکھنا، نئی نئی چیزیں لے کر آنا، اب تو نئی نئی چیزیں دیکھنا ہی نہیں رہا، نئی نئی چیزیں جو یہاں نصیب نہیں ہوتیں، دیکھنے میں نہیں آتیں،

وہاں سے لائیے، اور چاہے خود رکھئے، چاہے تحفہ میں دیجئے، چاہے فروخت کیجئے، بہر حال اب تو ان چیزوں میں بڑا ثواب ہے، اللہ کے لئے دل کو صاف کر لینا، کدورت کو نکال دینا؟ بچھڑے ہوئے بھائی سے مل جانا، بلکہ ان لوگوں سے بھی ملنا جنھوں نے کھلی ناانصافی کی۔

حضرت ابوبکرؓ کا کارنامہ

اس ایثار کا سب سے بڑا نمونہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کا ہے کہ ان کو ان کے ایک عزیز (مسطح بن اثاثہ) نے ایسی تکلیف پہونچائی تھی، جس سے بڑھ کر تکلیف کا تصور کوئی شریف آدمی کر نہیں سکتا، اور ان کا تو معاملہ ہی دوسرا ہے، اس لئے کہ ہمیں آپ کو تکلیف پہونچے، یہاں کسی بیٹی کے باپ کو تکلیف پہونچے، تو ایک ہزار بیٹی کے باپ ایک طرف، اور اس بیٹی کا باپ جس کا نام ابو بکرؓ تھا، ایک طرف، اور بیٹی بھی کس کی، اور کس کی بیوی؟ اس مسئلہ کا تعلق اس ذات سے تھا جن سے ان کو عزت حاصل ہوئی تھی، عزت کیسی عزت؟ اس پر بٹہ لگایا، اس پر حملہ کیا، اس سے بڑھ کر کسی شریف آدمی کے لئے کیا کسی حساس آدمی کے لئے بھی، زندہ آدمی کے لئے بھی، کوئی آزمائش ہو سکتی ہے؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ (سورہ نور. ۲۲) اور جو لوگ تم میں صاحب فضل اور صاحب وسعت ہیں، وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ رشتہ داروں اور محتاجوں اور وطن چھوڑ جانے والوں کو کچھ خرچ پات نہیں دیں گے۔

جن کو اللہ تعالیٰ نے کچھ گنجائش دی ہے، اور کچھ عطا فرمایا ہے، ان کو اس بات میں کمی نہیں کرنی چاہئے کہ وہ اپنے قرابت داروں کو دیں

"ولیعفوا ولیصفحوا" اوران کو چاہئے کہ اگر ان کی کوئی بات بُری لگی ہے، تو معاف کردیں، حضرت ابوبکرؓ نے جو بند کردیا تھا، وہ جاری کردیا، اور معاف کردیا، اور کہا کہ بیشک میں چاہتا ہوں کہ اللہ مجھے معاف کرے، بیشک مجھے اس کی ضرورت ہے کہ اللہ مجھے معاف کرے، اس سے بڑھ کو کوئی نمونہ نہیں ہوسکتا صلۂ رحمی کا، اور پھر حدیث میں آتا ہے کہ "لیس الواصل بالمکافی ولکن الواصل الذی ازاقطعت رحمه وصل" رشتہ، ناتوں کو جوڑنے والا وہ نہیں ہے، جو بدلہ دینے والا ہو، ہم سے کوئی رشتہ جوڑ رہا ہے تو ہم بھی جوڑ رہے ہیں، اصل رشتہ جوڑنے والا وہ ہے کہ اس کا رشتہ توڑا جائے تو وہ جوڑے۔

شریعت پر عمل نہ کرنے کی بے برکتی

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ کی شریعت کی پابندی، بلکہ میں یہاں تک کہدوں کہ صحیح طریقہ پر میراث نکالنا، ترکہ تقسیم کرنا، بہنوں کا حق دینا، پھوپھیوں کو حق دینا اور جس کا جو حق ہے، اس کو پہونچانا، ان میں غفلت کی وجہ سے بڑی بے برکتی ہے، آپ دیکھیں گے کہ بہت سے خاندانوں میں بڑی بڑی جائدادیں ہیں، لیکن فلاکت برستی ہے۔

تیسری بات جو مولوی معین اللہ صاحب نے کہی کہ بچوں کی تعلیم کا اہتمام کرنا، یہ نہ سمجھنا کہ ان کو دینی تعلیم دی تو یہ کھوئے جائیں گے، یہ ہمارے کام نہیں آئیں گے انھوں نے کھول کھول کر مثالیں دیں اور نام لے لے کر ایک ایک آدمی کا ذکر کیا کہ اللہ نے اس پر کیا فضل فرمارکھا ہے۔

اخیر میں پھر کہتا ہوں کہ شرفاء کی بستی میں اس وقت تک برکت، خدا کی رحمت، اور ہر چیز میں کامیابی نہیں ہوسکتی ہے، جب تک کہ اللہ کی

بھیجی ہوئی، اور رسول ؐ کی لائی ہوئی شریعت کا احترام نہ کیا جائے، جتنا ہو سکے اس کی پابندی کریں، اللہ کے دین کے بارے میں ہمارے اندر غیرت ہونی چاہئے، جس کو تبلیغ کے عنوان سے مولوی معین اللہ صاحب نے بیان کیا کہ یہ دین کو باقی رکھنے کے لئے ساری دنیا میں ایک کوشش ہے، اس میں آپ حصہ لیں۔

عربوں سے عبرت لیجئے!

اخیر میں یاد رکھئے کہ آپ لوگوں کی فلاح دین پر چلے بغیر نہیں ہے، بس یہ پکی بات ہے، سن لیجئے! ایک وہ موقعہ آیا تھا کہ عربوں نے کوشش کی تھی اور جان توڑ کوشش کی تھی، کہ وہ دنیا کے راستہ سے بلکہ دین کے خلاف راستہ اختیار کر کے کامیابی حاصل کر لیں تو اللہ نے ان کو منہ کے بل گرایا، اور ایسا ذلیل کیا کہ صدیوں سے ایسے ذلیل نہیں ہوئے تھے، مجھے اسی زمانہ میں جانے کا موقعہ ملا، اور میں نے وہاں جدہ میں مکہ مکرمہ میں خطاب کیا، اور کہا دیکھو بھئی! ترک کامیاب ہو جائیں، ایرانی کامیاب ہو جائیں، تم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے، اللہ میاں تمہیں کان پکڑ کر کے اور باندھ کر کے لائیں گے، اور دین ہی کے دروازہ پر تم کو ڈالیں گے، اگر کچھ ملے گا تو یہیں کی بھیک ملے گی، یہیں کی خیرات ملے گی، تم سو سر کے ہو جاؤ تم کامیاب نہیں ہو سکتے، ہم نے کہا تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کے یہاں مقدر یہی ہے کہ تم دین کے راستہ سے پاؤ تو کچھ پاؤ، یہی میں آپ سے کہتا ہوں، اور ان سب لوگوں سے کہتا ہوں جن کے آباواجداد میں اللہ تعالیٰ نے بڑی بڑی ہستیاں پیدا کیں، اور جن کی بستیوں میں دین کا بہت کام ہوا، اچھے اچھے لوگ پیدا ہوئے، تمہاری فلاح دین کے اوپر چلنے میں ہے، دس باتوں کی، پچاس باتوں کی یہ ایک بات ہے۔

وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقه سیدنا ومولانا محمد واله وصحبه وسلم۔

ایمان

جان سے زیادہ عزیز ہونا چاہئے

یہ مختصر اور جامع تقریر مفکر اسلام
حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے دینی تعلیمی
کونسل کی علاقائی کانفرنس منعقدہ ۱۶/ دسمبر
۱۹۹۳ء بوقت نو بجے شب بمقام دارالعلوم
الاسلامیہ بستی میں فرمائی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایمان

جان سے زیادہ عزیز ہونا چاہیے

حضرت موسی وخضر علیہما السلا م کا قصہ اور ایمان کی قدروقیمت

مجھے صرف چند باتیں عرض کرنی ہیں ایک تو یہ کہ اگر میں آپ سے کوئی معاہدہ کرتا تو یہ کرتا کہ آپ اس احساس وشعور کو زندہ رکھیں کہ ایمان جان سے زیادہ عزیز ہے، ایمان جان سے زیادہ پیارا ہے، اور ہم یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ بچہ کی جان سے، اس کی صحت سے، اس کا ایمان زیادہ عزیز ہے، ایمان زیادہ قیمتی ہے، اس کے لئے میں آپ کے سامنے قرآن کریم کی دو آیتوں سے استدلال کرتا ہوں اور جب بھی پڑھتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے، اور وہ حیرت ختم نہیں ہوتی، لیکن مجھے اندیشہ بلکہ میرا احساس یہ ہے کہ بہت کم لوگوں نے اس سے صحیح نتیجہ نکالا ہے،

اسلاف کرام اور مفسرین عظام کا ذہن بیشک ان چیزوں کی طرف گیا ہوگا، جہاں ہمار جا نہیں سکتا، لیکن آج کے پڑھنے والے بہت کم یہ نتیجہ نکالتے ہیں، قرآن مجید کی سورۂ کہف میں آخر یہ قصہ کیوں بیان کیا گیا کہ حضرت خضرؑ نے ایک لڑکے کی جان لے لی، اور وہ بھی ایک اولوالعزم اور ایک عظیم الشان پیغمبر حضرت موسیٰؑ کی موجودگی اور رفاقت میں، حضرت موسیٰؑ نے حضرت خضرؑ سے جب پوچھا کہ آپ نے بچہ کے ساتھ یہ کیا معاملہ کیا؟ اس کا کیا جرم تھا؟ اور کیا وہ جرم ایسا تھا کہ اس کی جان لے لی جائے؟ حضرت خضرؑ نے کہا کہ اس کے ماں باپ دونوں صاحب ایمان اور نیک تھے اور یہ بچہ فتنہ بننے والا تھا، اگر یہ زندہ رہ جاتا تو اپنے ماں باپ کے ایمان کے لئے خطرہ بنتا تو میں نے اس لیے ان کو اس خطرہ سے بچالیا اور اسکی جان لے لی کہ اللہ اور اولاد دے گا،

آج کہیں پوری دنیائے اسلام میں بڑی سے بڑی آزاد حکومت اور شرعی حکومت بھی اس پر عمل نہیں کر سکتی، آپ سب جانتے ہیں کہ اس پر عمل کرنا بالکل حرام اور ناجائز ہے کہ محض اس خطرے سے کہ یہ بچہ کبھی فتنہ بن جائے گا (اور بہت سے بچے فتنہ بن رہے ہیں، اور ہم دیکھ رہے ہیں) اس کی جان لینے کی اجازت نہیں، اور جان لینا تو جان لینا ہے کوئی اور بہت بڑی سزا معصومیت کی حالت میں نہیں دی جاسکتی، اور یہاں سوال پیدا ہوگا کہ پھر قرآن کریم نے قیامت تک کے لئے اس قصہ کو سورۂ کہف میں داخل کر کے اسے زندہ جاوید کیوں بنادیا؟ کہ یہ قیامت تک پڑھا جائے گا، تو اس نے ایسا اس لئے کیا تاکہ لوگ سمجھیں کہ ایمان کی یہ قیمت ہے۔ اگر چہ آج اس پر عمل نہیں ہو سکتا اور تشریعی طور پر اس پر عمل کرنا حرام بھی ہے اور قتل ناحق ہے لیکن اللہ تعالیٰ اسے قرآن مجید کی سورۂ کہف میں بیان فرمارہا ہے اسے ایک

پیغمبر اور اس کے رفیق کا (جن کا کم سے کم درجہ اولیاء اللہ کا ہوگا) فعل بتایا جارہا ہے آخر اس کی حکمت کیا ہے؟ حکمت یہی ہے کہ ہم آپ سوچیں کہ ایمان وہ قیمتی چیز ہے کہ اس کے لیے حضرت خضرؑ (نے جو بڑے فقیر، بڑے عارف باللہ، اور بڑے صاحب بصیرت اور مقبول عند اللہ تھے) انہوں نے یہ کام کیا کہ اس بچے کی جان لے لی، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ قصہ سنایا، اور قرآن مجید میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا تاکہ پڑھنے والے یہ سمجھیں کہ ایمان اتنی بڑی چیز ہے کہ اس کے لیے جو چیز خطرہ بننے والی ہے اس خطرہ کو بھی دور کرنا چاہئے چاہے وہ کیسی ہی پیاری اور عزیز کیوں نہ ہو، مگر ہم لوگ اس طرح نہیں سوچتے قرآن کریم کا یہ اعجاز اور الہامی نکتہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس قصہ میں بیان فرمایا ہے، کہ حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام ایک بستی میں گئے، اور وہاں انھوں نے دیکھا کہ ایک دیوار مسمار ہونے والی ہے، اس موقع پر وہ زبان حال سے گویا کہہ رہے تھے کہ ہم پردیسی ہیں اور ہماری ضیافت ہونی چاہئے اور زبان قال سے بھی جیسا کہ قرآن مجید سے اشارہ معلوم ہوتا ہے، لیکن پوری بستی میں کسی نے خبر نہیں لی، اور کھانا پیش نہیں کیا، اور وہ بھوکے رہے، مگر دیوار جو گر رہی تھی حضرت خضرؑ اس کے سنبھالنے میں لگ گئے اور آپ جانتے ہیں کہ گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالنا کتنا مشکل ہوتا ہے، حیرت کی بات ہے کہ کہاں سے وہ مسالہ لائے، اور انھوں نے کتنی محنت کی ہوگی، حضرت موسیٰؑ نے کہا عجب تضاد ہے، جنہوں نے کھانے تک کی خبر نہیں لی، ہم سے کھانے کو نہیں پوچھا، انکا کہاں سے یہ حق تھا اور کیسا احسان تھا کہ آپ نے اس دیوار کو جس کے مرمت میں وہ مزدور لگاتے، پیسے خرچ کرتے اور خود توجہ کرتے آپ نے اس دیوار کو سنبھال دیا تو انھوں نے کہا:

وَاَمَّا الجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَا اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ. یہ دیوار دو یتیم بچوں کی تھی جن کا باپ نیک تھا، یہ دیوار اگر گر جاتی تو جو خزانہ اندر دبا ہوا تھا وہ کھل جاتا، سامنے آجاتا اور لوگ لوٹ لے جاتے، اور ان کو غربت کا سامنا کرنا پڑتا، اور ان کے پاس کچھ نہ رہتا، ایک طرف جان لی ایمان کے خطرے سے اور ایک طرف دیوار سنبھالی ایمان کی فضیلت کی وجہ سے یعنی وہ خود بھی نہیں بلکہ ان کے باپ نیک تھے معلوم نہیں ان کے انتقال کو کتنا زمانہ ہو گیا تھا۔

لیکن حضرت خضرؑ نے اس ایمان کی اتنی قیمت جانی کہ اس دیوار کو سنبھالا، اور اس کو کھڑا اور ٹھیک کر دیا، اور وہ خزانہ دبا رہا، یہ دونوں واقعے اللہ تعالیٰ نے ایک ہی سورت میں اور اوپر نیچے بیان کئے تاکہ آپ کو ایمان و کفر کا فرق معلوم ہو، ایک طرف ایمان کی یہ قیمت کہ جو چیز خطرہ بننے والا تھا اس کو ختم کر دیا، اور ایک طرف ایمان کی یہ قیمت کہ جن کا باپ نیک تھا ابھی ان کا وقت نہیں آیا تھا ابھی وہ سن بلوغ کو نہیں پہنچے تھے اور وہ دو یتیم بچے تھے، ان کا باپ چونکہ صاحب ایمان تھا اور نیک تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کے ایمان کی قدر دانی میں دیوار سنبھالنے کا انتظام فرمایا اور الہام کے ذریعہ حضرت خضرؑ نے وہ دیوار سنبھال لی۔

ایمان کو جان پر مقدم سمجھنا ایمان کا تقاضا ہے

بس میں یہ کہتا ہوں کہ اس سے آپ ایمان کی قیمت سمجھئے اب یہ حکم نہیں کہ جس کو آدمی قابل خطرہ سمجھے اس کو اس طرح ختم کر دے بلکہ بہتر ہے یہ کہ اگر

خطرہ سمجھے تو اس کو اس دیوار کی طرح سنبھالے، جو گر رہی تھی، ویسے ہی اپنی اولاد کو اور آئندہ آنے والی نسل کو گرتی ہوئی دیوار کی طرح کھڑا کر دے، م اس کو مضبوط بنائے، مستحکم کرے، مسئلہ صرف اتنا ہے کہ اگر ہمارے ذہن اور ہمارے عقیدے نے اس کو قبول کر لیا، کہ ایمان جان سے زیادہ عزیز ہے تو پھر علاج معالجہ اور کپڑے بنانے اور اس کی پوشاک کا خیال کرنے اور پھر آگے بڑھ کر اعلیٰ تعلیم دلانا ان سب سے زیادہ ضروری یہ ہوگا کہ ان کے دل میں ایمان بٹھا یا جائے، ان کے علاج معالجہ سے، کپڑے بنانے سے، انہیں دعائیں دینے سے، اور انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہونے سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ ان کے ایمان کا تحفظ کرے، اور ایسا انتظام کرے کہ ایمان جانے نہ پائے، آخری بات میری طرف سے یاد رکھئے کہ ایمان جان سے زیادہ عزیز ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا ۔اے ایمان والو اپنی جانوں کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔

دوزخ کی آگ سے کس طرح بچا سکو گے ؟ ایمان کے ذریعہ سے بچا سکو گے، سب سے پہلا اور اہم ترین فریضہ ہے اپنی آئندہ نسل کے ایمان کی حفاظت کا سامان کرنا، اور اسے ان جھگڑوں، ان ناکوں، اور ان ٹھکانوں سے بچانا یہاں تک کہ ان تعلیم گاہوں سے بچانا، جہاں ایمان کا خطرہ ہو، اور اس کا بدل مہیا کرنا کہ بے علم بھی نہیں رہ سکتے اس دنیا میں نہ پہلے اس کا جواز تھا اور نہ اب جواز ہے، تو تعلیم ضرور ہونی چاہیے، لیکن تعلیم اس طرح نہیں ہونی چاہیے کہ ایمان خطرہ میں پڑ جائے۔ پھر چاہے آدمی آسمان پر اڑے، اور دریا پر چلے، اور سائنس میں اور علم جدید میں اور دوسرے فنون میں کتنی ہی ترقی کرے، اور بڑے سے بڑا سرمایہ دار قارونِ وقت بن

جائے، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں اور اس کے پیغمبروں کے یہاں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ایمان کی حقیقی قیمت سمجھنے، اس کو دنیا کی ہر چیز ہر دولت پر، ہر نعمت پر، ہر ترقی پر، ہر لذت پر اس کو ترجیح دینے کی توفیق عطا فرمائے، کہ اپنے ایمان کی بھی فکر کریں اور اپنے اولاد کے ایمان کی بھی فکر کریں اے اللہ ہم سب کے ایمان پر قائم رہنے کی فکر کریں۔

سب سے بڑھ کر نسل کشی، عقیدے اور ایمان کی نسل کشی ہے کہ یہ نسل رہے اور ایمان نہ رہے، دین کا امتیاز اور دین کا فرق نہ رہے، اور باقی تہذیب اور کلچر اور رسم الخط اور دوسری چیزیں تو اپنی جگہ پر ہیں اس کا پورا ایک منصوبہ تیار ہے کہ لوگ اسلام پر قائم نہ رہیں، جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے تفصیل سے کہا، میں نے اسپین دیکھا ہے اور ڈاکٹر اشتیاق صاحب بھی میرے ساتھ تھے، اور ہم نے پورا اسپین، غرناطہ وغیرہ دیکھا، وہ اسپین کہ وہاں آج کان ترستے ہیں اذانوں کے لیے اور آنکھیں ترستی ہیں نمازیوں کو دیکھنے کے لیے، قرطبہ کی جامع مسجد دنیا کی عظیم ترین مسجد ہے، اس میں نماز پڑھنے کی اجازت ملی تو کچھ دیر وہاں عبادت کی توفیق ملی۔

اللہ تعالیٰ اس ملت اسلامیہ ہندیہ کو اس ملک میں اپنے تمام تشخصات کے ساتھ، اپنے تمام امتیازات کے ساتھ، سب سے بڑھ کر دین و ایمان اور عقیدے کے ساتھ، حمیت دینی اور حمیت اسلامی کے ساتھ اور نہ صرف یہ کہ ایمان کے باقی رہنے کی ضمانت کے ساتھ بلکہ اس کو ترقی کرنے اور دنیا کے دوسرے اسلامی ملکوں تک اسلام کا پیغام پہنچانے، اور یورپ و امریکہ تک اسلام کا پیغام پہنچانے، مسلمان

بنانے کے لیے، اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے مدد فرمائے، اور مسلمانوں کو توفیق دے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو وسائل دیئے ہیں، جتنی سمجھ دی ہے، جتنا وقت دیا ہے، اس کو وہ اسکے تحفظ میں خرچ کریں۔ ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم وتب علينا انك انت التواب الرحيم .

☆☆☆☆☆☆

تمت

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

خطباتِ ابرار

﴿محی السنہ حضرت مولانا ابرار الحق صاحب دام مجدہٗ﴾

قیمت جلد اوّل　　قیمت جلد ثانی

مقالاتِ مفکرِ اسلام

﴿حضرت مولانا سید ابوالحسنؒ علی میاں ندوی﴾ دو جلدیں

جلد اوّل　　جلد دوم

Rs 120/=　　Rs 120/=

خطباتِ مدراس

﴿علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ﴾

قیمت　　Rs 70/=

مشاہیر کی شاہکار تحریریں

﴿از قلم۔ حضرت مولانا محمد کاظم صاحب ندویؔ﴾

قیمت　　Rs 70/=

ملنے کا پتہ۔ مکتبہ ایوب کاکوری، لکھنؤ